پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو کی

آخری رات

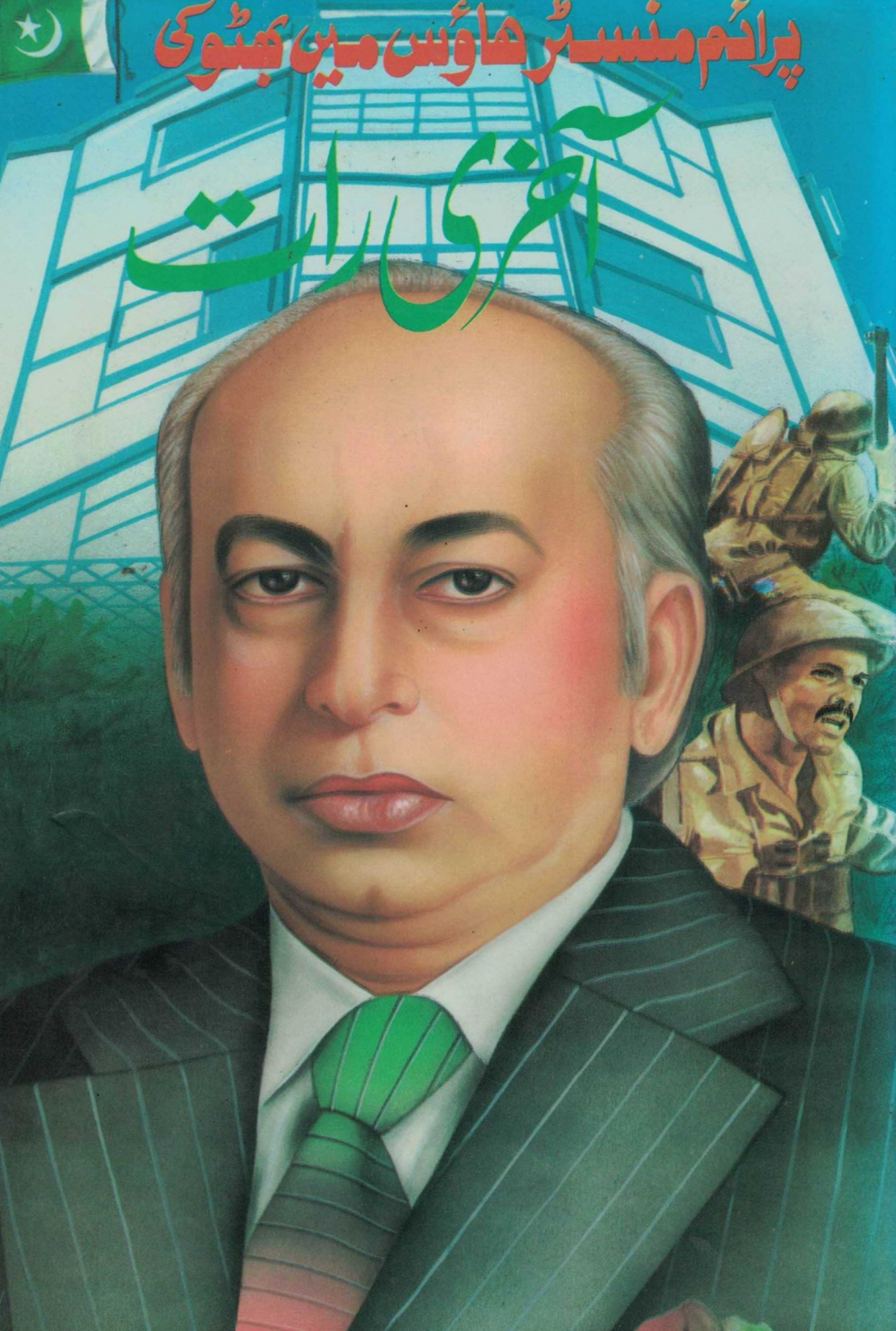

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو کی آخری رات

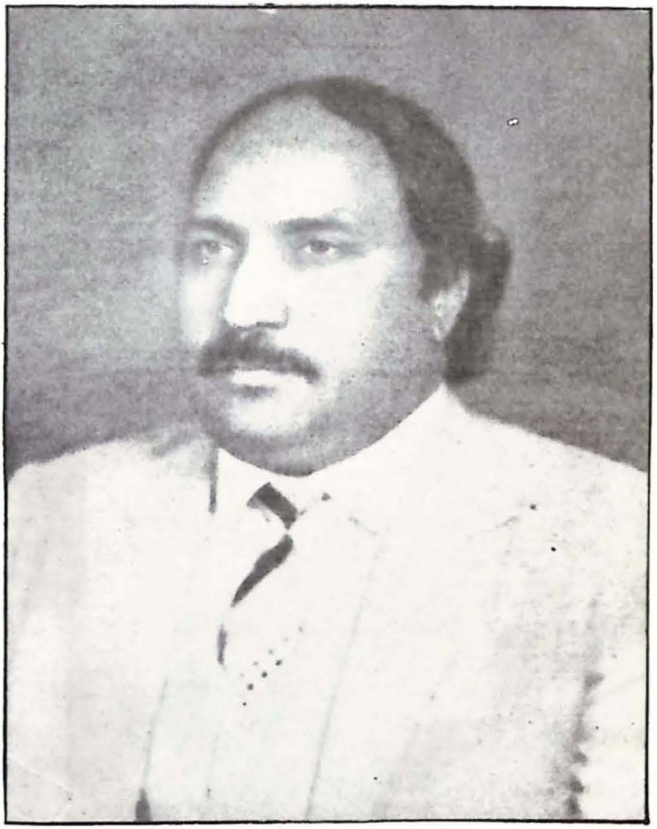

ادیب جاودانی

پرائم منسٹر ھاؤس میں

بھٹو کی آخری رات

ادیب جاودانی

Digitized by M. H. Panhwar Institute of Sindh Studies, Jamshoro.

جملہ حقوق محفوظ

سرورق ———— شاہد

قیمت ———— ۱۲۵/- روپے

مطبع ———— کمبائن پرنٹرز کارڈی ٹرسٹ بلڈنگ نیپئر روڈ لاہور

مقام اشاعت ———— ادارہ مون پبلیکیشنز ۶۳-سی دی مال۔ لاہور

پاران ایم ایچ پنھور انسٽيٽيوٽ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

کچھ اس کتاب کے بارے میں!

پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو کی آخری رات ملکی سیاست کی ایک ایسی دستاویزی داستان ہے جو ہمیں پاکستان کی سیاسی زندگی کے خفیہ گوشے بھی جھلکتے ہیں اور کھلے حقائق بھی سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب میں وہ ان کہی کہانیاں بھی ہیں جن کی صدائیں نعرے بن کر گونجتی اور جن کی بازگشت دنوں سے سنائی دیتی رہی ہے مگر انہیں صفحۂ قرطاس پر الفاظ کی صورت میں سجانے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ اس کتاب نے ان کہانیوں کو لب گویائی بخش دیئے ہیں۔ پھر اس کتاب میں وہ قصے بھی موجود ہیں جنہیں ہمیشہ کے لیے جبر و قہر کے در و دیوار میں چُن کر ختم کر دینے کی کوشش تو کی گئی مگر وہ سینہ بسینہ چلتے ہوئے ملک کی فضاؤں میں رچ بس گئے۔

ادیب جاودانی نے ان قصوں کو بیان کر کے مستقبل کے مؤرخ کے لئے بہتر مواد فراہم کر دیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی داستان میں ایسے بہت سے خفیہ لمحات آتے ہیں جنہیں بیان کرنے کے لئے جیتے کا جگر چاہیئے، شاہین کا تجسس ان مرحلوں میں بھی ادیب کا قلم رواں دواں گزرا ہے۔

کتاب میں بھٹو کی زندگی اور ملکی سیاست کے ان گنت گوشوں، پہلوؤں اور زاویوں سے پردے ہٹائے گئے ہیں اور بہت سے انداز جو پردے ڈالنے کے لئے اختیار کئے گئے ان کے بخیے اس طرح ادھیڑے گئے ہیں کہ بقول شاعر ؎

جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

سو اس کتاب میں قاری کو آستین کا لہو بولتا ہوا مل جائے گا۔

ادارہ مورخ پبلی کیشنز لاہور

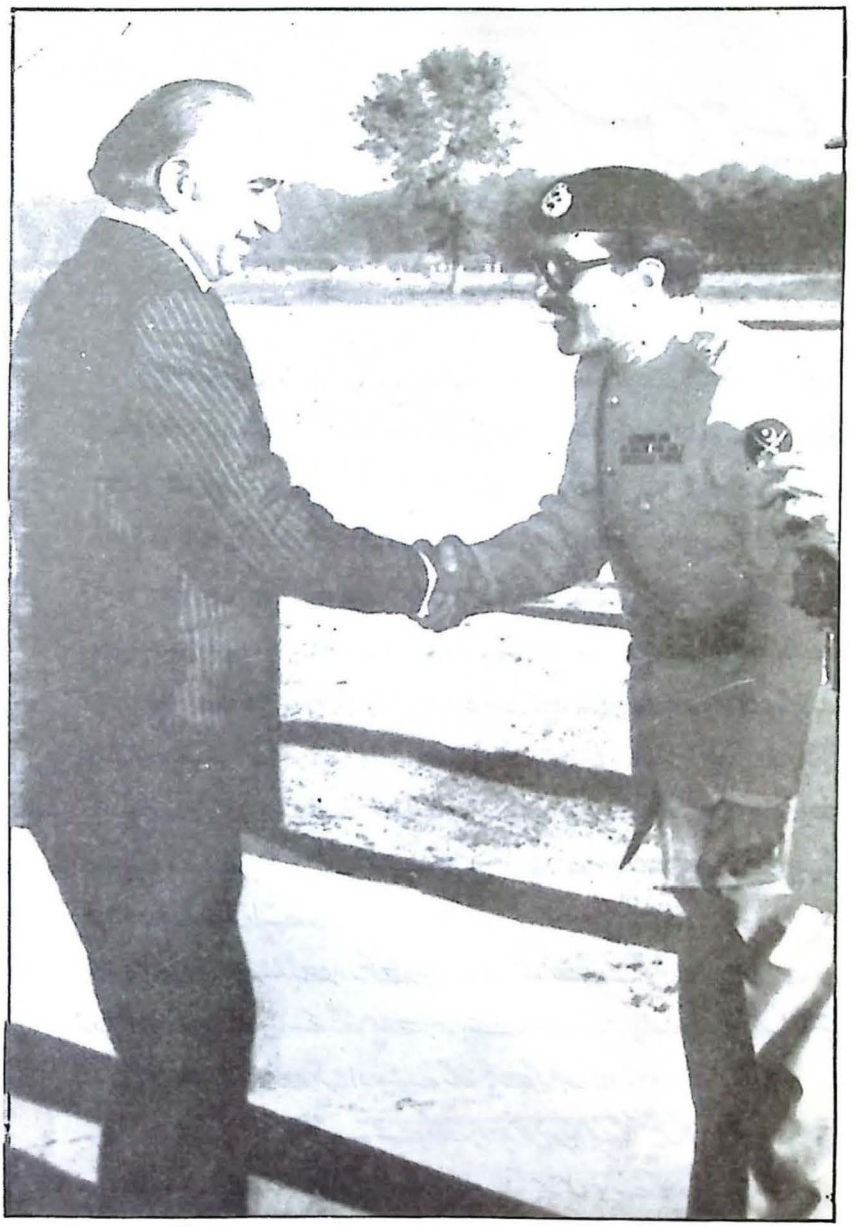

ذوالفقار علی بھٹو جب وزیر اعظم تھے تو جنرل
ضیاء الحق یوں جھک کر ملا کرتے تھے

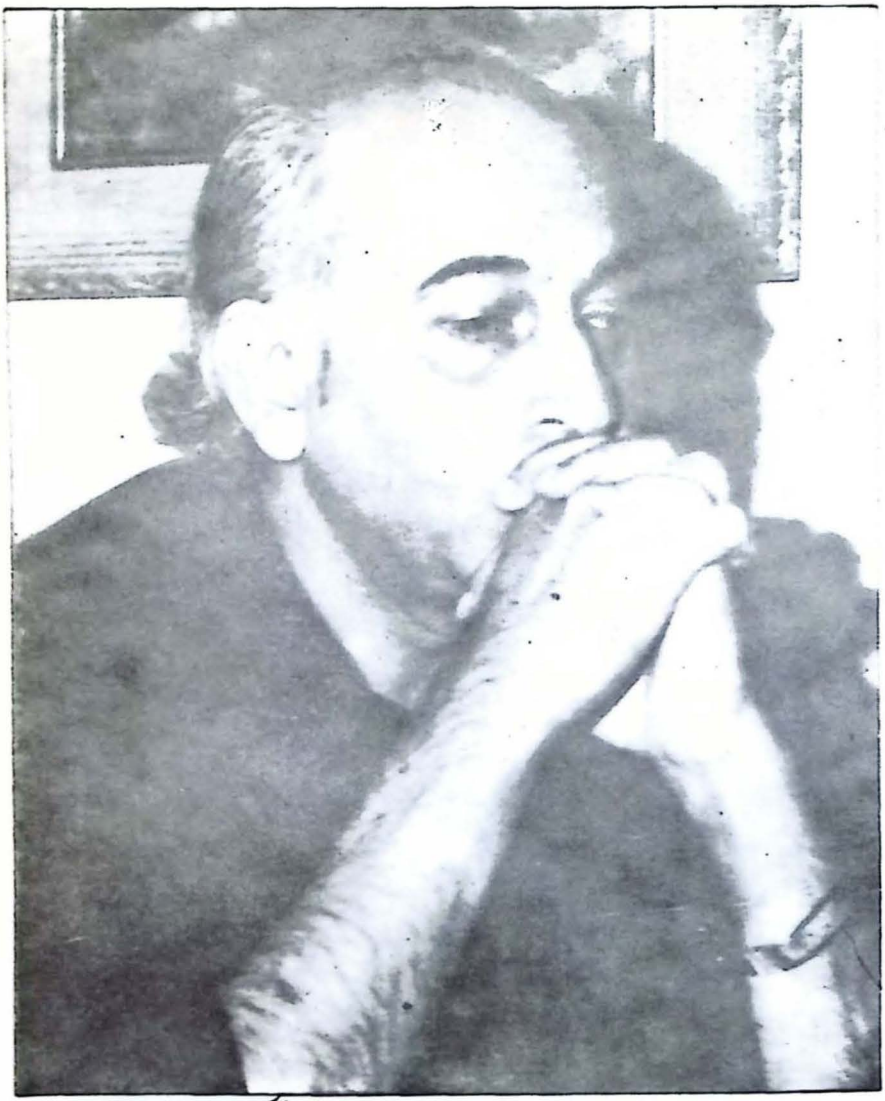

ٹیک اوور کی رات بھٹو پر کیا گذری ؟
فوج نے بھٹو کے ساتھ کیا سلوک کیا ؟

سطر سطر انکشاف ، ورق ورق داستان

تخت اور تختہ میں صرف ایک لفظ کا فاصلہ ہے!

لیکن

ایک لفظ کا یہ فاصلہ

کہیں نوحۂ غم بن جاتا ہے اور کہیں نغمۂ شادی

کسی کے ہاں مارشل لاء کی

اندھی کالی رات شروع ہوتی ہے

اور کہیں شادیانے بجتے ہیں!

انسان کے لہو سے ہوتے ہیں تعمیر محل سلطانوں کے

ہر تارِ نفس کے ٹوٹنے پر بنتا ہے نغمہ شادی کا

۴ جولائی ۷۷ء کی شب مجھے بھٹو خاندان کو ختم
کرنے کا حکم ملا تھا، آج بھٹو خاندان صرف
میری وجہ سے زندہ ہے!

جنرل فیض علی چشتی

جنرل ضیاء الحق نے اپنے اپریشن کی ناکامی کی صورت
میں اپنی جان بچانے کے لئے تمام پیش بندیاں کر رکھی تھیں

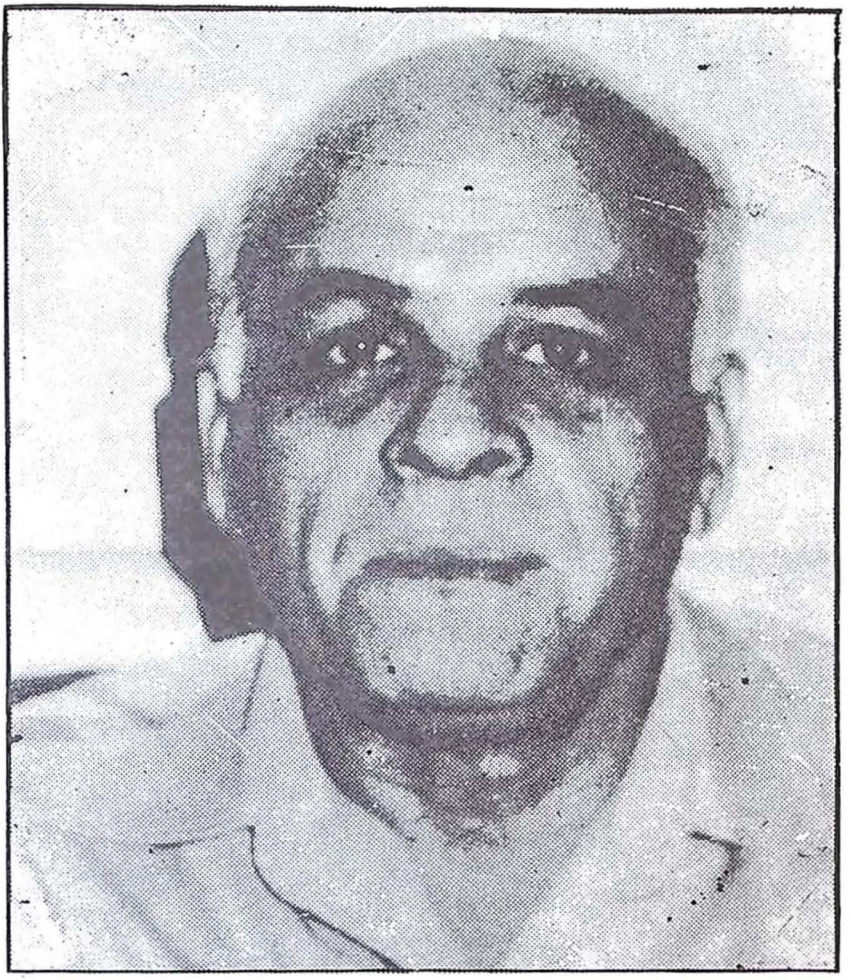

جنرل جیلانی پر اقتدار کے دروازے کھولنے کی

پُراسرار کہانی کا سب سے اہم باب یہی ہے

بریگیڈیئر راحت لطیف
جن کی نگرانی میں بھٹو کو پھانسی دی گئی

بریگیڈیئر امتیاز وڑائچ

جو

اپریشن فیئر پلے کو

بروئے کار لائے تھے

بھٹو نے ضیاء کو کمانڈر انچیف کیوں بنایا — ؟

پاکستان کے انٹیلی جنس اداروں کے کارنامے

بھٹو کا تختہ اُلٹنے والوں میں سے اب کوئی بھی اقتدار میں نہیں ہے

جنرل ضیاء نے ۴، جولائی ۷۷ء کی شب ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے مسٹر بھٹو کی حکومت کو ختم کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اُس فیصلے میں جنرل ضیاء الحق کے علاوہ پانچ کور کمانڈر جنرل فیض علی چشتی، جنرل محمد اقبال، جنرل سوار خان، جنرل جہاں زیب ارباب اور جنرل غلام حسن بھی شامل تھے۔ بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے والے جرنلوں میں سے جنرل ضیاء الحق سانحہ بہاولپور کا شکار ہو چکے ہیں جبکہ باقی جنرل فوج سے ریٹائر ہو کر گوشہ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

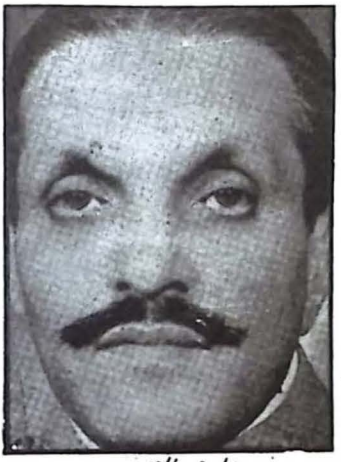

جنرل ضیاء الحق مرحوم

لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن

جنرل سوار خان

جنرل ایف اے چشتی

جنرل جہانزیب ارباب

جنرل اقبال

ادیب صاحب! میرے خلاف اگر کوئی غلط بات
لکھی تو میں تمہارے خلاف مقدمہ دائر نہیں کروں گا
بلکہ لاہور پہنچ کر تمہیں گولی مار دوں گا — یہ کہتے ہم
جنرل حشمت نے آستینیں چڑھا لیں!

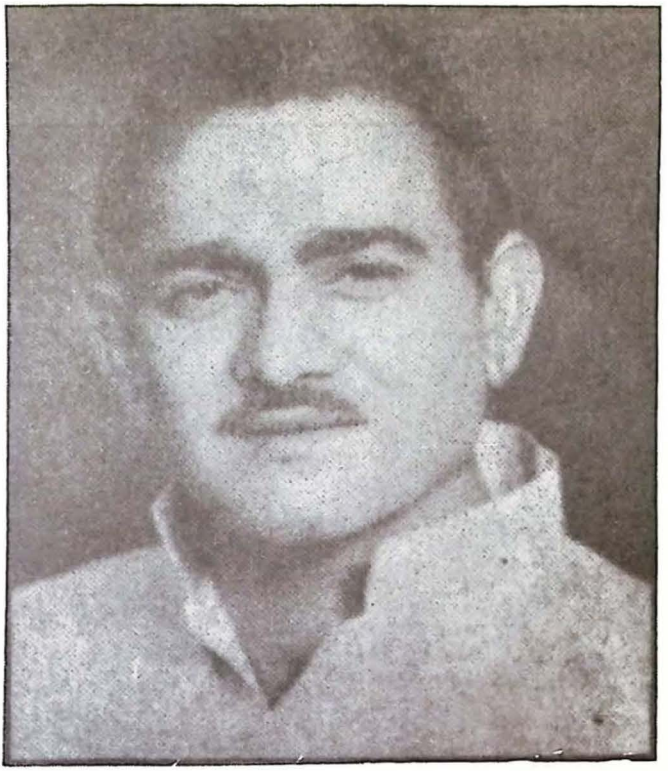

نورا کامیاب نہ ہوسکا

چار اور پانچ جولائی کی جس رات فوج نے "ٹیک اوور" کیا اُس رات کے اُن آخری لمحات میں ذوالفقار علی بھٹو کے وفادار و جاں نثار ملازم نورا نے پرائم منسٹر ہاؤس سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کی۔ نورا نے اپنے چہرے پر مصنوعی داڑھی بھی لگائی کہ وہ شناخت نہ ہوسکے مگر تیز نگاہوں نے اسے تاڑ لیا اور وہ پکڑا گیا۔

بعض لوگ وثوق سے کہتے ہیں کہ اگر نورا اُس رات فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو ضیاء الحق کا مشن بھی ناکام ہو جاتا ۔۔۔ اِس لحاظ سے ایک کی کامیابی دوسرے کی ناکامی تھی!

جنرل ضیاء الحق کے ابتدائی رفقاء کار

جنرل کے ایم عارف

جنرل رحیم الدین

جنرل راؤ فرمان علی

جنرل جمال سید میاں

پاکستان کی پہلی جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے ارکان

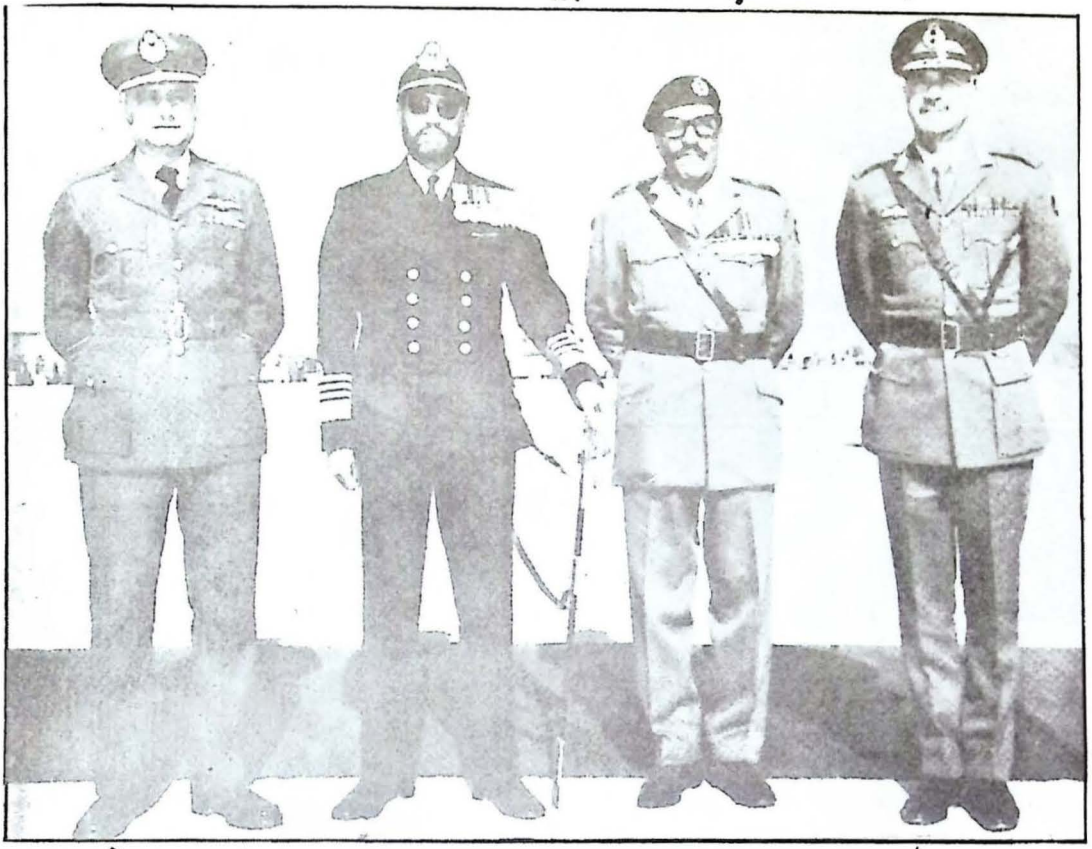

(دائیں سے بائیں) جنرل محمد شریف، جنرل محمد ضیاء الحق، ایڈمرل محمد شریف، ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان

فہرست

پہلا باب	۲۵
دوسرا باب	۳۷
تیسرا باب	۴۷
چوتھا باب	۵۵
پانچواں باب	۶۵
چھٹا باب	۷۱
ساتواں باب	۷۷
آٹھواں باب	۹۳
نواں باب	۱۰۳
دسواں باب	۱۳۳

گیارہواں باب	۱۴۱
بارہواں باب	۱۴۹
تیرھواں باب	۱۵۹
چودہواں باب	۱۶۹
پندرہواں باب	۱۷۷
سولہواں باب	۱۸۵
سترھواں باب	۱۹۹
اٹھارہواں باب	۲۰۵
انیسواں باب	۲۱۵
بیسواں باب	۲۲۱

ترتیب تصاویر

ذوالفقار علی بھٹو	۲۶
تحریک نظامِ مصطفےٰ کے دوران ایک احتجاجی مظاہرہ	۳۶
ذوالفقار علی بھٹو قومی اتحاد کے راہنماؤں کے ساتھ	۵۶
بھٹو، نوابزادہ نصراللہ اور مفتی محمود	۵۹
ذوالفقار علی بھٹو، ضیاالحق	۶۴
جنرل ضیاالحق، وزیراعظم بھٹو	۶۶
آرمی کمانڈ	۷۰
معراج محمد خاں، ادیب جاودانی	۷۲
ذوالفقار علی بھٹو	۷۶
جنرل ضیاالحق، سابق صدر چوہدری فضل الٰہی	۷۸
مسعود محمود	۸۵
جسٹس انوارالحق، ضیاالحق	۸۹
ذوالفقار علی بھٹو پرائم منسٹر ہاؤس میں	۹۲
جنرل ٹکا خان	۹۴
ادیب جاودانی، جنرل ٹکا خان	۱۰۷

نواب زادہ نصراللہ، ادیب جاودانی	۱۰۹
ادیب جاودانی، سردار عبدالقیوم خاں	۱۱۱
مولانا کوثر نیازی، ادیب جاودانی	۱۱۳
ادیب جاودانی، مولانا شاہ احمد نورانی	۱۱۵
غلام مصطفےٰ جتوئی، ادیب جاودانی	۱۱۸
ادیب جاودانی، اصغر خاں	۱۲۱
پروفیسر غفور، ادیب جاودانی	۱۲۳
ذوالفقار علی بھٹو، پیر پگاڑا	۱۲۵
میر علی احمد تالپور، ادیب جاودانی	۱۲۷
ذوالفقار علی بھٹو، حفیظ پیرزادہ	۱۲۹
غلام اسحاق خاں، جنرل ضیاء الحق	۱۳۴
ذوالفقار علی بھٹو، ہنری کسنجر	۱۴۸
ذوالفقار علی بھٹو	۱۵۰
جنرل غلام جیلانی	۱۶۰
بے نظیر بھٹو	۱۶۸
ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق	۱۷۰
جنرل فیض علی چشتی، ادیب جاودانی	۱۷۸
پرانی سنٹرل جیل راولپنڈی	۱۸۶
جسٹس مولوی مشتاق حسین، ادیب جاودانی	۲۰۰
ادیب جاودانی، میر بشیر	۲۰۶
بھٹو کے ہاتھ کا پرنٹ	۲۱۶

پہلا باب

بھٹو کا شانداو ذہن اپنے اقتدار کے آخری دنوں
میں ماؤف و ماند کیوں پڑ گیا تھا؟

اگر بھٹو اپنے لوگوں کی وفاداریوں کو برقرار رکھتے تو
کوئی جرنیل اتنی آسانی سے ان کا تختہ نہیں الٹ
سکتا تھا۔!

بھٹو کو عوام کی حمایت حاصل تھی جو مارشل لاء
کے زہر کا بہترین تریاق ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو اقتدار کی محرومی کے بعد

یہ حقیقت ہے کہ بھٹو، پاکستان کے غریب عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا۔ بیشک بھٹو نے غریبوں سے اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ اس کے باوجود وہ ان کا ہیرو تھا کیونکہ پاکستان کی سیاست میں پہلی بار صرف بھٹو نے غریبوں کے مسائل و معاملات کو پوری شدت سے اٹھایا اور عوام کے دلوں میں اتر گیا تھا۔ اِس مقبولیت سے بھٹو بخوبی آگاہ تھا اور اس کا دعویٰ تھا:

"میں ہر دُکھی گھر کا درماں بن گیا ہوں، جس گھر کی چھت برسات میں ٹپکتی ہے یا جس کا چولہا ٹھنڈا رہتا ہے اُس گھر کی چھت کے نیچے میں خود موجود ہوتا ہوں، میں اس سرزمین کے دُکھ درد کی ملکیت ہوں۔ عوام سے میرا ایسا اٹوٹ رشتہ ہے جسے کوئی فوج نہیں توڑ سکتی۔"

بھٹو کا خیال تھا کہ دراصل فوج کو سیاسی اقتدار کا چسکا پڑ گیا تھا، حد یہ کہ مشرقی پاکستان میں شکست کے بعد صرف ایک سال کے اندر ہی بعض سینئر فوجی افسران انقلاب برپا کرنے کی سازش میں مصروف نظر آئے۔ وہ اگر مشرقی پاکستان کے سانحہ کو اتنی جلدی بھول سکتے اور ۱۹۷۲ء کے انقلاب کا منصوبہ بنانے پر اتر سکتے ہیں تو وہ کسی وقت بھی فوجی بیرکوں کو چھوڑنے اور گورنمنٹ ہاؤسوں میں آنے کے لئے موقع کے منتظر رہتے ہوں گے۔ اِن حالات میں بظاہر بھٹو کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ فوج کو اقتدار میں گھس آنے کا کوئی موقع نہ دیا جائے لیکن بھٹو نے یکے بعد دیگرے جو سیاسی غلطیاں کیں اور جرنیلوں کا اعتماد جیتنے کے لئے جو حربے اختیار کیے وہ بالآخر فوجی اقتدار کا موجب بن گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو میں کئی منفرد خصوصیات تھیں مثلاً یہ کہ وہ پاکستان کا سب سے پہلا منتخب حکمران تھا اور ایسا واحد حکمران بھی جسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

پھانسی ان حکمرانوں اور جرنیلوں کا مقدر نہیں ہوئی جن کے اقتدار اور قیادت میں پاکستان دولخت ہوا، پھانسی پاکستان کے سب سے پہلے اور اپنی زندگی تک آخری منتخب حکمران کے حصہ میں آئی۔

کیوں — ؟

اس "کیوں" کے جواب میں پاکستان کی پوری تاریخ پھیلی ہوئی ہے جو عوام کے تمام حقوق کو غصب کر کے اقتدار کو مفاداتی سازشوں کا غلام بنانے اور آزادی کو اپنے باپ سے ملنے والی لونڈی سمجھ کر استعمال کرنے کا نام ہے۔ اس شرمناک تاریخ کو پھیلایا جائے تو وہ نصف صدی کے لگ بھگ سالوں پر محیط ہو جاتی ہے لیکن مختصراً بیان کیا جائے تو نصف صدی کا پہاڑ کھودنے پر صرف یہ "چوہیا" برآمد ہوتی ہے کہ اگر کسی کے پاس طاقت ہے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

"طاقت" ایک جواز ہے جو کسی کے پاس موجود ہو تو وہ آزاد ہے کہ پوری قوم سے جو جبر چاہے کر ڈالے اور "مردِ مومن" "مردِ حق" کہلائے۔

ان جملہ ہائے معترضہ سے قطع نظر، بات تھی بھٹو کی منفرد شخصیت کی۔ بھٹو — پاکستان کا پہلا اور اپنی زندگی تک آخری منتخب حکمران تھا جسے عوام نے پذیرائی بخشی تھی اور اگر انتخابات ہوتے تو وہ جیل کے اندر ہوتے ہوئے بھی مخالفوں کی ضمانتیں ضبط کرا دیتا۔

"مردِ مومن" کو اس حقیقت کا علم تھا اس لئے بھٹو کی زندگی میں، جیل میں ہی سہی، انتخابات کی نوبت نہیں آئی۔

بھٹو کی دوسری منفرد خصوصیت اسکی ذہانت و فطانت تھی، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے بعد وہ پاکستان کا سب سے تابناک ذہن تھا اور اس ذہن نے موت کی کال کوٹھڑی میں مزید جلا پائی تھی اور بلاشبہ قید و بند اور جبر کے اس سلسلہ نے بھٹو کے پہلے سے حیرت انگیز ذہن کو دس گنا زیادہ طاقتور کر دیا تھا اور وہ اپنی قوم سے کم سے کم ۱۰۰ سال آگے نکل گیا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو نہ صرف ہزاروں ضیاالحق اس کی گرد راہ ہوتے بلکہ آئندہ اس ملک میں کسی جرنیل کو ایوانِ اقتدار کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوتی۔

لیکن بھٹو کی یہی ذہانت و فطانت اس کے لئے روگ بن گئی تھی ؎

اے روشنیٔ طبع، تو برمن بلا شدی

ضیاالحق اس ذہانت کا اعتراف ذرا دوسرے رنگ میں کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بھٹو نے مجھ سے کہا:

"طاقت آپ کے پاس ہے اور ذہانت میرے پاس ۔ اس لئے ہم اگر مل کر حکومت کریں تو کوئی بھی ہمارے اقتدار کو چیلنج نہ کر سکے گا۔"

ہالی وڈ کی ایک حسین و جمیل ایکٹرس نے مشہور دانشور ڈرامہ نگار برنارڈ شا سے کہا تھا:

"آپ مجھ سے شادی کر لیں ۔!"

شا نے حیرت سے دریافت کیا:

"لیکن کیوں ۔ میں آپ سے شادی کیوں کروں؟"

ایکٹرس نے جواب دیا:

"ذرا سوچئے، ہماری جو اولاد آپ کا ذہن اور میرا حسن لے کر پیدا ہوگی دنیا میں اس کا جواب نہیں ہوگا۔"

شا نے فوراً جواب دیا:

"لیکن محترمہ ۔ اگر ہماری اولاد آپ کا ذہن اور میرا حسن (شا خاصے بدصورت تھے) لے کر پیدا ہو گئی تو اس کا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟"

برنارڈ شا حسن اور ذہن کے ملاپ سے بچ نکلے تھے۔ بھٹو صاحب بھی "طاقت" اور "ذہانت" کے ملاپ سے بچ گئے تھے کیونکہ ایک دنیا جانتی ہے کہ مری میں ضیاالحق نے بھٹو سے ملاقات کی تو بھٹو نے اپنی پوری ذہانت سے کہا تھا:

"مولانا ۔ آپ نے آئین کی شق نمبر چھ پڑھی ہے اس کے تحت آئین کو 'ٹیک اوور' کرنے کی سزا موت ہے۔"

یہ اشارہ تھا آئین کے تحت ضیاالحق کے انجام کی طرف ۔ اور ضیاالحق نے اس 'ذہانت' کو سمجھ لیا تھا طاقت اس کے پاس موجود تھی چنانچہ پھندا، پاکستان کے پہلے منتخب حکمران کے گلے کا مقدر ٹھہر گیا۔

بھٹو کو خود اپنے بارے میں یہ یقین بھی تھا کہ صرف وہی ایسا فرد ہے جو پاکستان کو غربت و پسماندگی سے نجات دلا سکتا ہے اور جو عوام کو غاصبوں کے پنجے سے چھڑانے کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ یہ غلط فہمی سہی مگر بڑی "خوبصورت غلط فہمی" تھی ۔!

سرکاری وائٹ پیپرز کے جواب میں بھٹو نے جو بیان دیا وہ صرف عدالت سے خطاب نہیں بلکہ بھٹو اپنے درخشاں ذہن کے پلیٹ فارم سے تاریخ کے ساتھ مخاطب ہوا ہے اور اسی لئے اس کے لہجہ میں خوف و خطر کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا ۔ یہ بیان، ترقی پذیر تیسری دنیا کے بارے میں بھٹو کا منفرد تجربہ بھی ہے اور

تجزیہ بھی ۔۔۔ پولیٹیکل سائنس کے طلبہ کے لئے پاکستان انتہائی دلچسپ ممالک میں سے ایک ملک ہی نہیں بلکہ شاید سب سے دلچسپ ملک ہے جہاں بڑے اعلیٰ وارفع نظریات اور نظاموں کے نام پر اقتدار کی گھناؤنی، مکروہ اور غلیظ جنگ بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے لڑی جاتی ہے ۔۔۔!

بھٹو کا دعویٰ ہے کہ جرنیلوں نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا وار کرنے سے بہت پہلے اقتدار پر قبضہ کے لئے اپنی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں اور 'انقلاب' رفتہ رفتہ فوج اور قومی اتحاد میں 'سودا' طے پانے کے بعد مکمل ہوا۔ فوج اور اتحاد کا یہ 'سودا' ایک غیر ملکی طاقت کے ذریعہ طے ہوا۔ پہلا منصوبہ یہ تھا کہ انتخابات میں بھٹو کو شکست دی جائے۔ اس کے لیے پی این اے کو تیس کروڑ روپے دیئے گئے لیکن انتخابات میں ناکامی پر فوج کی طرف سے تختہ اُلٹنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ "غیر ملکی طاقت" چاہتی تھی کہ پاکستان ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ سے دستبردار ہو جائے جس پر بھٹو رضامند نہ ہوا ۔۔۔ تو اُسے زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

بھٹو، اس سازش کے ثبوت میں کوئی دستاویزی شہادت پیش نہیں کرتے اور زور دے کر کہتے ہیں کہ ان سے طویل قید و بند کی وجہ سے دستاویزی ثبوت کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔ مزید یہ کہ پاکستان کے قومی مفادات کی وجہ سے وہ بہت سے 'دوسرے انکشافات' نہیں کرنا چاہتے، حتیٰ کہ "غیر ملکی طاقت" کا نام بھی انہوں نے بیان سے حذف کر دیا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان کی سیاست میں غیر ملکی اثر و رسوخ اور فوجی عمل دخل کی مذمت میں بھٹو اتنے "مخلص" کیوں ہو گئے؟ اس ضمن میں خود بھٹو کا ریکارڈ ملا جلا ہے۔ وہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں حکومت میں آئے ۱۹۶۱ء میں ایک بیان میں انہوں نے ایوب خان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں "لنکن سے زیادہ بڑا، لینن سے زیادہ عظیم، ہمارا اتاترک، ہمارا صلاح الدین (ایوبی) قرار دیا لیکن ایوب شاہی سے نکلنے پر وہ اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب خود بھٹو نے پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا تو یہ "انتقالِ اقتدار" بھی صرف فوج کے جرنیلوں اور غیر ملکی پشت پناہی کی وجہ سے مکمل ہوا۔ اپنے پہلے نشریہ میں جب بھٹو نے کہا:

"میں عوام کا منتخب نمائندہ ہوں، مجھے دھوکے سے عوام پر مسلط نہیں کیا گیا ۔۔۔؟"

تو وہ دراصل ۱۹۷۰ء کے انتخابات جیتنے اور اپنے سے پہلے کے دو حکمرانوں ایوب خان اور یحییٰ خان کا ذکر کر رہے تھے جو قوم پر مسلط کر دیئے گئے تھے۔

لیکن بھٹو خوب جانتے تھے کہ وہ صرف انتخابات کے ذریعہ برسرِ اقتدار نہیں آئے۔ انہیں امریکہ کی حمایت کے

ساتھ ساتھ فوج کے دو بڑے آدمیوں یعنی چیف آف دی آرمی جنرل شاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن (بھٹو نے انہیں فوراً ترقی دے کر کمانڈر انچیف بھی بنایا) اور فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خاں کی حمایت بھی حاصل تھی ۔ وطن واپسی سے پہلے انہیں امریکہ میں ہی یہ اطلاعات مل چکی تھیں کہ ایوانِ صدر پر پاک فضائیہ کے طیاروں کی گڑگڑاہٹ گونج رہی ہے تاکہ یحییٰ خان کو نکالا جائے اور پھر بھٹو کے راولپنڈی پہنچنے سے پہلے جرنیلوں کو علم تھا کہ وہ واشنگٹن میں صدر نکسن اور وزیر خارجہ ولیم راجرز سے "کلیرنس سرٹیفکیٹ" لے کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اتنی تیزی اور آسانی سے اقتدار منتقل ہو گیا۔ ۲۰ دسمبر کو وہ ایوانِ صدر میں اپنی کار خود ڈرائیو کرتے ہوئے پہنچے اور اسی کار پر صدارتی پرچم لہراتے ہوئے باہر آئے ۔ البتہ وہ اس کریڈٹ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ "سیاسی اقتدار کا انحصار عوام پر ہونا چاہیئے فوج پر نہیں" مزید برآں "غیر ملکی اثر و رسوخ" کے خاتمہ کے لئے انہوں نے آزاد خارجہ پالیسی کی بھی بنیاد رکھی۔

۱۹۶۸ء کی دہائی میں طلباء کی طاقت سے انہوں نے ایوب شاہی کو ہلایا تھا پھر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ مغربی پاکستان سے مقبول عوامی رہنما بن کر ابھرے تاہم خود انہوں نے اپنے ہی نظریات کی اس وقت خلاف ورزی بھی کی جب انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنی عوامی اکثریت سے "فائدہ اٹھانے" کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی پاکستان کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی، ملک دولخت ہوا پھر شیخ مجیب الرحمٰن قتل ہوئے بعد ازاں بھٹو پھانسی چڑھے اور اس ڈرامے کا تیسرا (غیر ملکی) کردار (اندرا گاندھی) بھی قتل ہو گئیں۔ بھٹو اگر خود اپنے نظریہ سے انکار و انحراف نہ کرتے تو پاکستان کی تاریخ اور اس ملک کے دو پُرکشش عوامی نمائندوں (مجیب اور بھٹو کا انجام) بالکل مختلف ہوتا۔۔۔

ذوالفقار علی بھٹو جب "فوجی اقتدار" کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ خاصا جاندار اس لئے ہوتا ہے کہ خود بھٹو، مارشل لاء کا ثمر بھی ہیں اور مارشل لاء کا نشانہ بھی ۔۔۔ ایک مارشل لاء انہیں ایوانِ اقتدار میں لایا تھا اور ایک دوسرا مارشل لاء انہیں اس ایوان سے نکال کر تختۂ دار پر لے گیا تھا اسی لئے بھٹو فوجی اقتدار کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتے اور اسے تیسری دنیا کے لئے "خطرناک" قرار دیتے ہیں۔

پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جنرل ضیاء وہی شخص ہیں جسے خود بھٹو نے کئی سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے کمانڈر انچیف بنایا تھا اور پھر یہی وہ جنرل ضیاء الحق تھے جسے بھٹو نے (۱۹۷۳ء میں) اپنی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی ایک فوجی کوشش کی تحقیقات کرنے والی کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا تھا اور جنرل ضیاء نے سازش میں ملوث بعض افسروں کو سزائیں دی تھیں۔

ایسا ہی عجیب اقدام صدر ایوب نے کیا تھا۔ انہوں نے بھٹو کو اپنا خصوصی سفیر بنا کر ترکی بھیجا تھا تاکہ فوجی

جرنیلوں کو وہ سزائیں دینے سے روکا جائے جو وہ ترکی کے وزیراعظم مینڈرس، وزیرخارجہ زرکو اور وزیرخزانہ کیپاکن کو دے رہے تھے۔ بھٹو کو اپنے مشن میں ناکامی ہوئی تھی اور ان ترک رہنماؤں کو فوجی جرنیلوں نے پھانسی دے ڈالی تھی۔

لطف یہ ہے کہ فوجی عمل کی مخالفت کے باوجود بھٹو، بلوچستان میں خود یہی فوجی عمل کرواتے رہے حالانکہ خود ان کی پارٹی کے اندر بعض حلقوں نے انہیں اس سے روکنے کی بھی کوشش کی تھی۔ بلوچستان میں بھٹو کا ریکارڈ بھی ظلم و جبر کا ریکارڈ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سب "کالے برتن اور کالی کیتلی" کا جھگڑا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کو کالا ہونے کے طعنے دے رہے ہیں۔

ایک اور عجوبہ یہ ہے کہ خود بھٹو نے، غیرارادی طور پر جنرل ضیا کے برسراقتدار آنے کی راہ ہموار کی اور جنرل ضیا نے غیرارادی طور پر، بھٹو فیملی کے لیے ایوان اقتدار کا راستہ ہموار کیا۔ دونوں نے نادانستہ طور پر اقتدار کے لیے ایک دوسرے کی لاشعوری مدد کی۔

آیئے ذرا ان "عجوبوں" کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی طلسماتی کشش کا ایک شاہکار یہ ہے کہ بھٹو، اپنی جسمانی موت کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے اور یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ آج بھٹو کی بیٹی بے نظیر، پاکستان کی حکمران ہے، ایوانِ اقتدار تک محترمہ بے نظیر کی راہ میں حائل مشکلات کو دُور کرنے میں جہاں خود محترمہ کے عزم و حوصلہ کی داد دینا پڑتی ہے وہاں اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کی گرفت نے انتخابات جیتنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ تاہم بے نظیر کو جنرل ضیا کا ترمیم شدہ ایک ایسا آئین ملا ہے جس میں صدرِ مملکت کو 'ویٹو' کی طاقت حاصل ہے جو وزیراعظم اور حتیٰ کہ پوری قومی اسمبلی کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار ہے۔ مختلف سیاسی جماعتیں اس "ویٹو پاور" (آٹھویں ترمیم) کی مخالف رہی ہیں لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے جس طریق پر ہمہ مقتدر وزیراعظم کا کردار ادا کیا اس کے باعث یہ جماعتیں اب کسی دوسرے ہمہ مقتدر وزیراعظم سے خائف ہیں۔

بھٹو نے ۱۹۷۲ء کے آئین میں ترامیم کا سلسلہ، اس آئین کو اپنانے کے چند ماہ کے اندر ہی شروع کر دیا تھا حد یہ کہ حکومت نے سیاسی جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دینے کے اختیارات بھی حاصل کر لئے تھے۔ بے شک یہ اختیار "عدالتی رائے" کا پابند تھا مگر اس کی ضرورت کیا تھی؟ اسی اختیار سے بالآخر "نیشنل عوامی پارٹی" کا خاتمہ کیا گیا۔ فروری ۱۹۷۳ء میں بلوچستان کی مخلوط حکومت ختم کر کے سرحد اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کے اقتدار کی راہیں ہموار کی گئیں اور یوں مرکز سمیت چاروں صوبوں میں بھٹو کی پارٹی حکمران بن گئی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھٹو اس سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ حقیقتاً وہ پاکستان میں صدارتی نظام کے خواہاں تھے اس مقصد کے لئے انہوں نے لندن کے ایک برطانوی ماہر کی خدمات بھی حاصل کیں اور اسی مقصد کے لئے بھٹو چاہتے تھے کہ انہیں قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہو جائے تاکہ وہ آئین میں اپنی حسب منشا ترمیم کر کے اسے پارلیمانی سے صدارتی نظام میں تبدیل کر سکیں اور یہی خواہش ان کی تباہی کی بنیاد بن گئی۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے لئے عام اکثریت کا حصول کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ مخالفین بھی تسلیم کرتے تھے کہ پارٹی، حکومت کے لئے عام اکثریت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن بھٹو دو تہائی اکثریت چاہتے تھے تاکہ آئین میں من مرضی کی ترامیم کر سکیں۔ یہیں سے معاملہ بگڑا۔

بھٹو کے بہت سے ساتھی بھی ان سے الگ ہو گئے اور وہ افسر شاہی میں گھر کر رہ گئے۔ ان کے چیف آف سٹاف" پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل پولیس (راؤ رشید) بن گئے۔ وہی وزیر اعظم کے انتخابی سیل کے بھی انچارج مقرر ہوئے۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مطلوبہ مقصد حاصل کرنے کے لئے سخت گیرانہ اقدامات سے اشتعال پیدا ہوا۔ بھٹو کی بلا مقابلہ کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے مخالف امیدوار کو اغوا کر لیا گیا حالانکہ اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی کیونکہ لاڑکانہ کی اس نشست سے بھٹو بہر صورت جیت جاتے۔ یہ دلیل بے وزن ہے کہ بھٹو کے ماتحت اہلکار جو کچھ کر رہے تھے بھٹو اس سے بے خبر تھے۔ بہرحال خود وزیر اعظم نے اپنی کامیابی کے لیے جو مثال قائم کی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نے بھی اس کی پیروی کی۔ اس سے نفرت و بیزاری پھیل گئی۔

جرنیلوں کو آگے لانے میں بھی خود بھٹو نے فاش غلطیاں کیں۔ سب سے پہلے وہ بلوچستان کا بینہ کو یکطرفہ طور پر برطرف کر کے " بلوچ بغاوت" روکنے کے لئے فوج لے آئے اور بعد ازاں انتخابات کے بعد کی صورتحال سے نپٹنے کیلئے بھی بھٹو نے فوج پر انحصار کیا۔

انہوں نے ایجی ٹیشن کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی اس کے لیے انہیں فوج کی ضرورت پڑی۔ پھر جرنیلوں کا اعتماد اپنے حق میں رکھنے کے لئے انہوں نے پالیسیوں کے فیصلے کرنے کے عمل میں جرنیلوں کو بھی شامل کرنا شروع کر دیا۔ چار شہروں میں مارشل لاء نافذ کیا گیا جب اس سے بھی مقصد حاصل نہ ہوا تو فوج کو قوت محرکہ کی حیثیت دے کر اس سے کام لینے کی کوشش کی گئی۔ حد یہ کہ حزب مخالف کے رہنماؤں سے ملاقاتوں میں بھی بھٹو صاحب نے جرنیلوں کو بلانا شروع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے خود فوجی انقلاب کی راہ ہموار کی۔

اس بنیادی غلطی کے باوجود بھٹو کا احترام اس لئے برقرار تھا کہ اس شخصیت نے عام انسانوں، غریبوں

کو زبان عطا کی تھی اور پاکستانی سیاست میں انہیں ایک اہم درجہ دے دیا تھا۔ ایک خاکروب کے الفاظ میں۔

" کچھ بھی ہو بھٹو غریبوں کا نام تو لیتا ہے پہلے تو کسی کو ہمارے وجود کا بھی احساس نہیں تھا "

بھٹو اپنے اس " ٹرمپ کارڈ " کو کسی وقت بھی بروئے کار لا سکتا تھا۔ اسی کے ذریعہ اس نے پنجابی عوام میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑائی تھی اور پنجاب بھٹو کے اقتدار کی بنیاد تھا۔ لیکن بھٹو اس کارڈ " کو استعمال کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے اپنے وعدے بھی پورے نہیں کئے تھے اور پارٹی قیادت سے غریبوں کا نام لینے والوں کو بھی نکال ڈالا تھا۔ حتیٰ کہ ۷۵، ۱۹۷۶ء میں پارٹی کی ۷۰ فیصد قیادت جاگیرداروں کے قبضہ میں آچکی تھی اور نوابوں کو صوبوں کے گورنر بنا ڈالا گیا تھا۔ جبکہ خود بھٹو عوام سے کٹ چکا تھا۔

بھٹو کے ان اقدامات کا لازمی نتیجہ جنرل ضیاء کا فوجی انقلاب تھا لیکن خود جنرل ضیاء نے برسر اقتدار آکر بھٹو خاندان کے خلاف جو پالیسیاں اختیار کیں، انہوں نے اس خاندان کی مقبولیت کو نہ صرف بحال رکھا بلکہ سالہا سال تک کا قیام بھی بخش دیا۔ چنانچہ یہ قطعی حقیقت ہے کہ جنرل ضیاء کے اقدامات سے بھٹو خاندان کے لئے برسر اقتدار آنے کے مواقع اسی طرح پیدا ہو گئے جس طرح خود بھٹو کے اقدامات سے جنرل ضیاء کے اقتدار کے مواقع پیدا ہوئے تھے۔

البتہ یہ درست ہے کہ بھٹو نے بھی غیر ارادی طور پر جنرل ضیاء کے لئے راستہ ہموار کیا اور اسی طرح جنرل ضیاء نے بھی قطعی غیر ارادی طور پر بھٹو خاندان کی راہ ہموار کر دی۔

یہ سوال بھی اہم ہے کہ بھٹو کی طرف سے " فوجی اقتدار " کی مخالفت، جمہوری نظریات کی بنیاد پر تھی یا محض اس لئے کہ اس کے سوا اُن کے لئے اور کوئی راستہ نہیں تھا؛ پھر یہ کہ خود اپنا تختہ اُلٹے جانے کے بعد وہ ایک " غیر ملکی طاقت " کی مداخلت کا رونا کیوں روتے رہے؟

بھٹو اگر زندہ رہتے تو ان کے کردار سے ان سوالوں کا جواب مل سکتا تھا اور یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے نظریات سے کس حد تک مخلص ہیں؛ اب تو صرف قیاسات اور مفروضوں پر ہی بات ہو سکتی ہے جو ظاہر ہے کہ ہمیں پسند نہیں۔

ایک اور سوال بھی بڑا اہم ہے کہ بھٹو اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں اتنے مغرور اور متکبر کیوں ہو گئے تھے جس کے باعث زندگی کے مختلف شعبوں کے اہم لوگ ان سے بگڑ گئے؟

بھٹو کے پاس اقتدار تھا، مقبولیت تھی، اعلیٰ تعلیم تھی (جو دوسروں سے اچھا سلوک سکھا دیتی ہے) انہوں نے ایک آزاد اور روشن خیال ماحول میں پرورش پائی تھی" پھر انہوں نے اپنے کیریئر کے آخر میں دوسروں سے ایسا سلوک کیوں کیا جو قبائلی سردار غصہ کے عالم میں کرتے ہیں۔

بھٹو کا شاندار ذہن اور خلوص جو موت کی کوٹھڑی سے بھی اپنی جھلک دکھاتا رہا ان دنوں، اقتدار کے اواخر میں، ماؤف و ماند کیوں پڑ گیا تھا ۔؟ اُن کا رویّہ کسی ترقی پذیر ملک کے مہذب رہنما کا رویّہ نہیں رہا تھا۔ حالانکہ اُس وقت اُفق پر بدقسمتی کی کوئی گھٹائیں نہیں تھیں سوائے ان کے جو خود بھٹو نے پیدا کر ڈالی تھیں۔

اگر بھٹو ان لوگوں کی وفاداریوں کو برقرار رکھتے جو ان کی خدمت کرتے تھے اور جو اقتدار کے ہر آلہ کے ساتھ ناچنے کے لئے تیار نہیں تھے تو اقتدار کا خواہاں کوئی جرنیل اتنی آسانی سے ان کا تختہ نہ اُلٹ سکتا بھٹو کو عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی جو مارشل لا کے زہر کا بہترین تریاق ہے لیکن بھٹو کے رویّہ نے خود بھٹو کو بھی بے یقینی اور بے اعتمادی کے بھنور میں پھنسا دیا اور یہ سچ ہے کہ تیسری دنیا کے بہت سے رہنما اپنے ممالک میں جمہوری اداروں اور روایات کو فروغ دینے کی بجائے خود اپنی انا کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ۔۔

اور یہی بھٹو کے ساتھ ہوا ۔!

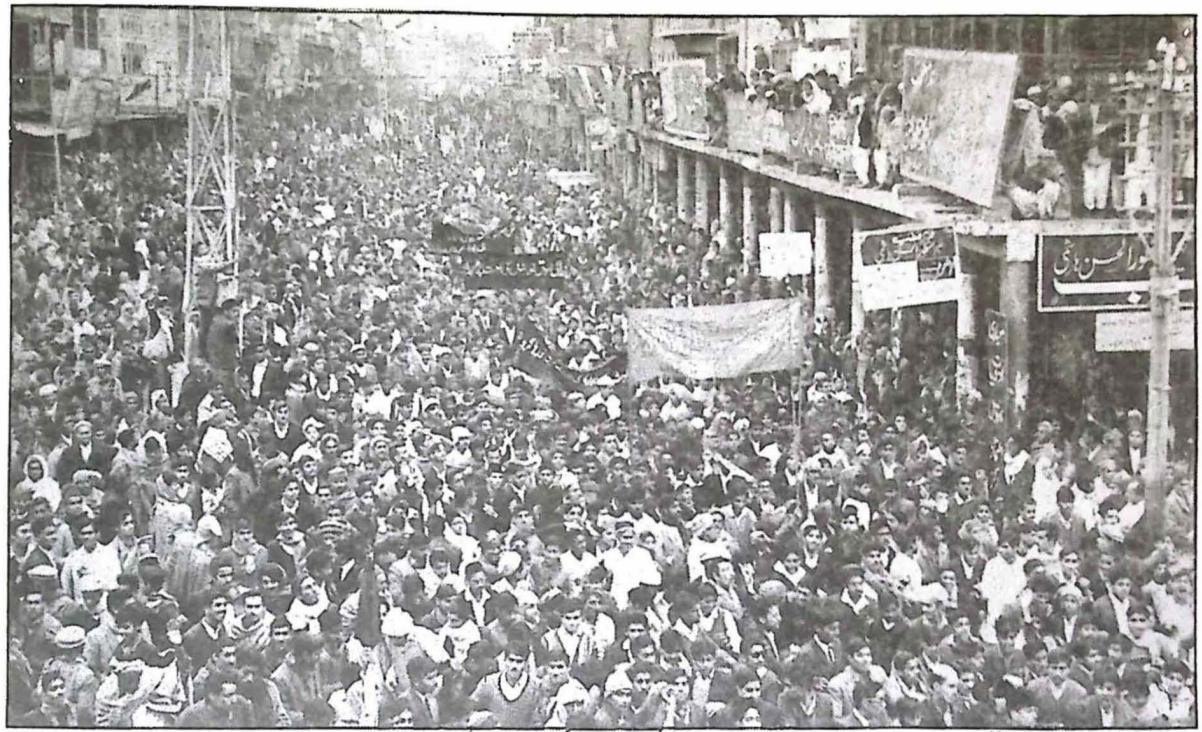

تحریک نظام مصطفےٰ کے دوران بھٹو حکومت کیخلاف ایک احتجاجی جلوس کا منظر

دوسرا باب

وہ رات اتنی تاریک اور ڈراؤنی نہیں تھی

نظامِ مصطفےٰ کا نعرہ بالآخر مارشل لا بن گیا

معاہدہ، سودا یا سازش ــــــ؟ اسے کیا کہیے

تین فریق ــــــ امریکہ، فوج اور اتحاد!

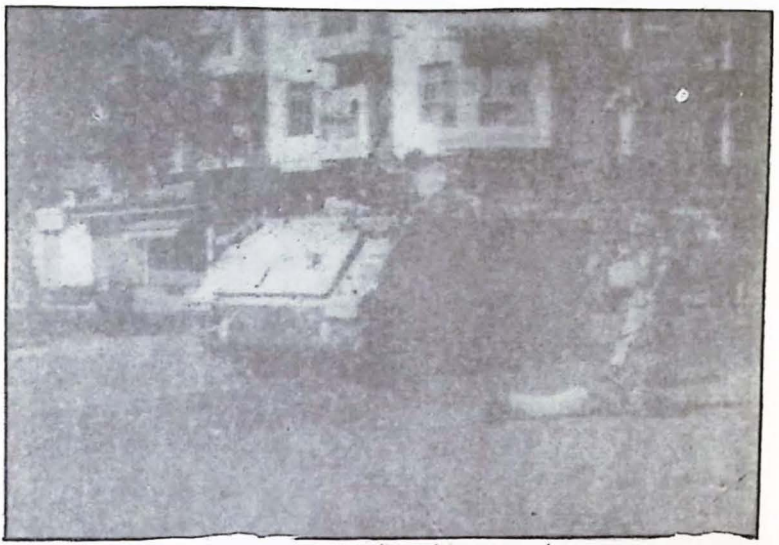

کراچی میں نظام مصطفےٰ کی تحریک کو ختم کرنے کیلئے سڑکوں پر ٹینک گشت کر رہے ہیں

کراچی میں فوج کے سپاہی وکلاء کے جلوس کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں

۴ جولائی ۱۹۷۷ء کی شب اتنی تاریک اور ڈراؤنی ہرگز نہیں تھی جتنی وہ بعد میں ثابت ہوئی۔ یہ اتنی طویل بھی نہیں تھی کہ پھیل کر سالوں پر محیط ہو جائے اور پھر بھی اس کے خاتمہ کے آثار ناپید ہوں۔

اُس رات

میں دیر تک اپنے دفتر میں مصروف رہا اور اپنے اخبار کے لیے آٹھ بازاروں کے شہر کی سیاسی سرگرمیوں کی رپورٹ تیار کرتا رہا۔ میں اُن دنوں کے لائل پور اور آج کے فیصل آباد میں کراچی کے ایک قومی روزنامہ کی نمائندگی کے فرائض انجام دیتا تھا اور اس اخبار کے لائل پور آفس کا انچارج تھا۔ صحافت بڑا جان لیوا پیشہ ہے بشرطیکہ اسے فرض شناسی سے پورا کیا جائے۔ اُن دنوں قومی اتحاد کی تحریک کے باعث اور اس کے بعد حکومت اور حزبِ مخالف کے مذاکرات تعطل پھر مذاکرات وغیرہ سے پیدا شدہ ہیجان و بحران کی وجہ سے میری مصروفیات میں دن رات کی شناخت غائب ہو گئی تھی۔ دِن بھر میں مختلف سیاستدانوں کے انٹرویوز لیتا اور پھر رات گئے تک ان انٹرویوز کی بُنیاد پر اپنی سیاسی رپورٹ تیار کر کے اخبار کو بھجواتا۔

میرا آفس کچہری بازار کی ایک بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر واقع تھا۔ آفس ایئر کنڈیشنڈ اور انتہائی پُرسکون تھا لہٰذا جب کام کرتے کرتے میری آنکھوں میں نیند اُتر آئی تو میں نے گھر جانے کے بجائے وہیں آفس میں سو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سونے سے پہلے میں نے سوچا ٹیلی فون کر کے گھر میں اطلاع کر دوں۔ پھر خیال آیا کہ گھر والوں کی نیند میں خلل ڈالنے سے بہتر ہے کہ گھر نہ پہنچنے کی اطلاع کئے بغیر سو جاؤں۔ اس وقت نیند کی دیوی اپنے پر پھیلائے نہایت سرعت کے ساتھ میری طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ میں نے صوفے پر پاؤں پسارے ہی تھے کہ نیند نے مجھے آن

دبوچا، میں ابھی سویا ہی تھا کہ دفعتاً فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ گھنٹی بجتی رہی۔ میرے ذہن پر چونکہ غنودگی طاری تھی اس لیے میں کئی لمحے کوشش کے باوجود اپنا ہاتھ ٹیلیفون سیٹ کی طرف نہ بڑھا سکا۔ میرے حواس بیدار ہو چکے تھے مگر جسم پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ میرے اُٹھ کر بیٹھنے تک ٹیلیفون کی گھنٹی بند ہو گئی۔ میں چند لمحے زیرو پاور کے بلب کی سبز روشنی میں ہونقوں کی طرح ٹیلیفون سیٹ کو گھورتا رہا، پھر اچانک میری نظر سامنے کی دیوار پر نصب کلاک پر جا پڑی۔ کلاک پر چھ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں نے کم و بیش چار گھنٹے سو لیا تھا۔ جب دوبارہ ٹیلیفون کی گھنٹی نہیں بجی تو میں نے بے چینی سی محسوس کی۔ علی الصبح یہ ٹیلیفون کس کا ہو سکتا تھا؟ آفس میں سونا میرا معمول نہیں تھا۔ کبھی کبھار جب مجھے رات گئے تک لکھنا ہوتا تو میں آفس میں بیٹھا رہتا تھا تاہم اپنی بیوی کو اپنے دیر سے گھر آنے کی اطلاع دے دیتا تھا میں رات دو بجے تک بھی گھر سے باہر رہ لیتا تھا اور چونکہ گھر میں داخلے کے لیے عقبی دروازے کے باہر کی طرف لگے ہوئے تالے کی چابی ہر وقت میری جیب میں رہتی تھی اس لیے رات کو میں کتنی بھی دیر سے جاتا صبح کو اپنے بستر پر ملتا تھا۔ صبح جب میری بیوی نے مجھے بستر پر نہیں پایا ہو گا تو وہ یقیناً پریشان ہو گئی ہو گی اور یہ ٹیلیفون یقیناً اُسی نے کیا ہو گا۔ اب میں بیدار تو ہو ہی چکا تھا، سوچا گھر چلا جاؤں ــ پھر خیال آیا کہ مجھے کراچی کی فلائٹ سے اخبار کو پیکٹ بھجوانا ہے لہٰذا آٹھ بجے تک اپنے چپڑاسی کی آمد کا انتظار کر لوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے ٹیلیفون پر گھر میں اپنی دفتر میں موجودگی کی اطلاع کر دینی چاہیے۔ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا اور ابھی ڈائل گھمانے ہی والا تھا کہ ایک مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی:

"فوج نے ٹیک اوور کر لیا ہے، میری چھٹی منسوخ کر دی گئی ہے اور میں ....."

"مگر میں اکیلی یہ سب کیسے کروں گی، کمبخت مارشل لا کو بھی آج ہی لگنا تھا۔" دوسری طرف کوئی خاتون بول رہی تھی۔ وہ لوگ کون تھے اور یہ کیسی گفتگو تھی۔ میں نے ثانیہ بھر کو غیر حاضر دماغی کیفیت میں ریسیور کان سے لگائے رکھا اور پھر اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"تو کیا فوج نے بھٹو کے اقتدار کا تختہ اُلٹ دیا ہے؟"

میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا اور پھر میری سوچوں کے اُفق پر روشنی کی لکیر سی پھیلتی چلی گئی۔ میں نے ٹیلیفون کے ریسیور کو ایک مرتبہ پھر کان سے لگایا۔ اس اُمید پر کہ گفتگو ابھی جاری ہو گی مگر دونوں اجنبی آوازیں اب معدوم ہو چکی تھیں میں نے ریسیور رکھا اور اضطراری حالت میں آفس سے باہر نکل آیا۔ میں حقائق جاننا چاہتا تھا۔ میری سماعت نے جو کچھ اچانک سُنا تھا اس کی تصدیق یا تردید کا خواہاں تھا مگر صبح ۶ بجے اس بلڈنگ میں تو کوئی ایسا فرد بھی نہ تھا جس سے میں اپنے اضطراب اور بے چینی کی بات ہی کر سکوں، چند لمحے آفس کے دروازہ پر کھڑا ہو کر میں سوچتا رہا۔ ایک عجیب سی حالت و کیفیت مجھ پر طاری تھی ــ ایک سیمابی کیفیت، جیسے کسی پہلو قرار نہیں ہوتا یہ رنج کا عالم تھا یا کرب کا کوئی انداز ـــ؟

میں صحافی تھا، سیاسی مبصر تھا اور میرے لئے حالات کی تہہ تک پہنچنا لازمی تھا، مگر یہ کیسے ممکن ہو؟

۷ مارچ کو قومی اسمبلی کے انتخابات میں جو کچھ ہوا تھا میں اس کا چشم دید گواہ تھا اِن انتخابات میں ضلع لائل پور (موجودہ ضلع فیصل آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ) سے قومی اسمبلی کی ۱۹ نشستوں میں سے صرف ایک پاکستان قومی اتحاد کے حصہ میں آئی تھی۔ اِس نشست پر میاں زاہد سرفراز کامیاب ہوئے تھے۔ ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بلاشبہ یک طرفہ تھے، قومی اتحاد نے ان کا بائیکاٹ کیا تھا اور انتخابات میں دھاندلی کے خلاف ایک زوردار تحریک شروع کی تھی جسے بعد میں تحریکِ نظامِ مصطفےٰ کا نام دے دیا گیا تھا۔

"نظامِ مصطفےٰ" کے لیے عوام نے اس تحریک میں جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے اور بالآخر حکومت اس تند و تیز تحریک کے مقابل بھکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں سے دوبارہ انتخابات کرانے کے لیے مذاکرات کا آغاز ہو چکا تھا، عام خیال یہ تھا کہ حکومت و حزبِ مخالف میں سمجھوتہ ہو جائے گا اور منصفانہ و غیر جانبدارانہ انتخابات کے لیے لائحہ عمل طے کر لیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی آئے دن کے تعطل، نئی شرائط، اقرار و انکار وغیرہ نے گومگو کی ایک عجیب سی فضا پیدا کر دی تھی، کوئی دو ٹوک اور یقینی بات سامنے نہیں آ رہی تھی۔ البتہ ۴ جولائی کو یہ افواہ عام تھی کہ مذاکرات کے نتیجہ میں از سرِ نو انتخابات کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ سمجھوتے کا اعلان کسی بھی وقت متوقع تھا۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ صرف دستخطوں کا مرحلہ رہ گیا ہے یا پھر کچھ تکنیکی طرز کی جزئیات طے ہو رہی ہیں، اصولی معاملات بہر حال طے پا گئے ہیں۔ ان حالات میں فوج کے ٹیک اوور کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ کیونکہ مارشل لاء کا نفاذ اگر ناگزیر ہوتا تو وہ بہت پہلے اُن دنوں لگ چکا ہوتا جب سڑکوں پر خونریزی ہو رہی تھی اور املاک کو لوٹا جا رہا تھا یا آگ لگائی جا رہی تھی۔ لوگ اس دن نئے انتخابات کا اعلان سننے کے منتظر تھے۔ مگر رات گئے تک وہ اعلان نہ ہوا اور اسی رات فوج نے آگے بڑھ کر برق رفتاری سے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

ابتداء میں خود مجھے یہ خیال آیا کہ شاید ذوالفقار علی بھٹو نے خود ہی اقتدار فوج کے حوالے کر دیا ہو، جیسا کہ ایوب خان نے یحییٰ خان کو منتقل کر دیا تھا اور پھر جیسا کہ خود بھٹو کو یحییٰ خان نے سونپا تھا۔ ماضی کے یہ تجربات و مشاہدات اِس قیاس آرائی کو تقویت دیتے تھے کہ فوج کے حکومت سنبھالنے کا معاملہ باہمی رضامندی سے طے پایا ہے اس کے باوجود یہ محض ایک قیاس اور مفروضہ تھا اور میں حقیقت جاننے کے لیے بے چین و مضطرب تھا اور چاہتا تھا کہ کسی باخبر سیاست دان سے اس اجنبی ٹیلیفون کال کے "مکالمے" کی تائید یا تردید ہو جائے، میں نے میاں زاہد سرفراز کے گھر ٹیلیفون کیا۔ میاں صاحب گھر پر نہیں ملے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے احمد سعید اعوان کو ٹیلی فون کیا وہ بھی اپنے گھر پر نہ ملے۔ بیگم نرگس نعیم ان دنوں پیپلز پارٹی کی سرکردہ لیڈر تھیں میں نے ان کے نمبر ملائے۔ دوسری طرف سے خود بیگم نرگس نعیم نے ریسیور اٹھایا۔

میں نے پوچھا "بیگم صاحبہ! سنا ہے فوج نے ....."

"ٹیک اوور کر لیا ہے، یہ صحیح ہے۔ میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں" بیگم نرگس نعیم نے اپنے مخصوص مردانہ انداز تخاطب میں کہا۔

"مگر فوج ایسا کیونکر کر سکتی تھی؟" میں نے استفسار کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ سب پرائم منسٹر صاحب (بھٹو) کی کوئی اپنی منصوبہ بندی ہے۔ جنرل شریف اور جنرل ضیاء الحق دونوں ہی اُن (بھٹو) کے اعتماد کے آدمی ہیں۔ پرائم منسٹر نے ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے یہی مناسب سمجھا ہوگا۔"

بیگم نرگس نعیم صاحبہ سے مارشل لاء کے نافذ ہو جانے کی تصدیق پا کر میں چند لمحے سوچتا رہا کہ کیا وزیراعظم بھٹو خود فوج کو ٹیک اوور کی اجازت دے سکتے تھے۔ میرے ذہن نے اس تصویر کی تسلیم نہیں کیا۔ میں دانشور طبقے کے تبصرے سننے کے لیے بار روم کی طرف چلا گیا۔ وکلاء کی اکثریت مختلف ٹولیوں میں مارشل لاء کے نفاذ پر انتہائی پُرجوش تبصرے کر رہی تھی۔ کسی نے کہا چیف آف آرمی سٹاف ذوالفقار علی بھٹو کا اپنا آدمی ہے وہ مارشل لاء نہیں لگا سکتا یقیناً یہ کسی کور کمانڈر کا کارنامہ ہوگا۔ قومی اتحاد سے تعلق رکھنے والے ایک سرکردہ وکیل نے کہا "جنرل چشتی میرا دوست ہے اور میں جانتا ہوں یہ کام جنرل چشتی کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔"

"ہاں! یہ ممکن ہے، چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق تو ویسے بھی سنا ہے ارائیں ہے اور کوئی ارائیں زادہ اس قسم کی جرأت نہیں کر سکتا۔" یہ راجپوت برادری کے ایک دانش ور کا تبصرہ تھا۔

تب اس نوجوان نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، ارائیں زادے کو آرائیں زادہ ہی مٹا سکتا تھا۔ یہ مارشل لاء جنرل ضیاء الحق نے ہی لگایا ہے۔ مارشل لاء کے نفاذ کا مجھے پہلے سے علم تھا۔" اس نوجوان کا تعلق تحریک استقلال سے بتایا گیا تھا۔ وہ جاوید ہاشمی کے دوستوں میں سے تھا اور شاہی قلعے میں رہ چکا تھا۔ اس وقت اس نوجوان کی بات پر میں نے بہت زیادہ توجہ نہیں دی مگر اسی روز شام کو جب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر جنرل محمد ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کیا تو میں نے سوچا اس نوجوان کی بات بے وزن نہیں تھی۔ یہ نوجوان سیاستدان سینیٹر طارق چوہدری تھے۔

جنرل ضیاء الحق نے اس سب سے پہلی نشری تقریر میں قوم کو یقین دلایا کہ ان کے اور مسلح افواج کے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں۔ ان کی تقریر کے چند مندرجات یہ تھے:

"میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں اور نہ ہی مسلح افواج اپنے پیشہ سپہ گری سے ہٹنا چاہتی ہیں۔ میرا ایک ہی مقصد ہے کہ میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کراؤں جو اس سال اکتوبر میں ہوں گے۔"

انتخابات کے فوراً بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے گا۔ میں آپ سب سے پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس پروگرام سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اگلے تین ماہ کے دوران میری ساری توجہ انتخابات کروانے پر ہوگی اور میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہونے کے ناطے اپنے اختیارات اور کاوشیں کسی اور چیز پر مرتکز نہیں کروں گا۔"

"میں اس وقت یہ ذکر کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا کہ میں ملک کی عدلیہ کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں اور میں پوری کوشش کروں گا کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے عدلیہ کے اختیارات محدود ہونے کا خدشہ ہو۔"

اس تقریر کے ساتھ میرے ذہن میں ماضی قریب کے ہنگامہ خیز اور معرکہ آرا حالات و واقعات تیزی سے گھومنے لگے۔ سب سے پہلے تو اس خونریزی اور افراتفری کا خیال آیا جو نظامِ مصطفیٰ کے نام سے برپا ہونے والی تحریک کے نتیجہ میں ملک بھر میں پائی جاتی تھی۔ پھر قومی اسمبلی اور راجہ بازار میں ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے امریکی وزیر و سفیر کے خطوط لہرانے کا منظر ذہن میں ابھرا اور ان کا وہ عجیب و غریب فقرہ یاد آیا کہ "ہاتھی میرا دشمن ہے" یہ عین تحریک کے دنوں کے واقعات تھے جن سے بھٹو صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کے خلاف تحریک کی پشت پر امریکہ موجود ہے، وہ امریکہ کا نام لئے بغیر، عوام کو باور کرانا چاہتے تھے کہ ایک بڑی طاقت، بوجوہ ان کی دشمن ہو گئی ہے، ظاہر ہے کہ امریکہ جیسی سپر طاقت کا نام نہ لینے میں بھٹو صاحب "ڈپلومیسی" اور خارجہ پالیسی کے نازک پہلوؤں کو ملحوظ رکھ رہے تھے ورنہ کون نہیں جانتا تھا کہ صرف چند ماہ پہلے امریکہ کے یہودی نژاد وزیر خارجہ مسٹر ہنری کسنجر نے جب پاکستان کا دورہ صرف اس مقصد کے لیے کیا تھا کہ پاکستان کو فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے سے باز رکھا جائے تو بھٹو نے اس مسئلہ پر سخت موقف اختیار کر کے کسنجر کو سیخ پا کر دیا تھا اور ہنری کسنجر نے بھٹو کو "حشر کر دینے" کی دھمکی دی تھی جو بڑی سج دھج کے ساتھ اخبارات کی زینت بنی تھی۔ اُس وقت اس یہودی نژاد وزیر خارجہ نے سفارتی آداب کو بھی ملحوظ نہیں رکھا تھا اور حد یہ کہ بعد میں بھی اس دھمکی پر کسی معذرت کا اظہار نہیں کیا گیا۔ بہرحال اس یہودی نژاد امریکی وزیر کی اس دھمکی کے بعد، ذوالفقار علی بھٹو نے عام انتخابات کا اعلان کیا، ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے چند سالہ دورِ اقتدار میں ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ سمیت جو کارنامے انجام دے چکے ہیں خصوصاً لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد ـــ وہ ان کے الیکشن جیتنے کے لیے اچھی بنیاد ہیں۔ تاہم مسٹر بھٹو جیسا زیرک سیاستدان اس امر کو فراموش کر گیا کہ حکومت میں آ کر انہوں نے بعض انتہائی با اثر اور طاقتور طبقوں کو اپنا دشمن بھی بنا لیا ہے۔ انہوں نے بنکوں، انشورنس کمپنیوں، ملوں اور حتیٰ کہ رائس فیکٹریوں اور سکولوں تک کو نیشنلائز کر کے مالکان کے گروپ کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ بیشک اس نیشنلائزیشن سے بنیادی طور پر صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں کو فائدہ پہنچا تھا کیونکہ

انہیں معاوضہ کی شکل میں اچھی خاصی خطیر رقمیں مل گئی تھیں۔ تاہم ان اقدامات سے دوسرے مالکان خوف زدہ بھی ہوئے تھے اور یہ بوکھلایا ہوا مالک طبقہ، شعوری یا لاشعوری طور پر بھٹو دشمنی میں بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس کے لیے بھٹو صرف سیاست کا نام نہیں تھا بلکہ دین و ایمان کا مسئلہ بن گیا تھا۔

بھٹو نے صرف مالکان میں اپنے مخالف پیدا نہیں کئے بلکہ بیوروکریسی اور خصوصاً عدلیہ میں بھی من مانی کر کے مؤثر عناصر کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ مثال کے طور پر جے اے رحیم سے پرائم منسٹر ہاؤس میں جو سلوک ہوا لوگوں کو اس کی خبر ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب اپنے مزاج کے خلاف بات سننے کے بھی روادار نہ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی میں جتنے لوگ کامیاب ہو کر اسمبلیوں اور وزارتوں تک پہنچے ہیں وہ سب ان کی مقناطیس شخصیت کا کرشمہ ہے، وہ مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا بنا دیتے ہیں۔ بیشک یہ بات بھٹو صاحب کی غلط فہمی نہیں بلکہ امر واقعی تھا کہ انہوں نے معمولی دکانداروں کو اُٹھا کر پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا دیا اور مسجد کے ایک عام سے امام یا خطیب کو مرکزی وزیر کی حیثیت دی۔ یہ سب درست سہی لیکن بھٹو صاحب جس انداز میں اس کا اظہار کرنے لگے تھے ظاہر ہے کہ وہ ناپسندیدہ تھا۔ چنانچہ جے اے رحیم کو تھپڑ مارنے، مولانا کوثر نیازی کو 'لوٹا' کہہ کر پکارنے اور ایسے دوسرے خفت آمیز ریمارکس لوگوں تک بھی پہنچے اور بہت سے سنجیدہ حلقے بھی اس کی مخالفت پر مجبور ہوئے جبکہ ان کے اپنے دوست اور پارٹی کے ساتھی بھی اس روش سے نالاں ہو گئے۔

عدلیہ میں بھی انہوں نے بعض اصحاب کی ترقی و تنزلی میں ان کے سینئر، جونیئر ہونے کی کوئی پروا نہ کی۔ اس سے متاثرہ افراد میں لازماً نفرت اُبھری۔

اِس عمومی فضا میں جب پاکستان کے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی گونج اُبھری تو امریکہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت سامنے آئی۔ اس کے جواب میں ڈپلومیسی کو ملحوظ رکھے بغیر بھٹو صاحب نے اور زیادہ شدت سے پلانٹ کی حمایت کی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب عیسائی، کیمونسٹ، ہندو اور یہودی تہذیبوں کے پاس ایٹم بم موجود ہیں تو پھر مسلم تہذیب ہی اس سے محروم کیوں رہے؟

اس دلیل نے یا اس استفسار نے اسرائیل کو دہشت زدہ کر دیا۔ "اسلامی ایٹم بم" کے سامنے حقیر سے اسرائیل کی وقعت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اسرائیل کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اسلامی بم عربوں کے ہاتھ آسکتا ہے، چنانچہ اس خطرہ کی روک تھام کے لیے امریکہ کی یہودی لابی سرگرم ہو گئی۔ ادھر بھارت پہلے سے اس کا مخالف تھا اِس طرح امریکہ کو کئی طاقت ور عناصر ایسے مل گئے جو بھٹو کے دل و جان سے دشمن تھے۔

کہا جاتا ہے کہ فروری ۱۹۷۶ء میں بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے فرانس میں ایک معاہدہ طے پا چکا تھا اور اس معاہدہ کے تحت امریکہ نے بڑی فیاضی سے پاکستان کے بعض سیاسی عناصر کی مالی پشت پناہی کی اِن

دنوں یہ محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان میں غیر ملکی کرنسی کا سیلاب آگیا ہے۔ پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں ڈالر کی قیمت میں حیرت انگیز کمی واقع ہوئی۔ پھر پاکستانی کرنسی نوٹوں پر نعرے بھی درج ہونے لگے۔ یہ نعرے قومی اتحاد کے حق میں اور بھٹو کے خلاف ہوتے تھے۔ اس پر حکومت نے یہ اعلان کیا کہ ایسے نعروں کے حامل نوٹ غیر قانونی ہیں۔ اس اعلان کے باوجود ان نوٹوں کے سیلاب میں کوئی کمی نہ آئی جس سے بجا طور پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مخالفین کے پاس نوٹوں کی کوئی کمی نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ جیل جانے والے افراد کے اہل وعیال کے لیے جو شاندار وظائف مقرر کیے گئے وہ حیران کن تھے۔ جیل جانے والے، ملازمت سے اتنی رقم ماہانہ نہیں لے سکتے تھے جتنی وہ جیل جانے کے عوض وصول کرتے تھے۔

انتخابات کے اعلان سے امریکہ کی طرف جھکاؤ رکھنے والے سیاسی عناصر کا ایک ایسا عجیب و غریب اتحاد، وجود میں آیا جو آپس میں بعد المشرقین رکھتے تھے۔ کہاں خان عبدالولی خان اور کہاں مولانا طفیل محمد۔ مگر یہ سب ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے نظر آتے۔ اس کے بعد امریکہ نے ایک اور داؤ آزمایا، وہ بھٹو سے کچھ نہ منوا سکا تھا اس لئے اس کا تختہ اُلٹنے پر سارا زور لگا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقصد کے لئے اپوزیشن سے باقاعدہ سودا ہوا چنانچہ قومی اتحاد کو اپنے الیکشن کے اخراجات کے لئے بڑی بڑی رقوم نہ صرف بیرونِ ملک کے ذرائع سے ملیں بلکہ ملکی سرمایہ دار طبقہ سے بھی حاصل ہوگئیں۔ نیشنلائزیشن کے عمل سے ملکی سرمایہ داروں پر جو بوکھلاہٹ طاری تھی۔ اس کے تحت ان لوگوں نے اتحاد کی بڑھ چڑھ کر مدد کی۔ اس سلسلہ میں منو شہزاد، دین ٹیکسی والے، فضل دین اینڈ سنز وغیرہ کے ساتھ گوجرانوالہ کے تاجروں اور فیصل آباد کے صنعت کاروں کے نام بڑے نمایاں ہیں۔ اسی وجہ سے قومی اتحاد کی انتخابی مہم بڑی شان و شکوہ کی حامل رہی مرغے چرغے بھی اُڑے اور حلوہ کی دیگیں بھی۔ سرمائے کی چاروں طرف ریل پیل تھی۔

ان دنوں قومی اتحاد نے اپنی کامیابی کے بلند بانگ دعوے کئے۔ ان دعوؤں سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ قومی اتحاد الیکشن تو جیت چکا ہے اب تو صرف ایک رسم پوری کرنا ہے یا صرف نتیجے کا اعلان ہونا ہے۔ ایئر مارشل اصغر خاں اور دوسرے کئی رہنما صاف الفاظ میں کہہ رہے تھے کہ عوامی ریفرنڈم تو ہو چکا ہے اور ہم جیت گئے ہیں لیکن ان لوگوں کی خوش فہمیوں کے باوجود خود امریکہ جانتا تھا کہ انتخابات کے نتائج مشکوک ہیں اس لئے امریکہ نے اپنا منصوبہ بہت دُور تک اور بہت سوچ سمجھ کر تیار کیا تھا اور اس میں یہ پہلو شامل تھا کہ اگر اتحاد ناکام ہوتا ہے تو پھر دھاندلی کے الزام سے ایک زور دار تحریک چلا دی جائے اور یہی ہوا۔ ایجی ٹیشن شروع ہوگیا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلیج کے عرب ممالک سے پاکستانی کرنسی غائب ہوگئی کیونکہ وہ بھی پاکستان پہنچا دی گئی تھی۔ ڈالر بھی آئے اور ان کا مارکیٹ ریٹ گر گیا۔ بھٹو نے خاصا شور مچایا لیکن یہ معاملہ چلتا رہا۔

اب اسے "معاہدہ" "سودا" یا "سازش" جو چاہے کہہ لیجئے بہرحال اس کے تین فریق تھے۔

۱۔ امریکہ

۲۔ فوج (صرف چند جرنیل)

۳۔ قومی اتحاد (مگر تمام پارٹیاں نہیں)

چنانچہ سیاسی ایجی ٹیشن نے "نظامِ مصطفےٰ" کا نام لیا اور یہ بالآخر مارشل لاء بن کر آ گیا۔

یہ پس منظر تو ذہن میں موجود تھا لیکن حالات کی اس نئی کروٹ کو جاننے کے لئے ضروری تھا کہ براہِ راست اسلام آباد پہنچ کر احوال و کوائف سے آگاہ ہوا جائے۔ مذاکرات کرنے والوں سے مذاکرات ہوں اور واقعات کی تہہ تک پہنچا جائے۔ چنانچہ میں اگلے ہی روز اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ بیشتر رہنما تو حراست میں لیے جا چکے تھے تاہم ان کے نائبین سے بہت سی باتیں جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ بعدازاں میں اسلام آباد سے فیصل آباد کی بجائے لاہور شفٹ ہو گیا اور اس شہر زندہ دلاں میں اپنے صحافتی سلسلہ کا آغاز کیا تو مجھے ان تمام رہنماؤں سے براہِ راست گفتگو کے مواقع حاصل ہوئے جو بھٹو کے ساتھ مذاکرات کرتے رہے تھے۔ ان سے طویل، تاریخی اور انتہائی اہم انٹرویوز "موج ڈائجسٹ" میں مسلسل شائع ہوئے۔ ان رہنماؤں میں نوابزادہ نصراللہ خان، سردار عبدالقیوم، ائر مارشل اصغر خان، مولانا کوثر نیازی، پروفیسر عبدالغفور، عبدالحفیظ پیرزادہ، مولانا شاہ احمد نورانی، جنرل ٹکا خان، معراج محمد خان اور دوسرے اہم سیاستدانوں سے لے کر فوجی آپریشن کے نگران جنرل چشتی تک سب کے انٹرویوز شامل ہیں۔

○

تیسرا باب

اہم ترین اور نازک ترین مرحلے

مذاکرات جینیوا جرنیلوں کی شرکت اور اس پر اعتراضات

رہنماؤں کے تاخیری حربے اور جرنیلوں کی حالات پر اکرٹی نظم

Photo: Hoda Hozal

یکم جولائی ۔ مذاکرات کے ضمن میں اہم ترین اور نازک ترین دن ثابت ہوا ——

اس روز میٹنگ رُوم میں، خلافِ معمول ایک بڑی سکرین اور کچھ سلائیڈز لگے ہوئے تھے۔ اُن کے بارے میں اتحاد کے رہنماؤں نے بھٹو سے دریافت کیا "ہم یہاں کوئی فلم دیکھنے نہیں آئے۔ پھر یہ سب کیا ہے؟"

بھٹو نے بتایا "فوج کے جرنیل آپ حضرات کو فوجی نقطۂ نظر سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں" —— یعنی صرف تین چار دن پہلے تک بھٹو فوجی نقطۂ نظر سے خود بھی بے خبر تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس کا تختہ الٹنے کا منصوبہ تیار ہے۔ مفتی محمود نے اس پر اعتراض کیا اور کہا،

"سیاسی مذاکرات میں فوج کو شامل کرنا مناسب نہیں اگر وُہ، جرنیل، اتحاد کے رہنماؤں کے علم میں کوئی بات لانا ہی چاہتے ہیں، تو ان کے لئے مناسب طریقہ یہ تھا کہ وُہ، جرنیل، آپ، بھٹو، کے ذریعہ ہم تک اپنی بات پہنچا دیتے۔"

نواب زادہ نصراللہ خاں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا اور فوجی جرنیلوں کو سیاسی مذاکرات سے الگ رکھنے پر زور دیا۔

ان دونوں کے جواب میں بھٹو نے کمال معصومیت سے جواب دیا، "افواج کے اعلیٰ حکام کا اصرار ہے کہ وہ براہِ راست آپ حضرات کو اپنے فوجی نقطۂ نظر سے آگاہ کریں اور مزید یہ کہ اس مقصد کے لئے متعلقہ جرنیل صاحبان یہاں آچکے ہیں اور وہ ساتھ والے کمرہ میں موجود ہیں۔"

اس انکشاف پر پھر بحث شروع ہوگئی تاہم بھٹو کے مسلسل اصرار پر مفتی محمود اس شرط پر جرنیلوں کی بات سننے کو تیار ہوگئے کہ ——

"ہم اُن کا مؤقف سن لیں گے لیکن کسی کو سوال و جواب کی اجازت نہیں ہوگی، نہ ہم ان سے کوئی سوال کریں گے اور نہ وہ ہم سے ——"

۴۵ منٹ کی بحث و تمحیص کے بعد سوا گیارہ بجے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل شریف، آرمی کے سربراہ جنرل ضیاء الحق فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل ذوالفقار علی خاں اور بحریہ کے ایڈمرل محمد شریف کو میٹنگ رُوم میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔

سیاسی رہنماؤں سے علیک سلیک کے بعد جنرل ضیاء الحق نے ۰۰،۰۰۸ صفحات کے تحریری مقالہ کی مدد سے بریفنگ شروع کی جو پورے دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اس میں سب سے زیادہ وقت بلوچستان میں فوجی کارروائی پر صرف ہوا۔ اتحاد کے رہنما، چونکہ اس کارروائی کے مخالف اور فوج کی واپسی کے خواہاں تھے اس لئے انہیں بتایا گیا کہ اس دشوار گذار علاقہ سے فوج کی فوری واپسی ممکن نہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے کہا "میں صرف پیشہ ورانہ حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ ہمیں کچھ رکاوٹیں درپیش ہیں جن میں —— " اس کے بعد انہوں نے بڑی تفصیل سے حالات کا پس منظر بتایا اور کہا " بلوچستان میں اب حالات بظاہر تو معمول پر ہیں مگر ہمسایہ ملک میں لوگوں کو فوجی تربیت دی جا رہی ہے۔ علیحدگی کی تحریکیں پرورش پا رہی ہیں —— "

وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے کہ نواب زادہ نصر اللہ خاں نے انہیں ٹوکا "آپ سیاسی باتوں سے باز رہیں۔ صرف تکنیکی پہلو بیان کریں۔" اس پر جنرل شریف نے اصرار کیا "آپ پوری بات سن لیں، اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بات سیاسی نہیں پیشہ ورانہ ہے۔" اس کے بعد نواب زادہ نصر اللہ خاں خاموش ہو گئے تو جنرل ضیاء نے کہنا شروع کیا " بلوچستان کا اصل مسئلہ سیاسی، سماجی اور معاشی ہے۔ فوج وہاں لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی تھی اور اب فوج اس صوبہ میں ترقیاتی کام انجام دے رہی ہے۔ اس کی واپسی کے لئے اور اس ترقیاتی کام کی تکمیل کے لئے ہمیں وقت درکار ہے۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ بھٹو خود تو فوج واپس بلانے کو تیار ہو گیا تھا مگر جرنیل اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت جون کے مہینہ میں بعض شہروں سے مارشل لاء ہٹانے کے ضمن میں پیدا ہوئی تھی، جس پر بھٹو نے کہا تھا کہ مارشل لاء جزوی طور پر ہٹایا جا رہا ہے۔ بعد ازاں انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو طلب کر کے ان سے وضاحت کرائی۔ جنرل ضیاء نے مارشل لاء کے مکمل طور پر ہٹانے میں کچھ دشواریوں کی نشان دہی کی تھی —— یہی صورتِ حال بلوچستان سے فوج کی واپسی کے سلسلے میں تھی۔ بھٹو فوجی کارروائی ختم کرنے کے لئے تیار تھا مگر جرنیلوں کی اپنی کچھ مشکلات تھیں (یہاں اس پر بحث مقصود نہیں کہ کیا مشکلات تھیں یا بعض جرنیلوں کی خود ساختہ اور من گھڑت مشکلات تھیں)، بہر حال بھٹو کی یہ ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی کہ وہ جرنیلوں کو سیاسی معاملات میں لائے چلے جا رہے تھے۔ ۳۱ مئی کو پرائم منسٹر ہاؤس میں بھی انہوں نے فوجی جرنیلوں کا اجلاس طلب کیا تھا جس میں جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے چیئرمین جنرل شریف، آرمی کے چیف آف سٹاف جنرل ضیاء الحق، فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل ذوالفقار علی خاں اور بحریہ کے ایڈمرل شریف شامل ہوئے تھے —— بھٹو جیسے سیاستدان کا یہ رویہ خاصا ناقابلِ فہم تھا کہ وہ جرنیلوں کے ساتھ سیاست کر رہے تھے۔ بالآخر جرنیلوں نے ان سے سیاست کر ڈالی۔

یکم جولائی کے اس اجلاس میں جنرل ضیاء الحق نے حیدر آباد کیس کے بارے میں کہا "خصوصی عدالت ختم کر کے اسیروں کی رہائی کے لئے قومی اتحاد کا مطالبہ نامناسب ہے۔" (خیال رہے کہ حیدر آباد کیس میں خان عبدالولی خاں اور دوسرے لوگ گرفتار کئے گئے تھے)۔ آزاد کشمیر کو معاہدہ کا جزو بنانے کے سلسلے میں انہوں نے کہا "اس سے کشمیر کے بارے میں پاکستان کا موقف متاثر ہوگا۔" نگران کونسل کے بارے میں انہوں نے کہا "اتحاد کا یہ مطالبہ کہ فوج کو بھی اس کونسل کے ماتحت کر دیا جائے نامناسب ہے۔"

مفتی محمود نے ان چاروں امور پر قومی اتحاد کا موقف واضح کیا۔ انہوں نے کہا " بلوچستان میں فوج کی بیرکوں میں واپسی کے لئے مناسب

وقت مقرر کر دیا جائے ـــــ حیدر آباد کیس کے سلسلے میں اتحاد ملک کے وسیع تر مفاد کے تحت پہلے ہی خصوصی عدالت کے خاتمہ اور اسیروں کی رہائی کا مطالبہ واپس لے چکا ہے۔ آزاد کشمیر کو بھی اس معاہدہ کا جزو نہ بنانے پر اپنی آمادگی کا اظہار کر چکا ہے لیکن اس سلسلہ میں حکومت اور مسلم کانفرنس کے درمیان کوئی علیحدہ معاہدہ ہو جانا چاہیئے اور آخر میں یہ کہ نگران کونسل کے قیام میں کوئی ایسی شق شامل نہیں جس کے تحت فوج کو کونسل کا ماتحت بنانا تجویز کیا گیا ہو ـــــ "

اس کے بعد جرنیل تو چلے گئے تاہم مفتی محمود اس مخمصہ میں پڑ گئے کہ جرنیلوں کو یہ اطلاعات کس ذریعہ سے حاصل ہوئیں جو حقیقت پر مبنی نہیں تھیں بلکہ سراسر جھوٹ تھیں اور مزید یہ کہ مذاکرات کے اس نازک مرحلہ میں جرنیلوں نے قومی اتحاد والوں سے خود بات کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ کیونکہ اگر انہیں کوئی غلط فہمی ہی تھی تو وہ قومی اتحاد کا ترمیمی مسودہ دیکھ کر حکومت کے ذریعے اپنا اطمینان کر سکتے تھے۔

بے چارے مفتی محمود اس امر سے بے خبر تھے کہ جس اتحاد کے وہ سربراہ ہیں اس کے بعض عناصر اُس معاہدہ، سودا یا سازش میں شریک تھے جس کے عناصرِ ترکیبی اتحاد کے علاوہ امریکہ اور فوج پر مشتمل تھے۔ وہ اپنی "سادگی" سے جرنیلوں کی شرکت پر تعجب کرتے رہے مگر اس اقدام سے یہ امر ضرور واضح ہو گیا کہ فوج ملک کے حالات کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لے رہی ہے ـــــ !

اُس رات، مذاکرات کی اہم ترین اور طویل ترین نشست ہوئی جو رات ۸ بجے سے صبح ۶ بجے تک جاری رہی۔ دس گھنٹے کے اس طویل اجلاس میں ایک ایک نکتہ پر بحث ہوتی رہی اور قریب قریب تمام اہم امور پر اتفاقِ رائے بھی ہو گیا۔ اسمبلیاں توڑنے کی تاریخ ۱۵ جولائی مے پا گئی اور نئے انتخابات کے لئے قومی سطح پر ۷ اکتوبر اور صوبائی سطح پر ۸ اکتوبر کی تاریخیں بھی مقرر ہو گئیں۔ معاہدہ پر عمل درآمد کے لئے کونسل کی تشکیل کا مسئلہ خاصا پیچیدہ تھا، اس پر انتہائی اختلافات تھے۔ اس کے باوجود اُسے بھی طے کر لیا گیا۔ مزید برآں ہنگامی حالت کا خاتمہ، قیدیوں کی رہائی اور دُوسرے اہم امور بھی طے پا گئے۔

بھٹو صاحب بعض معمولی تبدیلیوں کے خواہاں تھے جن کی حیثیت صرف لفظی اور علامتی اہم تھی۔ اتحاد کے رہنماؤں نے اُن سے کہا کہ وہ ترامیم پر اصرار نہ کریں اور ترمیمی مسودہ کو جُوں کا تُوں تسلیم کر لیں۔ کیونکہ مفتی محمود کو دستخط کرنے کا اختیار صرف اِس صُورت میں دیا گیا ہے جبکہ مسودہ کو من و عن تسلیم کر لیا جائے۔ اس میں اگر کوئی ترمیم یا تبدیلی ہوئی تو معاملہ پھر سے اتحاد کی مرکزی کونسل میں لے جانا ہوگا۔ جہاں ترمیم کی مخالفت ہوگی اور از سرِ نَو ایک اور تعطل اور بحران سامنے آجائے گا جو مارشل لاء کا موجب بن سکتا ہے۔

ذُوالفقار علی بھٹو نے بھی مارشل لاء کے اندیشہ کو رد نہیں کیا لیکن وہ مسودہ من و عن شکل میں دستخط کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ صبح ۶ بجے اتحاد کے رہنما پرائم منسٹر ہاؤس سے نکلے تو اخباری نمائندے ان کے منتظر تھے۔ ان لوگوں نے سیاسی لوگوں کی طرح خود بھی پوری رات جاگ کر گزاری تھی اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ معاہدہ ہوا یا نہیں؟

پیپلز پارٹی کی طرف سے مولانا کوثر نیازی اور اتحاد کی طرف سے پروفیسر غفور نے پریس کو بتایا کہ تمام اختلافی امور پر اتفاقِ رائے ہو گیا ہے۔ اب معاہدہ کی توثیق، اتحاد کی مرکزی کونسل سے کرانا باقی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسودہ میں چند معمولی ترامیم ہوئی ہیں۔

اتحاد کے رہنماؤں کا خیال تھا کہ جب اُن کے تمام بنیادی مطالبات تسلیم کر لئے گئے ہیں تو مرکزی کونسل کو چند معمولی ترامیم قبول کرنے میں

کوئی تامل یا تذبذب نہیں ہوگا اور انہیں آسانی سے منظور کرالیا جائے گا۔ مگر جب مرکزی کونسل کا اجلاس شروع ہوا تو یہ معاملہ پھر نازک صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ترامیم پر غور سے پہلے ہی کونسل نے مذاکراتی ٹیم کا محاسبہ شروع کر دیا کہ اس ٹیم نے اپنی حدود اور اختیارات سے تجاوز کیا ہے' ٹیم کو صرف یہ اختیار تھا کہ وہ ترمیمی مسودہ پر دستخط کرائے۔ اس مسودہ پر اس ٹیم کو ترامیم وصول کرنے' اُن پر بات چیت کرنے اور اپنی رائے دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔

مفتی محمود :۔ ہم نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ ہم جن ترامیم کو غیر اہم سمجھ کر قبول کر رہے ہیں' وہ مرکزی کونسل کی منظوری پر موقوف ہیں۔

اصغر خاں :۔ ۱۵ ارکان کو بھی آپ لوگوں نے یہ تاثر دیا تھا کہ معاہدہ ہو گیا ہے۔ صرف دستخط باقی ہیں' اب پھر یہی تاثر دیا گیا ہے۔

مفتی محمود :۔ ریڈیو اور ٹی وی نے یہی خبر دی ہے کہ معاہدہ کی منظوری مرکزی کونسل پر موقوف ہے۔

بیگم نسیم ولی خاں :۔ ہمارے ڈرافٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہونا چاہیئے تھی۔ مذاکراتی ٹیم کو صرف وضاحت کرنے کا اختیار تھا۔

اتحاد کے وہ رہنما جو معاہدہ کے حق میں نہیں تھے' اُن کا رویہ سخت اور خود اپنی مذاکراتی ٹیم کے خلاف جارحانہ تھا۔ وہ اس ٹیم سے برہم تھے جو معمولی ترامیم لے آئی تھی جبکہ ٹیم کے ارکان کا خیال تھا کہ اِن معمولی ترامیم کو آزادانہ انتخابات کے نقطۂ نظر سے پرکھا جائے گا ـــــ لیکن آزادانہ انتخابات تو ان "عقابوں" کا منشاء ہی نہ تھے۔ وہ تو مارشل لاء لانے پر تلے ہوئے تھے' جیسا کہ اصغر خاں اور بیگم نسیم ولی کے رویہ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مذاکراتی ٹیم کو ترامیم پر گفتگو کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں تھا اور یہ کہ معاہدہ ہو جانے کا امکان ظاہر کر کے انہوں نے اتحاد کی دوسری جماعتوں کی پوزیشن کو مجروح کیا ہے۔

تاہم کونسل میں اکثریت اِس خیال کی حامی تھی کہ معاہدہ کو قابلِ عمل بنانا ملکی مفاد میں ہے اور ترامیم پر بات کر کے ٹیم نے اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

تند و تیز حملوں اور جملوں کے بعد بالآخر ترامیم کا جائزہ لینے کا فیصلہ ہوا اور یہ طے کیا گیا کہ قانونی ماہرین سے اِن ترامیم پر رائے لی جائے چنانچہ اجلاس دوسرے دن پر ملتوی ہو گیا۔

دوسرے روز سوا گیارہ بجے اجلاس شروع ہوا تو میاں محمود علی قصوری نے قانونی نکات پر رائے دی اور کہا کہ پیراگراف نمبر ۲ اور نمبر ۴ کے حذف ہونے کے باعث' آئندہ کسی شق پر اختلاف ہوا تو ہمارا کیس کمزور ہو گا۔ اسی طرح پیراگراف نمبر ایک میں لفظی تبدیلی نامناسب ہے۔ چونکہ بھٹو اس معاہدہ کو آئینی حیثیت دینے پر آمادہ نہیں' اس لئے ہمیں اصرار کرنا چاہیئے کہ اسے آئین کا حصہ بنایا جائے۔

خالد اسحٰق کی رائے تھی کہ بیشتر ترامیم کے ساتھ معاہدہ قابلِ قبول ہے البتہ اسے آئینی تحفظ فراہم کرنے کی بات ہو جانا چاہیئے۔

دوسری نشست میں ایئر مارشل اصغر خاں نے کہا کہ بنیادی امور پر حکومت سے اختلاف تو نہیں ہے مگر حکومت کی نیت ٹھیک نہیں اس لئے ہمیں معمول سے زیادہ تحفظات کی ضرورت ہے۔ بھٹو خود معاہدہ میں دانستہ تاخیر کر رہا ہے۔ اِس لئے ایک اور مسودہ تیار کر لیا جائے۔ اِس سے مذاکراتی ٹیم کا کام اگرچہ مشکل ہو جائے گا' مگر حکومت پر دباؤ برقرار رہے گا۔

سردار عبدالقیوم :۔ اب کسی نئے مسودہ کی ضرورت نہیں۔ صرف کچھ نکات دے دیئے جائیں ٹیم کے ارکان وکلاء کو بھی اپنے ساتھ لے

جائیں تاکہ اُن سے وہیں مشورہ کیا جاسکے اور وہیں فیصلہ ہوجائے۔

نصراللہ خاں :۔ مسودہ میں تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ مذاکرات میں یہ کبھی ممکن نہیں ہوتا کہ کسی فریق کا مسودہ من وعن قبول کرلیا جائے۔ کسی فریق کا مسودہ اتنا قطعی اور حتمی نہیں ہوتا کہ اُسے 'حرفِ آخر' کہا جائے اور اس میں سرے سے کسی تبدیلی کو ناقابلِ قبول قرار دیا جائے۔ اگر مذاکرات ہوتے ہیں تو پھر تبدیلیاں اور ترامیم بھی ہوتی ہیں۔ ہم اگر قوم کو مزید کسی آزمائش سے بچا سکتے ہیں تو ضرور بچانا چاہیئے۔ لوگوں نے اِن مذاکرات کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگی ہیں، راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ سمجھوتہ کی خبر سے لوگوں کو اطمینان ہوا ہے۔ بنیادی امور مان لئے گئے ہیں البتہ آئینی تحفظ کی بات کرلی جائے۔

سردار شیر باز مزاری :۔ ہم بلاسٹ کیسوں میں ہمیں اپنے مؤقف پر اصرار کرنا چاہیئے کیونکہ بھٹو کی نیت درست نہیں ـــــ مزید بات چیت کے لئے نکات بھی تیار کرلئے جائیں پھر انہیں قانونی زبان میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی :۔ ہم نے مذاکرات کا دروازہ پھر سے کھول دیا ہے یہ ہم سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ ہمیں صرف یہ مؤقف اختیار کرنا چاہیئے تھا کہ "قبول کرو یا رد کرو ـــــ" ترامیم چہ معنی ؟

"اَب حالات کی اصلاح صرف اسی صورت ممکن ہے کہ ہم اپنے مسودہ کو حتمی قرار دیں۔ مسودہ کو قطعی ہونے کی نظر سے دیکھا جائے۔ ہمیں لوگوں کو یہ بھی بتانا ہے کہ ہم نے غاصب سے قوم کے لئے کیا حاصل کیا ہے ؟ ہمارا اصل مقصد بھٹو کے اختیارات کو محدود کرنا ہے، اس لئے جیتی ہوئی جنگ کو اَب ہارا نہ جائے۔ سپریم کونسل کو آئینی تحفظ حاصل ہونا ضروری ہے تاکہ بھٹو اس سے منحرف نہ ہوسکے۔ آزاد کشمیر کے سلسلے میں بھی ہم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اس لئے ساتھ ہی اس بارے میں بھی معاہدہ طے پانا چاہیئے۔"

میاں طفیل محمد :۔ "ہم لبِ بام پہنچ چکے ہیں، اَب کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی غلطی سے ہم خود پھر زمین پر آگریں۔ ہمیں ہوش مندی سے کام لے کر چھت پر پہنچ جانا چاہیئے۔ مسودے کا ۸۰ فیصد حصہ لفظ بہ لفظ منظور ہوچکا ہے۔ ترامیم سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اس لئے ان ترامیم کو قبول کرلیں، مزید ضرورت ہو تو وکلاء ساتھ لے جائیں۔ اُن کے مشورہ سے موقع پر فیصلہ کرلیا جائے۔"

مفتی محمود :۔ "ہم نے بم بلاسٹ کیسوں کی بات کی تھی لیکن اس کا بھٹو کا، مؤقف یہ ہے کہ آپ الیکشن کے زمانہ سے معاملات کی بات کریں، پرانے معاملات نہ اٹھائیں۔"

بہرحال اس اجلاس میں قومی اتحاد کے رہنماؤں کے باہمی اختلافات کھل کر سامنے آئے اور خاصی تند و تیز باتیں ہوئیں۔ اُن میں سے بعض رہنماؤں کے نزدیک تو مذاکراتی ٹیم مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی تھی اور اس سے ایک "بڑا جرم" سرزد ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسودہ حتمی تھا اسے واپس کیوں لایا گیا ؟

کچھ دوسرے رہنماؤں کی رائے تھی کہ ہمارا مسودہ کوئی آسمانی صحیفہ تو نہیں تھا، جس میں کوئی ردوبدل نہ ہوسکتا ہو۔

بالآخر فیصلہ ہوا کہ مذاکراتی ٹیم اسی روز بھٹو سے مل کر زبانی اپنے نکات سے آگاہ کردے۔

اجلاس سے باہر صحافی کسی فیصلہ کے منتظر تھے۔ اصغر خاں نے کہا "آج صحافیوں سے میں خود بات کروں گا ـــــ"

اِس سے پہلے صحافیوں سے پروفیسر غفور بات کرتے تھے، اَب اصغر خاں کے بات کرنے سے ظاہر ہے کہ صحافیوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ——————

رات کو پونے دس بجے مذاکراتی ٹیم پرائم منسٹر ہاؤس پہنچی۔ اِس ٹیم کی پوزیشن اس لحاظ سے کمزور تھی کہ وہ خود اپنے ہی رہنماؤں کے زیرِ عتاب بھی تھی اور بے دست وپا بھی —————— تاہم بھٹو نے ٹیم سے انتہائی تحمل اور رواداری کا رویّہ اختیار کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بھٹو حالات کی نزاکت کو تاڑ گئے تھے۔ (پھر اسی رات وفاقی کابینہ کا اجلاس بھی ہوا تھا)۔

نواب زادہ نصراللہ خاں نے بم بلاسٹ کا معاملہ بھی بھٹو کے سامنے رکھا، جس پر بھٹو نے کہا کہ انہیں خود اپنی کابینہ کے بعض ارکان سے اختلافات کا سامنا ہے کیونکہ بعض وزراء اب یہ کہہ رہے ہیں کہ میں (بھٹو) صرف اپنی کرسی بچانے کے لئے ہتھیار ڈال رہا ہوں —— جہاں تک میرا تعلق ہے میں مفاہمت کے لئے بہت دور تک آگے بڑھا ہوں۔ میں نے آپ کی بیشتر باتیں مان لی ہیں لیکن اتحاد والے ہر بار مذاکرات کو "ری اوپن" (RE-OPEN) کرکے تاخیر کر رہے ہیں۔ اَب یہ "آخری لمحہ پر سودا بازی" ہے۔ لوگ بات چیت ٹوٹنے سے متاثر لے رہے ہیں۔ اضطراب کا اظہار ہو رہا ہے ——————

اسی روز قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کے دوسرے اجلاس میں یہ گفتگو ہوئی:۔

اصغر خاں:۔ "ہم نے جو مطالبات پیش کئے ہیں وہ کم از کم ہیں۔ وہ اگر نہیں مانتے تو تحریک شروع کر دی جائے گی۔"

شیر باز مزاری:۔ "مجھے اصغر خاں سے اتفاق ہے۔ ہم اسے جتنی ڈھیل دیتے جائیں گے اتنا ہی وہ (بھٹو) ہمیں دباتا جائے گا۔ یہ وقت ہے کہ ہم سخت مؤقف اختیار کریں۔"

خان اشرف خان:۔ "موجودہ صورتِ حال پر لوگ تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ آپ نے قوم کو پھر امتحان میں ڈالنا ہے تو ہر پہلو کو ملحوظ رکھیں۔ پہلے جب انتخابات ہوئے تھے تو وہ بہت طاقتور تھا، اب وہ کیفیت نہیں۔ قوم بھی بیدار ہے۔ الیکشن میں وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گا، اس لئے ہم جو منوا سکتے ہیں، منوالیں۔ جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔"

اصغر خاں:۔ "ہمارا فیصلہ جذباتی نہیں۔ اس کے عزائم بڑے خطرناک ہیں۔ وہ کوئی اور پوزیشن لینے کو تیار نہیں اور یہاں اجلاس میں اکثریت کی رائے بھی نہیں چلے گی کیونکہ اتحاد کی ایک پارٹی نے بھی فیصلہ سے اختلاف کیا تو اتحاد ختم ہے۔"

اس طرح تحریک چلانے کے حق میں اصغر خاں، شیر باز مزاری، شاہ احمد نورانی اور بیگم نسیم ولی تھے مگر یہ دوسروں سے اپنی بات نہیں منوا سکے۔ یہ اجلاس رات ایک بجے تک جاری رہا اور بالآخر اس اکثریتی تاثر کے ساتھ ختم ہوا کہ مذاکرات کا سلسلہ نہ توڑا جائے اور انہیں کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔

چوتھا باب

ناخدائیں، عقاب اور "فرشتے"

سیاسی رہنماؤں کا پُر اسرار رویّہ

قوم — آتش فشاں کے دہانہ پر!

ذوالفقار علی بھٹو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قومی اتحاد کے راہنماؤں سے مذاکرات کر رہے ہیں

مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے قومی اتحاد کے بعض رہنماؤں کا رویّہ اور عمل خاصا پُراسرار اور معنی خیز تھا۔ ایئر مارشل اصغر خاں، فوج کو مداخلت کے لیے "دعوت نامہ" بھیج چکے تھے۔ ولی خاں اپنی تمام تر جمہوریت پسندی کے باوجود، فوج آجانے کے خلاف نہیں تھے، اور اسی طرح بعض دوسرے رہنماؤں کی سرگرمیاں مشکوک و مشتبہ تھیں۔

اُن دنوں راولپنڈی میں مفتی محمود کے پاس رات گئے سردار شیر باز خان مزاری آئے اور مفتی صاحب سے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری معاملات پر گفتگو کرنا ہے!"

"فرمایئے۔ کیا معاملات ہیں؟" مفتی محمود نے جواب دیا۔

"یہاں بات نہیں ہو سکتی" سردار شیر باز مزاری نے کہا "اس کمرہ میں ایسے آلات ہو سکتے ہیں جن کے ذریعہ حکومت کو ہماری بات چیت کا علم ہو جائے، اسلئے مناسب یہ ہے کہ آپ نیچے تشریف لے چلیں ہم کار میں بیٹھ کر گاڑی چلا دیں گے اور پھر چلتی کار میں باتیں کریں گے۔"

خیال رہے کہ اُن دنوں، قومی اتحاد کے یہ رہنما حکومت سے مذاکرات کے لیے راولپنڈی میں جمع تھے۔ جبکہ ان کا یہ رویّہ جاسوسی ناول کے کرداروں کی مانند، عجیب اور انوکھا تھا، بہرحال مفتی محمود صاحب نے تعمیلِ ارشاد میں دیر نہیں کی، وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور سردار صاحب کے ہمراہ نیچے اُتر گئے۔ ابھی وہ کار تک نہیں پہنچے تھے کہ راستہ میں بیگم نسیم ولی خان نظر آئیں انہوں نے مفتی صاحب کو دیکھتے ہی اُن سے کہا۔

"آپ بھٹو صاحب سے کوئی معاہدہ نہ کریں اور مارشل لاء لگنے دیں کیونکہ مارشل لاء کا نفاذ اس امر کی ضمانت ہوگا کہ

۹۰ دن میں آزادانہ انتخابات ہو جائیں گے، جبکہ آزادانہ انتخابات کے لیے بھٹو پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔"

اندازہ کیجئے کہ جمہوریت کے ان چیمپئن حضرات اور خواتین کو مارشل لار کے نفاذ کا کس شدید بے صبری سے انتظار تھا۔ جانے کیوں یہ سیاستدان اس امر کو بھول گئے تھے کہ فوج ایک بار آجائے تو پھر ضروری نہیں کہ وہ "۹۰ دن" کی پابند رہے اور پھر کیا یہ محض "اتفاق" سمجھا جائے کہ "۹۰ دن میں آزادانہ انتخابات" کی جو بات بیگم نسیم ولی خان نے مارشل لار کے جواز میں کہی، وہی بات خود جنرل ضیاالحق نے بھی کہی اور ۹۰ دن میں آزادانہ انتخابات کا وعدہ کیا مگر وہ بعد میں یہ کہہ کر اس وعدہ سے منحرف ہو گئے کہ

"میں پرانے ٹھٹے لگانے تو نہیں آیا۔ مجھے دیکھنا ہے کہ انتخاب سے پہلے بدعنوان عناصر کا احتساب ہو جائے۔ اس کے بعد الیکشن بھی ہو جائیں گے"!

اور کیا یہ بھی محض "اتفاق" تھا کہ ولی خان نے بنفسِ نفیس جنرل ضیاء الحق کے اس موقف کی تائید کی اور "انتخاب سے پہلے احتساب" کا پرچم لہرایا؟

بیگم نسیم ولی خان کے "مشورہ" پر کہ بھٹو سے کوئی معاہدہ نہ کیا جائے۔

مفتی صاحب نے بیگم صاحبہ سے پوچھا!

"کیا ولی خان کی بھی یہی رائے ہے"؟

بیگم نسیم ولی خان نے جواب دیا "جی ہاں، ان کی بھی یہی رائے ہے"!

اس بات پر مفتی صاحب کو تعجب ہوا۔ وہ شاید سمجھتے تھے کہ بیگم نسیم ولی خان نے اپنے طور پر ایک رائے کو مشورہ بنا کر کہہ دیا ہے ورنہ جمہوریت کے علمبردار سیاستدان مارشل لا کے لیے راہیں ہموار نہیں کرتے۔ لیکن جب بیگم نسیم نے واضح کر دیا کہ ولی خان کی بھی یہی رائے ہے تو مفتی صاحب حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

"میں اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں کرتا"۔

اُدھر ایئر مارشل اصغر خان بھی مارشل لار کے حق میں اپنے خیالات ظاہر کر چکے تھے۔ ان کی رائے میں انتخابات کے انعقاد کے لیے مارشل لار کا نفاذ بہتر تھا۔ جمہوریت کے لیے آمریت ضروری ہو گئی تھی۔ ایئر مارشل اصغر خان قو ۴ رمئی کو بری فوج کے چیف آف سٹاف اور دفاعی سروسز کے دوسرے افسروں کے نام ایک مراسلہ میں یہ پیغام دے چکے تھے کہ "پاکستان کی علاقائی سالمیت کا دفاع ان پر فرض ہے۔ لیکن انہیں قانون اور غیر قانونی احکامات میں تمیز کرنا چاہیئے۔ اور انہیں غیر قانونی حکومت کی حمایت نہیں کرنا چاہیئے۔ اور یہ کہ موجودہ حالات میں حکومت کے حق میں فوج کی کارروائی ایک فرد کو تحفظ دینے اور اسکی حمایت کرنے کے مترادف ہے"۔

اندازہ کیجئے کہ ایک ذمہ دار اور سنجیدہ سیاستدان فوج کو کیا مشورہ دے رہا تھا، کہ وہ قانونی اور غیر قانونی احکامات میں تمیز

بھٹو نوابزادہ نصراللہ خان اور مفتی محمود مذاکرات کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

کرے۔ اب اگر کسی ملک کی فوج اسی روش یعنی خود قانونی وغیر قانونی کی تمیز کا سلسلہ شروع کر دے تو بات کہاں رُکتی ہے ؟

یہ کھلے طور پر فوج کے لیے بغاوت کا دعوت نامہ تھا۔ جو جمہوریت کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک فرد بھٹو کا تختہ الٹنے کے لیے اختیار کیا جا رہا تھا۔

حالات صاف طور پر ظاہر کر رہے تھے کہ بعض خفیہ اور کچھ کھلے ہاتھ چاہتے تھے کہ مذاکرات کسی حال میں کامیاب نہ ہوں وہ بھٹو سے کسی صورت میں معاہدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر کیوں ؟ اس لیے کہ دو دوسرے فریق۔ امریکہ اور جرنیل۔ معاہدہ کے حق میں نہیں تھے۔ اس مرحلہ پر دونوں طرف سے دھمکیوں کے سلسلے بھی جاری تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستانی قوم کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اور لاوا کسی وقت بھی پھوٹ کر سب کچھ تباہ کر سکتا ہے۔ ماہِ جون کی آخری دہائی میں جہاں آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ وہیں دلوں کے اندر بھی آگ سلگ رہی تھی۔ اِن نازک دنوں میں بھٹو صاحب نے بھی ایک انوکھی حرکت کی، وہ مذاکرات کے دوران ہی ۱۸ رجون کو غیر ملکی دورہ پر روانہ ہو گئے، جس سے مذاکرات کے دوران کئی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور معاملات پیچیدہ صورت اختیار کر گئے۔

بھٹو صاحب کے اس غیر ملکی دورہ کے سلسلہ میں یہ سوال واقعی بہت اہم ہے کہ جب معاہدہ کے لیے زبانی اتفاق رائے ہو گیا تھا تو معاہدہ کو تحریری اور آخری شکل دیئے بغیر وہ غیر ملکی دورہ کرنے کیوں چلے گئے ؟ کیا وہ اپنی خود اعتمادی کا کوئی غیر معمولی (اور ساتھ ہی قطعی غیر ضروری) مظاہرہ کرنا چاہتے تھے ؟ اور پھر یہ کہ بھٹو کی عدم موجودگی میں پیر زادہ عبدالحفیظ نے اتحاد کی ٹیم سے غیر مصالحانہ رویہ کیوں اختیار کیا ؟ اور مزید یہ کہ مولانا کوثر نیازی نے بھی بعض اہم امور کو مؤخر کیوں کر دیا ؟ یہاں اگر پیر زادہ عبدالحفیظ اور مولانا کوثر نیازی کے اُس کردار کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ جو انہوں نے بھٹو کا تختہ اُلٹے جانے کے بعد اختیار کیا تو ان دونوں کے اس غیر مصالحانہ رویہ کی سمجھ آجاتی ہے اور یہ آشکار ہوتا ہے کہ درپردہ وہ بھی ان ہاتھوں سے ملے ہوئے تھے جو بھٹو کا تختہ الٹنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔

عام خیال یہ تھا کہ بھٹو صاحب کی غیر ملکی دورے سے واپسی تک معاہدہ تیار ہو گا۔ صرف دستخطوں کا مرحلہ رہ جائے گا۔ لیکن جب مذاکرات میں اختلافات اُبھرے تو ایک بار پھر بحران اور ہیجان پیدا ہو گیا۔ اتحاد کے بعض رہنماؤں کو یہ شُبہ بھی ہوا کہ خود بھٹو، پیر زادہ اور مولانا کوثر نیازی کو ایسی ہدایات دے گئے ہیں کہ وہ معاہدہ نہ کریں۔

بالآخر ذیلی کمیٹیوں میں مذاکرات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ تفصیلات طے کرنے پر اختلافات نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ اِس دوران بھٹو صاحب تہران سے اچانک کابل پہنچ گئے۔ حالانکہ کابل کا دورہ ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ ۲۱ رجون کو انہوں نے پیر زادہ عبدالحفیظ اور مفتی محمود سے ٹیلی فون پر بات چیت کی جس کے بعد ۲۲ رجون کو قومی اتحاد نے یومِ احتجاج منانے کا اعلان کر دیا۔ اور تب ۔ ۲۳ رجون کو بھٹو صاحب غیر ملکی دورہ سے واپس آئے۔ تاہم یہ آج

تک واضح نہیں ہو سکا کہ اس نازک مرحلہ پر اس غیر ملکی دورہ کی کیا ضرورت آن پڑی تھی ؟

قومی اتحاد نے ۲۳ر جون کو معاہدے کا مسودہ سرکاری ٹیم کے حوالے کر دیا۔ یہ لوگ چاہتے تو ۲۴ر جون تک اسے مکمل کر سکتے تھے۔ مگر مسودہ پر نظر ثانی ہوتی رہی۔ انہی دنوں نبی بخش زہری (بلوچستان کے رہنما) نے انکشاف کیا کہ پیپلز پارٹی کے ایک اہم عہدیدار نے بھٹو کو مشورہ دیا ہے کہ احتجاجی تحریک کو کچلنے کے لیے قومی اتحاد کے چند لاکھ افراد قتل کر دیئے جائیں تو معاملات "ٹھیک" ہو جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود پیپلز پارٹی اور سرکاری ٹیم میں معاہدہ کے مخالف بھی موجود تھے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ معاہدہ پر اختلافات کیا تھے ؟ یوں تو معاہدہ کی بے شمار شقیں اور ضمیمے تھے۔ جن میں تمام رہنماؤں کو ریڈیو اور ٹی وی سے خطاب کے مساوی مواقع فراہم کرنا، پریس پر پابندیاں ختم کرنا، سیاسی سرگرمیوں کی مکمل آزادی سیاسی قیدیوں کی رہائی، تحریک میں مرنے والوں کی مالی امداد، وغیرہ امور شامل تھے، تاہم جو اختلافات تھے۔ اُن کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی۔

قومی اتحاد کا مطالبہ ـــــ قومی اور صوبائی اسمبلیاں ۷ر جولائی کو ختم کر دی جائیں۔

بھٹو حکومت کا موقف ـــــ معاہدہ ہونے کے بعد ۱۵ دن کے اندر اسمبلیاں ختم کی جائیں گی۔

قومی اتحاد کا مطالبہ ـــــ قومی الیکشن ۶ر اکتوبر کو اور صوبائی ۱۰ر اکتوبر کو کرائے جائیں۔

بھٹو حکومت ـــــ قومی الیکشن ۸ر اکتوبر کو اور صوبائی ۱۰ر اکتوبر کو ہوں گے۔

قومی اتحاد ـــــ معاہدہ پر عمل درآمد کے لیے سپریم کونسل قائم کی جائے۔

بھٹو حکومت ـــــ اس کونسل کے نام سے لفظ "سپریم" نکال دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اختلافات چل رہے تھے کہ ۲۹ر جون کو غلام مصطفےٰ کھر نے پریس کلب میں یہ بیان دیا کہ قومی اتحاد تحریک چلانا جانتا ہے تو ہم اُسے کچلنا بھی جانتے ہیں اور یہ محض دھمکی نہیں بلکہ یہ وہی کھر بول رہا ہے جو ۱۹۷۲ء میں تھا۔ اب تشدد کا جواب تشدد سے دیا جائے گا۔ اس بیان کے ساتھ ہی اسی روز لاہور میں دو مقامات پر پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے کارکنوں میں تصادم ہوا۔

اس وقت تک مئی میں شروع ہونے والے اُن مذاکرات کو اب تقریباً دو ماہ ہو رہے تھے مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی تھا یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ پرنالہ وہیں تھا۔ اس سے اتحاد کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا چنانچہ اُن کی طرف سے سرکاری ٹیم سے کہا گیا :

"اب ہم ایک ایسا ترمیمی مسودہ پیش کریں گے جو قطعی ہو گا، اس پر بات چیت کی گنجائش نہیں ہو گی۔ آپ کو اُسے قبول یا مسترد کرنا ہو گا۔"

اس پر پیرزادہ عبدالحفیظ نے کہا "آپ ہمیں دھمکی دے رہے ہیں۔ اگر یہ دھمکی ہے تو پھر ہم آپ کے مسودہ کو بذریعہ ڈاک بھی وصول نہیں کریں گے۔"

اس کے بعد پیرزادہ نے اخبارات کو بھی یہ بیان جاری کیا کہ قطعی مسّودہ کی بات دھمکی اور الٹی میٹم ہے جسے حکومت برداشت نہیں کر سکتی اور قومی اتحاد جب تک اپنا الٹی میٹم واپس نہ لے گا مزید گفت و شنید نہیں ہو سکتی۔

۲۸ر جون کو ڈاکٹر غلام حسین نے ملتان میں پیپلز پارٹی کے ایک کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا "کارکن مورچے سنبھال لیں اور قومی اتحاد کے کارکن جس زبان میں بات سمجھتے ہیں انہیں اسی زبان میں سمجھا دیں۔"

بن بنایا کھیل ایک بار پھر سے بگڑتا نظر آیا۔ دونوں مذاکراتی ٹیموں میں کچھ فاختائیں تھیں تو کچھ عقاب ―― فاختائیں صلح صفائی پر مائل تھیں اور عقاب جھپٹنے پر ―― البتہ یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ جھپٹنے کے لئے تیار حضرات آخر کس مقصد کے لئے مذاکرات کو ناکام بنانے کے خواہاں تھے؟ یہ مقصد سوائے مارشل لاء کے نفاذ کے اور کیا تھا؟ کیا پیپلز پارٹی کے نام نہاد "عقابوں" کو بھی اس مقصد کا اشارہ مل گیا تھا اور وہ اس پر عمل پیرا ہو گئے تھے؟ بالکل اسی طرح اتحاد کے بعض رہنما بھی صلح صفائی سے گریزاں ہو گئے تھے۔

بہرحال پیرزادہ عبدالحفیظ کے اخباری بیان کے بعد، قومی اتحاد نے اپنا ترمیمی مسّودہ پیرزادہ کو دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ قومی اتحاد کی جنرل کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس ۳ر جولائی کو لاہور میں طلب کر لیا گیا۔ اس میں آئندہ لائحۂ عمل کا فیصلہ ہونا تھا۔ اتحاد کی مرکزی کونسل کی رائے تھی کہ اگر حکومت اسمبلیاں توڑ کر نئے انتخابات کا اعلان بھی کر دے تو بھی ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے۔ یہ اس لئے کہ انہیں انتخابات میں دھاندلی کا شبہ تھا۔ ۲۸ر جون کی سہ پہر کو ذوالفقار علی بھٹو نے ٹیلی فون پر مفتی محمود سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا:

"کیا وجہ ہے کہ اتحاد نے اپنا ترمیمی مسّودہ پیرزادہ کو نہیں دیا؟"

مفتی محمود نے جواب دیا "وہ مسّودہ وصول کرنے سے انکار کر چکے ہیں حالانکہ یہ مسّودہ کوئی دھمکی یا الٹی میٹم نہیں۔"

بھٹو نے کہا "میں پیرزادہ سے کہتا ہوں کہ وہ مسّودہ وصول کر لیں۔" اس کے بعد پیرزادہ نے مسّودہ وصول کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ بھٹو نے اسی روز ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ "ہم مسّودہ پر بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ اس کے باوجود اگر قومی اتحاد نے مسّودہ نہ دیا تو اس سے شدید تعطل پیدا ہو گا جو جمہوریت اور آئین کے لئے تباہ کن ثابت ہو گا۔" ―― بھٹو نے یہ بھی کہا کہ "ہم تین بنیادی مسائل پر تصفیہ کے لئے تیار ہیں۔ ایک یہ کہ انتخابات کی تاریخ کا اعلان کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ انتخابات دوبارہ کرائے جائیں اور تیسرے یہ کہ انتخابات کے لئے غیر جانبدار اور مثالی مشینری فراہم کی جائے لیکن ہم حکومت میں قومی اتحاد کی شمولیت اور حکومت پر سپر حکومت (سپریم کونسل) کے قیام کو منظور نہیں کر سکتے۔ اس تعطل کی صورت میں اگر آئین ختم ہوتا ہے یا "فرشتے" اگر حکومت سنبھال لیتے ہیں یا کوئی راسپوٹین یہاں آجاتا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر (بھٹو پر) نہیں ہوگی۔"

بالآخر قومی اتحاد نے ۲۹ر جون کو مسّودہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اتحاد کے ۹ رہنما ایک گروپ کی شکل میں تھے۔ ایئر مارشل اصغر خاں نے ان سے کہا "آج کے بعد ہم جانے کہاں ہوں گے؟"

نواب زادہ نصراللہ نے ایک مصرعہ پڑھا "اِک جان ہے باقی تو لے یا خدا لے۔" مسّودہ دینے کے بعد نواب زادہ نصراللہ خاں نے بھٹو کی پریس کانفرنس کے جواب میں ایک پریس کانفرنس بلائی اور کہا کہ اتحاد کے لئے وزارتوں اور نگران کونسل کی تجویز خود بھٹو نے پیش کی تھی مگر

قومی اتحاد نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ ہم حکومت پر کوئی سُپر حکومت بھی قائم کرنا نہیں چاہتے۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ کونسل، انتخابات اور اُن سے متعلقہ امور کے بارے میں با اختیار ہو ــــــــ

اصغر خاں نے کہا "ہم نے واضح کر دیا ہے کہ ہم نئے مسودے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے اور جمعہ کو لاہور میں قومی اتحاد کے جلوس کی قیادت کریں گے۔ اتحاد کی مرکزی کونسل کے اجلاس میں اصغر خاں نے کہا کہ سعودی سفیر کو ان مذاکرات میں کم سے کم لایا جائے کیونکہ سعودی سفیر پاکستان میں جمہوریت نہیں چاہتے ــــــ خیال رہے کہ سعودی سفیر اور بعض دوسرے عرب سفیر یہ کوشش کر رہے تھے کہ حکومت اور حزبِ مخالف میں مفاہمت ہو جائے تاکہ پاکستان کسی بحران سے دوچار نہ ہو۔

اصغر خاں نے نئے مسودہ کو "حتمی" بھی قرار دیا اور کہا کہ اتحاد کی مذاکراتی ٹیم اس مسودہ میں کوئی ترمیم قبول کرنے کی مجاز نہیں۔ ۲۹ر جون کی شام کو مرکزی کونسل کے ارکان نے بھٹو سے ملاقات کی۔ اس میں اصل مسئلہ کونسل کے اختیارات کا قرار پایا جس پر مفتی محمود نے ایک پریس کانفرنس بلا کر واضح کیا کہ مسودہ صرف آزادانہ و منصفانہ انتخابات کے لئے ہے۔ اسے قبول کرنے سے اس ملک میں نہ تو "فرشتے" آئیں گے اور نہ "زلزلہ" آئے گا۔ البتہ اگر حکومت نے اس مسودہ پر دستخط نہ کئے تو ہم سمجھیں گے کہ حکومت خود اس ملک میں "فرشتے" لانا چاہتی ہے۔

اِس مرحلہ پر پُورا ملک ایک شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والا کل، اپنے دامن میں کیا لائے گا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت بنیادی مطالبات تو مان رہی ہے مگر فروعی مسائل پر جھگڑا سے تصفیہ میں تاخیر کر رہی ہے۔ ۳۰ر جون کو مذاکرات کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں قومی اتحاد کا مسودہ زیرِ بحث آیا۔ اس میں ابتدائیہ کے آٹھ پیراگراف اور متن میں ۳۰ شقیں تھیں۔ پیرزادہ عبدالحفیظ نے کہا

"پیرا نمبر ایک میں لفظی ترمیم ہوگی۔ پیرا نمبر تین اور چار حذف کرنا ہوں گے۔ ۳۰ شقوں میں سے ۱۰ منظور ہیں"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیرزادہ کا رویّہ سیاسی کم اور قانونی زیادہ ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اتحاد میں شامل بعض رہنما، اس مسودہ میں معمولی سی ترمیم بھی قبول نہیں کریں گے اور مذاکرات کی بساط لپیٹ کر تحریک کی بات کریں گے۔ اس کے باوجود پیرزادہ کے رویّہ میں نرمی نہ آئی۔

○

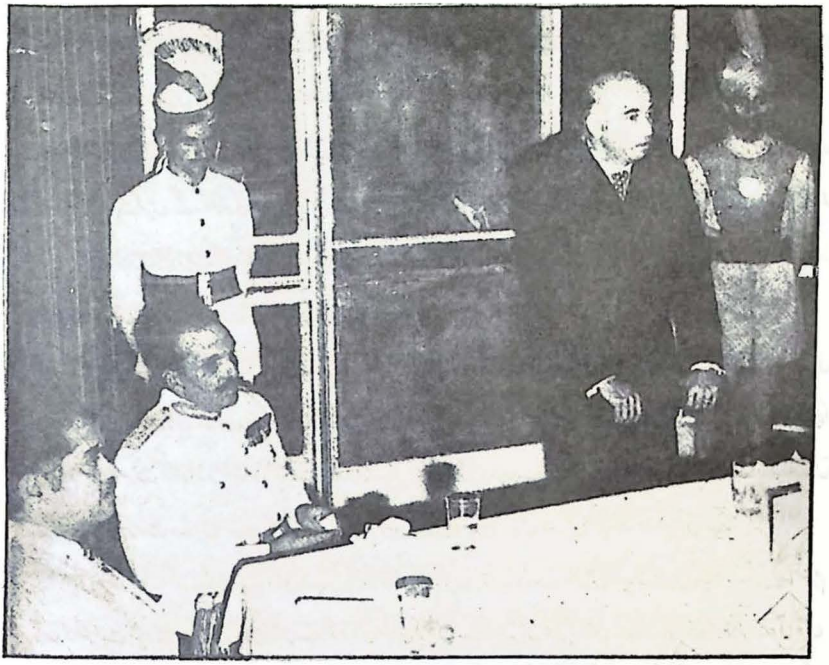

ٹیک اوور سے چند لمحے پہلے جنرل ضیاء الحق ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ

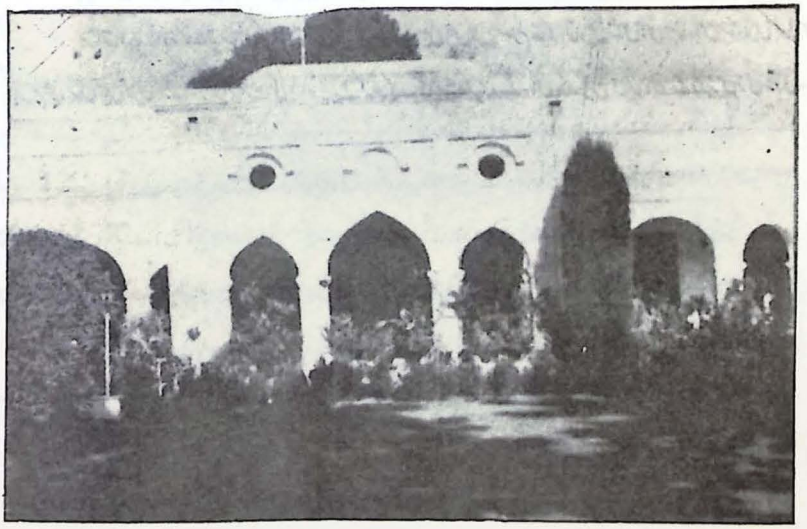

آرمی ہاؤس کا بیرونی منظر

پانچواں باب

ضیاء کی دوغلی پالیسی

"آپریشن فیئر پلے" کا ڈرامہ —— چند جرنیلوں کی "واردات"

جنرل ضیاء جرنیلوں اور حکومت کے رویہ کو تاڑتے رہے

جنرل ضیاالحق وزیراعظم بھٹو کا استقبال کر رہے ہیں (تصویر ۱۱ نومبر ۱۹۷۶ء)

جنرل ضیاءالحق ایک طرف تو بھٹو حکومت سے اپنی وفاداری کا اظہار کر رہے تھے اور دوسری طرف حکومت کا تختہ اُلٹنے کے منصوبے بن رہے تھے۔

سیاسی افراتفری اور اتھل پتھل کے اُن دنوں میں جنرل ضیاءالحق نہ صرف حکومت کے رویہ و مزاج کا بغور جائزہ لیتے رہے بلکہ فوج میں اپنے ساتھیوں کے ردِعمل اور تاثرات کو بھی تاڑتے رہے۔ جرنیلوں کے خیالات جاننے کے لئے انہوں نے بڑی ہوشیاری اور عیاری سے جال پھیلائے اور اپنا کوئی بھی تاثر دئے بغیر ان کے خیالات کو جاننے میں اِسی طرح کامیاب ہو گئے جیسا کہ وہ بھٹو حکومت کے رویہ اور آئندہ پالیسی کو جان چکے تھے۔

۱۶ مئی ۷۷ء کو فوجی جرنیلوں اور افسروں کے ایک اجلاس میں انہوں نے کور کمانڈروں کو ملک کے حالات پر اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ سب سے پہلے جنرل جہاں زیب ارباب نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کہا:۔

"صورتِ حال مجموعی طور پر انتہائی خراب ہے۔ انتخابات میں دھاندلی سے سبھی آگاہ ہیں۔ اِن حالات میں وزیرِاعظم ریفرنڈم کرانا چاہتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اگر ریفرنڈم ہو سکتا ہے تو الیکشن کیوں نہیں ہو سکتا؟ (خیال رہے کہ یہی سوال جرنیلوں نے جنرل ضیاء کے ریفرنڈم پر نہیں کیا) احتجاجی تحریک حکومت کی پانچ سالہ کارروائیوں کے خلاف ردِعمل ہے۔ اِس تحریک کی جڑیں گہری ہیں۔ اِس کے لئے لاکھوں روپے کے چندے دئیے جا رہے ہیں۔ انتہائی طاقتور عناصر حکومت کے مخالف ہیں اور عوام اُن عناصر کا ساتھ دے رہے ہیں۔ امن و امان کے قیام کے لئے فوج کو اب تک ایک غیر جانبدار ادارہ سمجھا جاتا ہے اگر اسے ملوث کیا گیا تو اس کا اعتماد بھی اٹھ جائے گا۔

اِن حالات میں ہم اگر خاموش تماشائی بنے رہے تو خود فوج میں بھی اختلافات اُبھریں گے جیسا کہ قبل ازیں چار بریگیڈیئر اس مسئلہ پر استعفیٰ

دے کر جا چکے ہیں۔ ایک کپتان نے اپنے افسر کا حکم ماننے سے انکار کیا۔ اِن واقعات نے فوج کو ایک نئی الجھن سے دوچار کر دیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان دونوں حریفوں کے درمیان آکر انہیں کسی سمجھوتہ پر مجبور کریں۔ ورنہ بعد میں معاملات کسی کے قابو میں نہیں رہیں گے۔"

کور کمانڈر جنرل اقبال نے کہا "ملک انتہائی مشکل مرحلہ سے گزر رہا ہے۔ وکلاء بحیثیتِ طبقہ حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں، عورتیں اور بچے بھی حکومت کے خلاف جلوس نکال رہے ہیں۔ ہم اُن پر گولی کیسے چلا سکتے ہیں؟ سپاہیوں میں اِن حالات پر بے چینی پائی جاتی ہے۔ لوگ اب خبروں کے لئے ملکی ذرائع پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ بی بی سی سنتے ہیں ــــــ"

جنرل چشتی نے کہا "اِس وقت فوج ملک کی سب سے بڑی اتھارٹی ہے لیکن اصل بات دوبارہ انتخابات ہیں۔ ہمیں حکومت سے کھُل کر کہہ دینا چاہیئے کہ دھاندلی ہوئی ہے اِس لئے دوبارہ انتخابات کراؤ ــــــ اور یہ ریفرنڈم کیا ہے؟ اصل بات یہ نہیں کہ بھٹو رہے یا نہ رہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ حکومت پیپلز پارٹی کی ہو یا نہ ہو ــــــ پارٹی حکومت کا فیصلہ الیکشن سے تو ہو سکتا ہے ریفرنڈم سے نہیں۔ عوام کو حکومت پر قطعاً اعتماد نہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ فوج آگے بڑھ کر انتخابات کرا دے۔"

جنرل غلام حسن نے کہا "ملک شدید بحران کا شکار ہے اور اِن حالات میں دُور رس اقدامات کی ضرورت ہے۔ پارلیمانی نظام میں ریفرنڈم کسی شخصیت پر نہیں بلکہ پارٹی پر ہوتا ہے، اس لئے بھٹو پر ریفرنڈم بے معنی ہے۔ دھاندلی کے الزامات کو دُور کرنے کے لئے دوبارہ انتخابات بہتر حل ہیں۔"

جنرل غلام محمد نے بھی دوبارہ الیکشن کی حمایت کی۔ اُن سب کے بعد خود جنرل ضیاء الحق نے کہا "فوج کوئی تیسری پارٹی نہیں۔ قومی اتحاد کا جو نقشہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ اصل میں اس سے کہیں زیادہ گہرا اور پیچیدہ معاملہ ہے" ــــــ اِن الفاظ کے ساتھ اجلاس، بغیر کسی فیصلہ کے ختم کر دیا گیا۔ اِس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس "اہم اجلاس" کا مقصد در اصل کوئی حل ڈھونڈھنا نہیں تھا بلکہ صرف جرنیلوں کے خیالات جاننا مقصود تھا، جنہیں جان لینے کے بعد اجلاس برخاست ہو گیا۔

دوغلی پالیسی ایک طرف یہ کارروائیاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف جنرل ضیاء الحق، بھٹو کو ہمیشہ یہ یقین دلاتے تھے کہ فوج پوری طرح آپ کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے انکسار سے جھک کر بھٹو سے کہتے "جناب، ہم آخری حد تک آپ کے ساتھ ہیں۔" بھٹو کی سادگی ملاحظہ ہو کہ وہ اِس بات سے مطمئن ہو جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ضیاء الحق اُن کے اپنے آدمی ہیں اور فوج میں ڈسپلن برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ صرف ایک بار بھٹو چونکے تھے جب ضیاء الحق نے ان سے کہا تھا کہ بعض جرنیل آپ سے ملنا چاہتے ہیں، انہیں بات چیت سے مطمئن کر دیجئے تاکہ موجودہ حالات میں کسی دوسرے "فوجی راستہ" کا امکان باقی نہ رہے ــــــ

"فوجی راستہ" کے لفظ سے بھٹو چونکے تھے اور پھر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جرنیل اس ڈھب سے بھی سوچنے لگے ہیں اور دوسرے یہ کہ فوج میں صرف ضیاء الحق نہیں دوسرے جرنیل بھی ہیں۔

اس کے بعد بھٹو نے صرف ضیاء الحق کو میٹنگوں میں بلانے کی بجائے تمام کور کمانڈروں کو بلانا شروع کر دیا یُوں بھٹو سے قرب پر ضیاء الحق کی جو اجارہ داری تھی وہ ختم ہو گئی جسے جنرل ضیاء نے شدت سے محسوس کیا اور یہ خدشہ بھی لاحق ہو گیا کہ بھٹو صاحب جو مختارِ کُل ہیں چیف آف سٹاف

کے عہدہ پر کسی اور کو نہ لے آئیں ——

حالات کے اس رُخ پر آجانے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اپنی درپردہ سرگرمیاں تیز کر دیں اور یہ طے کر لیا کہ حکومت کا تختہ یا تو اُلٹا جانا چاہیئے ورنہ پھر کبھی نہیں —— چنانچہ ۴، ۵ جولائی کی رات کو وہ منصوبہ آخری مرحلہ پر آ گیا جس کے لئے وہ مہینوں سے پُخت و پُز کرتے آرہے تھے۔

۴ جولائی کی رات کو "آپریشن فیئر پلے" کے نام سے جو ڈرامہ ہوا، اصل میں وہ ۱ جولائی کو ہونا تھا، لیکن بعض وجوہ سے اُس روز اُس پر عمل نہ ہو سکا —— ویسے یہ جان لینا بھی بہتر ہو گا کہ بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش اچانک ۴ جولائی کو ملک کے ہنگامہ خیز حالات کی بناء پر عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ اس کی تیاریاں مارچ میں انتخابات کے ساتھ ہی شروع کر دی گئی تھیں اور مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ اگست ۱۹۷۶ء میں جب ہنری کسنجر، بھٹو سے مایوس ہو کر گیا تو اس سازش کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔

مارشل لاء کے نفاذ کے آغاز میں صرف چار پانچ افراد اس عمل میں ملوث تھے۔ ان میں جنرل ضیاء، جنرل چشتی، جنرل عارف، جنرل جہانزیب ارباب اور جنرل غلام حسن وغیرہ شامل ہیں —— بعد میں کچھ اور لوگوں کو بھی اعتماد میں لیا گیا، جن میں جنرل اقبال، جنرل سوار خاں وغیرہ شامل ہیں۔ اِن لوگوں کے بھٹو صاحب سے ذاتی تعلقات بھی تھے۔

جنرل ضیاء الحق نے بڑی چالاکی و عیاری سے بعد میں بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی اس عمل میں ملوث کر لیا یعنی آئین توڑنے پر پھانسی کے پھندہ کے خوف سے دوسرے کور کمانڈروں کو بھی ملوث کیا گیا —— اِن تمام جرنیلوں کو یہی تاثر دیا جاتا رہا کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور بھٹو برسرِ اقتدار آیا تو ہمارا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الحق نے پی این اے کو بھی استعمال کر کے پھینک دیا پھر شوریٰ اور اسمبلی کا بھی یہی حشر کیا۔

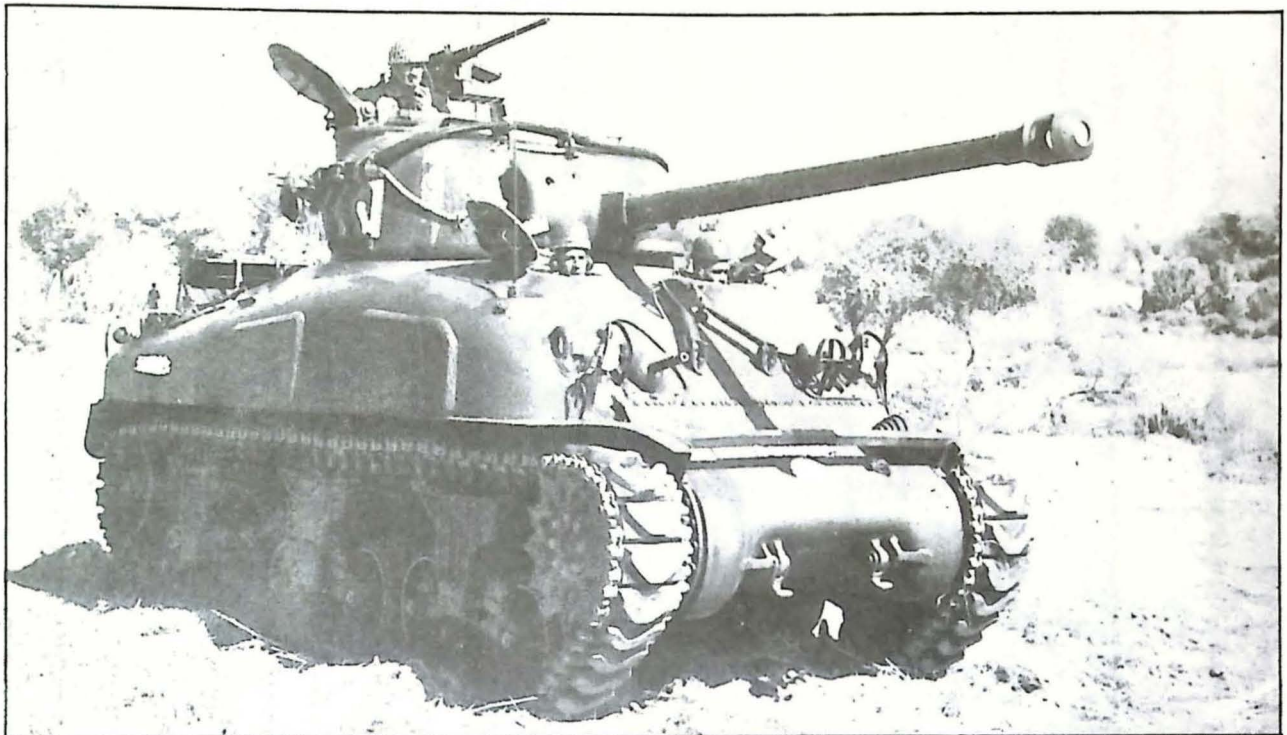

ٹیک اوور کی رات آرمی کا ٹینک پرائم منسٹر ہاؤس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہے۔

چھٹا باب

ڈراؤنے ماحول میں مذاکرات

پھر ملک پر
طویل اندھیری رات
مسلط ہو گئی

ادیب جادوانی معراج محمد خان سے انٹرویو کر رہے ہیں ۔

۳ر جولائی کی رات کو وفاقی کابینہ کا ایک ایسا غیر معمولی اجلاس ہوا جس میں چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کے ساتھ ساتھ تینوں مسلح افواج کے سربراہ اور انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل بھی شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کابینہ کے اس اجلاس کے بعد اور اس رات سے ذوالفقار علی بھٹو کے رویّہ میں نمایاں تبدیلی رُونما ہوئی۔

اس رات قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم جب بات چیت کے لئے پرائم منسٹر ہاؤس پہنچی تو مذاکرات ایسے ماحول میں ہوئے جو خاصا ڈراؤنا ماحول تھا۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کے مشاہدہ کے مطابق ۳ر جولائی کو نکات پیش کرنے کے لئے جو اجلاس ہوا اس میں بھٹو صاحب تھکے ماندے، دبے دبے اور مضمحل نظر آرہے تھے۔ ان میں جارحیت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تاہم ۴ر جولائی کو صبح سویرے بھٹو نے ایک کانفرنس طلب کی اور اس میں اعلان کیا کہ قومی اتحاد نے پھر کچھ نئے نکات پیش کر دئے ہیں حالانکہ معاہدہ طے پا چکا تھا اور ۴ر جولائی کو اس پر صرف دستخط ہونا تھے۔ بھٹو نے کہا کہ مجھ پر معاہدہ سے انحراف کا الزام لگایا جاتا ہے حالانکہ وہ خود معاہدہ سے منحرف ہو رہے ہیں۔

یہ پریس کانفرنس بھٹو نے بڑی عجلت میں طلب کی تھی تاکہ اتحاد کے پیش کردہ دس نکات سے عوام کو آگاہ کر دیا جائے انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک بار معاہدہ طے پانے کے بعد اس پر از سرِ نو غور نہیں ہو سکتا۔

بھٹو نے یہ الزام بھی لگایا کہ قومی اتحاد میں "لیڈروں کے ساتھی" طے شدہ باتوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں تو پھر یہ جان لیجئے کہ میری کابینہ کے ارکان اور وزرائے اعلیٰ بھی اس معاہدہ پر رضامند نہیں۔ گویا

'معاہدہ' نے معاہدہ کو سبوتاژ کر ڈالا تھا اور 'فاختائیں' ناکام ہو گئی تھیں،

تاہم آئین و جمہوریت کو بچانے کے لئے دونوں طرف سے کوششیں جاری رہیں البتہ یہ فرق ضرور پڑا کہ تفصیلات طے

کرنے میں وقت ضائع ہوتا رہا اور پھر ــــــ بالآخر مارشل لار آگیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس رات اگر مارشل لاء نہ لگتا تو ۵ رجولائی معاہدہ کی تاریخ ہوتی۔ مارشل لاء کی تاریخ نہیں۔

مذاکرات کی طوالت سے تنگ آکر کچھ اخبارات نے مشورہ دیا تھا کہ تمام لیڈروں کو کسی عمارت میں بند کر دیا جائے اور جب تک وہ کوئی سمجھوتہ نہ کریں، انہیں باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ چنانچہ جب مارشل لاء نافذ ہوا اور قومی اتحاد و پیپلز پارٹی کے لیڈر گرفتار کرکے لائے گئے تو ابتدا میں یہی گمان ہوا کہ جرنیلوں نے پریس کا "مشورہ" قبول کر لیا ہے۔

یہ امر طے شدہ ہے کہ بھٹو کابینہ میں معاہدہ پر اختلافات تھے، تاہم کابینہ کے ارکان کی اکثریت معاہدہ کے حق میں تھی اور وہ چاہتے تھے کہ مذاکرات نتیجہ خیز ہوں ــــــ لیکن دوسرے ارکان جن میں حفیظ پیرزادہ نمایاں تھے، مصالحت کے خلاف تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سخت رویہ اپنایا جائے تو احتجاجی تحریک دم توڑ دے گی جبکہ نرم رویہ سے اتحاد اور مضبوط ہوگا۔

قومی اتحاد میں بھی معاہدہ پر اختلافات تھے، اس کے بعض رہنماؤں کا رویہ پُراسرار تھا اور معنی خیز بھی ــــــ خصوصاً اصغر خاں شیرباز مزاری اور نسیم ولی خاں کا رویہ ــــــــــ

شدید اختلافات کے ساتھ مذاکرات کے اِس دَور میں جنرل ضیاء الحق نے انتہا درجہ کی فنکارانہ اداکاری اور عیاری سے بھٹو کو یہ یقین دلائے رکھا کہ وہ، چیف آف سٹاف کی حیثیت سے، بھٹو کے ساتھ ہیں اور اُن کے وفادار ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنی چھاتی پر دونوں ہاتھ رکھ کر حلفیہ انداز میں بھٹو سے کہا "ہم پر اعتماد کیجئے، ہم آپ کے مضبوط بازو ہیں"

جنرل چشتی اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ اُن دنوں جنرل ضیاء الحق نے بڑی عیارانہ اداکاری کا کامیاب مظاہرہ کیا ورنہ خود جنرل چشتی کو یہ ڈر تھا کہ اگر فوج کے منصوبے کا بھید کھُل گیا تو اُن کی خیر نہیں مگر ضیاء الحق نے ایسی کامیاب اداکاری کی کہ بھٹو جیسا زیرک سیاستدان بھی غچہ کھا گیا۔

جنرل ٹکا خاں نے بھی "مُون ڈائجسٹ" کو ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے ۲ رجولائی کو بھی ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ پھر ۴ رجولائی کو کونسی قیامت آگئی تھی کہ انہیں مارشل لار نافذ کرنے کی ضرورت پڑی؟

۲ رجولائی کو کابینہ کے ایک اجلاس میں جنرل ٹکا خاں کے علاوہ جنرل ضیاء الحق اور اُن کے کور کمانڈر بھی شریک ہوئے تھے۔ کابینہ کے اس اجلاس میں ایک وزیر نے سوال اٹھایا:۔

"سنا ہے فوج میں ملک کی سیاسی صورتِ حال پر کچھ بے چینی ہے" اس پر جنرل ضیاء الحق نے کہا تھا:۔

"Sir we are your strong arms, we will go whole heartedly with you. we will support you upto the hilt"

(جنابِ عالی! ہم آپ کے مضبوط بازو ہیں۔ ہم پورے دل سے آپ کے ساتھ چلیں گے۔ ہم آخری حد تک آپ کی حمایت کریں گے۔)

یہ الفاظ جنرل ضیاء الحق نے ۲ رجولائی کو ساڑھے چار بجے شام کابینہ کے خصوصی اجلاس میں کہے تھے۔ سب نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ یہ

الفاظ سچے دل سے کہہ رہے ہیں، مگر اگلے ہی روز انہوں نے ٹیک اوور کر لیا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ جنرل صاحب کے یہ الفاظ پیش بندی کی غرض سے صریح جھوٹ پر مبنی تھے۔

یہ امر آج تک بہت سے لوگوں کے لئے حیرت کا موجب ہے کہ بھٹو ان حالات کو کیوں نہ تاڑ سکا جو دوسرے لوگوں نے واضح طور پر محسوس کر لئے تھے اور حد یہ کہ بھٹو کو اُن سے آگاہ بھی کیا تھا۔ مثال کے طور پر رفیع پیرزادہ نے بھٹو پر امریکی منصوبہ آشکار کر دیا تھا اسی طرح معراج محمد خاں نے فوجی جرنیلوں میں "بھٹو کے دشمن" کو دیکھ لیا تھا اور اس سے بھٹو کو آگاہ بھی کر دیا تھا مگر اس کے نتیجہ میں معراج محمد خاں کو قید ملی۔

پھر یہ امر بھی باعثِ تعجب ہے کہ بھٹو جیسا تجربہ کار سیاستدان خود اپنے ہی ساتھیوں کو نہ "پڑھ" سکا۔ حفیظ پیرزادہ اس کی ایک مثال ہیں تو دوسری مثالوں میں مولانا کوثر نیازی اور خود ضیاء الحق آتے ہیں۔ اس کے برعکس بھٹو نے ان لوگوں کے مشوروں کو مان کر یا اُن کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی کی اور اس کے نتیجہ میں اتنی تاریک گھناؤنی رات آئی جس کی صبح دیکھنے کے لئے اس قوم کو گیارہ سال تک انتظار کرنا پڑا۔ چار پانچ جولائی کی درمیانی رات کو ایک بجے کے لگ بھگ جرنیلوں نے اپنی کارروائی کا آغاز کیا اور چند لمحوں میں اقتدار کی بساط الٹ دی ـــــ اس سے پاکستان ایک ایسی تاریک سرنگ میں داخل ہو گیا جس کا کوئی سرا سالہا سال تک دستیاب نہ تھا اور بقول بھٹو ـــــ "اس سرنگ کے خاتمہ پر بھی کوئی روشنی نہیں۔ بلکہ اس سے آگے ایک اور سرنگ شروع ہونے والی تھی" اور بھٹو کی اس پیش گوئی کے سلسلے میں فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی میعاد ختم ہو گئی ہے یا باقی ہے؛ اور کیا اب کوئی دوسری سرنگ شروع ہونے والی ہے؛

الوداع ـــ الوداع ـــ اے بہادرو !

ساتواں باب

پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو کی آخری رات

الوداع !

اقتدار کی خونیں بہارو

الوداع !

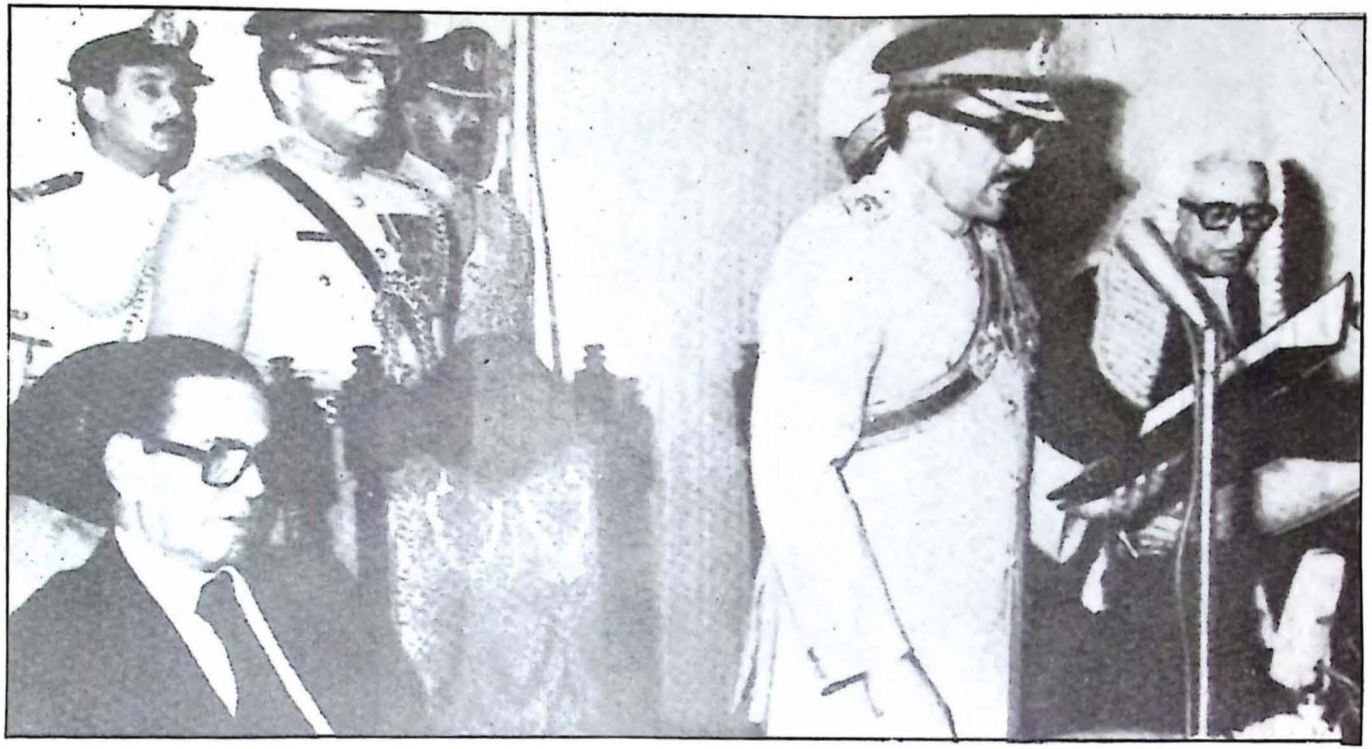

جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھا رہے ہیں ان کے ساتھ سابق صدر فضل الٰہی چوہدری بیٹھے ہیں

۴ر جولائی کی خاموش، پُراسرار رات کا گھمبیر سناٹا، فوجی بُوٹوں کی دھمک اور بکتر بند گاڑیوں کے شور سے ٹوٹ چکا تھا۔ اسلام آباد کی پُرسکون آبادی میں ایک تلاطم سا برپا ہوگیا۔ فوجی جیپیں مختلف وزیروں اور افسروں کی رہائش گاہوں کے سامنے رُکتیں، مشین گنیں، رائفلیں تانے ہوئے فوجی جوان کُود کر جیپوں سے باہر آتے اور وزیر یا افسر کی رہائش گاہوں پر زوردار دستکیں شروع ہو جاتیں۔ بعد ازاں بچوں کی چیخوں اور عورتوں کی آہ و بکا کے درمیان کسی وزیر یا افسر کو گھر سے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا جاتا اور کسی نامعلوم منزل کی طرف بھیج دیا جاتا۔

رات کے دس بجے "آپریشن فیئر پلے" کا آغاز ہوگیا تھا اور لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی اس آپریشن کی بنفسِ نفیس نگرانی کر رہے تھے۔ نصف رات کے لگ بھگ پرائم منسٹر ہاؤس میں ٹیلی فونوں کی گرین لائن، ہاٹ لائن اور عام لائن پر کالوں کی بھرمار ہو چکی تھی۔ وزراء اور افسروں کی بیویاں یا دوسرے عزیز وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو بتانا چاہتے تھے کہ فوجی اُن کے خاندان کے سربراہ کو پکڑ کر نامعلوم کہاں لے گئے ہیں؛

پرائم منسٹر ہاؤس میں وزیرِ اعظم کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل امتیاز فوجی دستوں کی غیر معمولی نقل و حرکت کو بہت پہلے نوٹ کر چکے تھے۔ ٹیلی فون کالوں کے ذریعہ "فریادوں" کی بھرمار ہوئی تو انہوں نے براہِ راست چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق سے دریافت کیا "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا چکر ہے؟"

جنرل ضیاء الحق نے بڑے دھیمے اور پُرسکون لہجہ میں جواب دیا "یہ سب کچھ میرے حکم پر ہو رہا ہے اور تم ہدایات حاصل کرنے کے لئے فوراً میرے پاس چلے آؤ۔"

اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ جنرل ضیاء الحق بذاتِ خود جنرل ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے تھے اور "آپریشن فیئر پلے" کے رنگ ڈھنگ کا جائزہ لے رہے تھے۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں اب عام ایکس چینج کے ٹیلی فونوں کی لائنیں کاٹ دی گئی تھیں تاہم گرین لائن اور ہاٹ لائن بدستور کام کر رہی تھیں کہ وہ خود کار تھیں اور فوجیوں کا اُن پر کوئی اختیار نہیں تھا۔

میجر جنرل امتیاز "ہدایات" لینے جا چکے تھے اور اب گرین و ہاٹ لائنوں پر وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو خود موجود تھے۔ اسی لمحے ممتاز بھٹو نے وزیرِ اعظم سے رابطہ قائم کیا وہ نصف رات کے لگ بھگ پرائم منسٹر ہاؤس سے اپنی رہائش گاہ کی طرف گئے تھے تو راستہ میں فوجی جوانوں کی کارروائیوں کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ انہوں نے بھٹو کو اس سے مطلع کیا۔ بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی بھٹو کو یہی اطلاعیں موصول ہوئی تھیں اُن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ تخت کا تختہ ہو گیا ہے!

ذوالفقار علی بھٹو نے مزید وقت ضائع کئے بغیر براہِ راست چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق کو فون کیا، اسے وہ "اپنا آدمی" سمجھتے تھے کیونکہ کئی جرنیلوں سے اوپر نکال کر بھٹو نے جنرل ضیاء کو فوج کا سب سے بڑا عہدہ کمانڈر انچیف دیا تھا۔ وہ ضیاء کے "محسن" سمجھے جا سکتے تھے اور پھر ـــــ چند گھنٹے پہلے تک جنرل ضیاء بھٹو کو یقین دلا رہے تھے کہ وہ اُن کے (بھٹو کے) وفادار ہیں اور فوج بھٹو کے ساتھ ہے۔

جی ایچ کیو میں جنرل ضیاء نے بھٹو کا فون ریسیو کیا جو پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ جواب میں جنرل ضیاء الحق نے بڑے اطمینان سے کہا "سر ـــ دوسرا کوئی راستہ باقی نہ رہا تھا۔ آپ یقیناً سمجھتے ہیں کہ یہی ایک چارۂ کار تھا ـــــ فوج نے حکومت سنبھال لی ہے اب آپ ہم سے تعاون کیجئے، وگرنہ ہمیں طاقت استعمال کرنا پڑے گی۔"

"آئینی طور پر تو میں بدستور وزیرِ اعظم ہوں" بھٹو نے کہا "اور آپ جانتے ہیں کہ آئین کو ٹیک اوور کرنا کتنا بڑا ـــ"

"میں سب جانتا ہوں" ضیاء الحق نے جواب دیا "آپ ہمیں طاقت استعمال کرنے پر مجبور نہ کریں۔"

"نہیں۔ یہ نوبت اس لئے نہیں آئے گی کہ میرے پاس طاقت ہے کہاں؟" بھٹو نے جواب دیا "طاقت تو فوج ہوتی ہے۔ بہرحال ـــ اب یہ بتلایئے کہ آپ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں؟"

"صرف یہ کہ آپ کو حراست میں لیا جائے گا۔ صبح تک چک لالہ میں رکھیں گے پھر مری لے جائیں گے" جنرل نے جواب دیا۔

"میرے بیوی بچے آج رات ہی اسلام آباد پہنچے ہیں۔ مذاکرات کی مصروفیات میں، میں اُن سے بات بھی نہیں کر سکا۔ کیا آج رات کے لئے میں ـــــ"

"ٹھیک ہے" ضیاء الحق فوراً سمجھ گئے "آپ یہ رات آرام سے پرائم منسٹر ہاؤس ہی میں گزاریں اور کل مری کے لئے تیار ہو جائیں۔"

"شکریہ" بھٹو نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اور اب وہ سوچوں میں غرق تھے ـــــ وہ کیا غلطیاں تھیں ان سے سرزد ہوئیں اور جن کا نتیجہ مارشل لاء کی صورت میں نکلا؟

کیا مذاکرات کی طوالت ہی اُن کی غلطی تھی ؟

لیکن مذاکرات یک طرفہ تو نہیں ہوتے ، دوسرا فریق بھی ہوتا ہے اور ان مذاکرات کا دوسرا فریق تصفیہ کے قریب پہنچتے ہی کوئی نیا شوشہ ، کوئی نیا مسودہ لے آتا تھا — کسی جواز کے بغیر محض اپنے ایجی ٹیشن کی طاقت کے بل بوتے پر وہ حکومت میں شرکت ، بلکہ حکومت پر سپر حکومت (سپریم کونسل) کا قیام چاہتا تھا — اس کا کیا علاج تھا ؟

پھر یہ بھی امر واقعہ تھا کہ مارشل لاء کا آغاز تو منتخب یا آئینی وزیر اعظم نے خود کر دیا تھا ۔ بڑے بڑے شہروں میں بھٹو کے حکم پر مارشل لاء نافذ ہوا تھا — کیا یہ غلطی تھی ؟ کیا سول حکومت امن وامان کی بحالی کے لئے فوج کو طلب نہیں کر سکتی ؟

پھر یہ حقیقت بھی حیرت انگیز تھی کہ مارشل لاء لگ جانے اور فوج آجانے کے باوجود ایجی ٹیشن نہیں رکا تھا بلکہ اس میں اور تیزی آئی تھی اور اس کی وجہ فوج کی طرف سے مظاہرین کی حوصلہ افزائی تھی ۔ اس کے تحت فوجی گولیاں تو چلاتے تھے مگر کوئی شخص اُن گولیوں سے زخمی نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ ہوائی فائر ہوتے تھے ۔

مزید برآں کئی مقامات پر تو فوجیوں نے گولی چلانے سے ہی انکار کر دیا تھا مگر حکم عدولی پر اُن کا کورٹ مارشل بھی نہیں ہوا تھا ۔ عین سامنے کے ان حقائق سے بھٹو نے آنکھیں کیوں بند کر لی تھیں ؟

وہ رات ، بھٹو کے انتہائی اضطراب اور بے چینی کی رات تھی ۔ یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ کسی لمحے کوئی فرد اندر آئے اور انہیں گولی کا نشانہ بنا دے ——— اگر مہم جو افراد ، موت کی سزا کے باوجود آئین کو اپنے ہاتھ میں لے کر مارشل لاء نافذ کر سکتے تھے تو پھر اور کیا نہیں ہو سکتا تھا ؟

بے چینی کے ان لمحات میں صرف نصرت بھٹو انہیں دلاسہ دیتی رہیں کہ "ضیاء الحق" خود انہی کا "پروردہ" ہے وہ کسی انتہا تک نہیں جائے گا اور بہر حال اپنے محسن کا خیال رکھے گا ۔ خود بھٹو کو ضیاء الحق سے امید نہ تھی کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھائے گا ۔ وہ جو نرم گو ، ملنسار ، جھک کر آداب بجالانے والا وفادار تھا وہ اپنی "ترقی" کو یک لخت فراموش کیسے کر دے گا ؟

بے شک ضیاء الحق بھٹو کے احسان کو فراموش نہ کرتا لیکن مارشل لاء صرف ضیاء الحق کا منشاء نہیں تھا ، اس کے نفاذ میں کچھ اور پُر اسرار ہاتھ بھی کام کر رہے تھے اور وہ "ہاتھ" چاہتے تھے کہ بھٹو کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے ۔ قومی اتحاد نے جس "لانگ مارچ" کا اعلان کیا تھا ، اس کے بہانے وفاقی دارالحکومت میں فوجی دستے جمع کرنے کا اچھا موقع اور خوب بہانہ مل گیا تھا ۔ بھٹو سے کہا گیا تھا کہ آپ کی حفاظت کے لئے فوج تعینات کی جا رہی ہے ، لیکن کیا جنرل ٹکا خاں جو بھٹو کابینہ میں وزیر دفاع بھی تھے ، اِن تمام حالات ومعاملات سے یکسر بے خبر رہے ؟

بارہا ایسے واقعات بھی رُونما ہوئے تھے کہ فوجی جرنیلوں نے بھری محفلوں میں وزیر اعظم کو وارننگ دی کہ دوبارہ الیکشن کرائے جائیں ورنہ فوج ٹیک اوور کرلے گی ——— اس نوع کی وارننگ کسی حکومت کے سربراہ کو عام حالات میں دی جاتی تو وہ لازماً سخت ایکشن لے سکتا تھا مگر بھٹو نے خاموشی اختیار کی —— کیوں ؟ کیا بھٹو جرنیلوں کے ہاتھوں بے بس ہو گیا تھا ؟ یا حالات اتنے بگڑے ہوئے تھے کہ اُسے فوجی کمانڈروں کی تمام باتیں برداشت کرنا پڑ رہی تھیں ؟

اِن حالات کو ایک اور رُخ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جو نیا اور انوکھا ضرور محسوس ہوگا مگر کوئی انہونی بات نہیں یہ کہ بھٹو کو یقیناً سب کچھ معلوم تھا کہ حالات کس طرف جا رہے ہیں ـــــ بھٹو کو خبر تھی کہ جرنیل کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔

حزبِ مخالف سے سیاسی مذاکرات میں جرنیلوں کی شرکت پر مخالف رہنماؤں نے تو اعتراض کیا مگر بھٹو انہیں نہ روک سکا بلکہ یہ کہہ کر انہیں میٹنگ رُوم میں طلب کر لیا کہ،

"وُہ تو ملحقہ کمرہ میں آئے بیٹھے ہیں، آپ اُن سے بات کریں"

پھر جنرل ضیاء الحق کی سیاسی گفتگو پر نواب زادہ نصراللہ خاں نے تو ضیاء کو ٹوکا مگر بھٹو نے نہیں ـــ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

وفاقی کابینہ کی میٹنگوں میں جنرل چشتی اکثر شریک ہوتے تھے اور ان کا کہنا ہے "میں خود نہیں جاتا تھا مجھے بھیجا جاتا تھا"

حد یہ ہے کہ پیر پگارا کو بھی یہ علم تھا کہ آج فوج "ٹیک اوور" کر رہی ہے لیکن بھٹو کو یہ علم کیوں نہیں تھا؛ حالات یہی ظاہر کرتے ہیں کہ بھٹو کو سارے معاملات کی خبر تھی مگر چارہ کار کوئی نہیں تھا۔ بے بسی کے اُس عالم میں بھٹو نے یہی بہتر سمجھا ہوگا کہ فوج ٹیک اوور کرلے!

پرائم منسٹر کو پرائم منسٹر ہاؤس میں رات گزار لینے کی اجازت تو مل گئی لیکن اس اجازت سے "آپریشن فیئر پلے" کو عملی جامہ پہنانے والوں کے لئے شدید مشکلات پیدا ہو گئیں ـــــ کیونکہ انہیں یہ خطرہ تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو، غچّہ دے کر، حصار سے نکل نہ جائے اور ایک فرد کے لئے آج کے دَور میں یہ کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا اور اگر بھٹو اس رات پرائم منسٹر ہاؤس سے بچ نکلتا تو "آپریشن فیئر پلے" ناکام تھا۔

"آپریشن فیئر پلے" کے انچارج جنرل چشتی کا دعویٰ ہے کہ اگر جنرل ضیاء اس رات بھٹو کو مری لے جانے کی اجازت دے دیتے تو دوسری صبح اسلام آباد میں ایک بھی فوجی سپاہی رکھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جس سے خطرہ تھا وہ قابو آ چکا تھا ـــــ

جنرل چشتی بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اس "آپریشن" کو بڑی کامیابی سے مکمل کیا اور حکومت کا تختہ الٹنے کے اس عمل میں کسی کو خراش تک نہیں آنے دی، کوئی پرندہ بھی نہیں مرا۔ ذوالفقار علی بھٹو چاہتے تو عورت کے بھیس میں کسی ملازم کے رُوپ میں بھیس بدل کر، وگ لگا کر پرائم منسٹر ہاؤس سے فرار ہو سکتے تھے جیسا کہ عراق کے وزیرِ اعظم نُوری السعید فرار ہوئے تھے (یہ الگ بات ہے کہ عورت کے بھیس میں وہ بعد میں پکڑے گئے اور مارے گئے)۔ بہرحال پرائم منسٹر ہاؤس کو گھیرے میں لینے والے نوجوانوں نے کڑی نظر رکھی اور نہ تو کسی کو اندر جانے دیا اور نہ باھر نکلنے دیا ـــ جنرل چشتی نے مجھے بتایا کہ

بھٹو کو پرائم منسٹر ہاؤس رات گزار لینے کی اجازت یقیناً خطرناک تھی کیونکہ بیشک ساری کابینہ کو قابو کر لیا لیکن اگر وزیرِاعظم نکل جاتے تو آپریشن ناکام ہے ـــــ اور اس کے بعد طرّی ہائی کمان کے ساتھ کیا ہوتا؛ اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے اور واقعی یہ جان کی بازی لگانے کی بات تھی۔ مزید برآں پرائم منسٹر ہاؤس میں اگر کوئی ایسا شخص داخل ہو جاتا جو بھٹو کو نقصان پہنچا سکتا یا شوٹ کر دیتا ـــ اس صورت میں بھی معاملات دگرگوں تھے خصوصاً محاصرہ کرنے والوں کے لئے ـــــ

اس وقت پرائم منسٹر ہاؤس میں باہر سے جانا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ کیونکہ محاصرہ کرنے والے جرنیل یا بڑے فوجی افسر نہیں بلکہ عام فوجی اور افسر تھے۔ اس سطح کے فوجی براہِ راست جرنیلوں کے شکل آشنا نہیں ہوتے چنانچہ کوئی بھی شخص صرف جرنیل کی وردی پہن کر اندر جا

سکتا تھا۔ فوجیوں کو کیا پتہ چلتا کہ وہ کون ہے؟ وہ تو وردی کو دیکھتے، سیلوٹ مارتے اور اُسے اندر جانے دیتے ——— ایسا شخص اندر جاکر بھٹو کو ہلاک بھی کر سکتا تھا اور اپنے ہمراہ لے کر باہر بھی نکل سکتا تھا ——— فوجی یہی سمجھتے کہ اسے جی ایچ کیو لے جایا جا رہا ہے ——— لیکن اُس رات نہ کوئی اندر جا سکا نہ باہر آسکا ——— کسی کو اندر جانے کا اختیار حاصل نہیں تھا، سوائے جنرل چشتی کے ——— لیکن جنرل چشتی نے کوئی زحمت نہیں کی۔

جنرل چشتی کو تو یہ اختیار بھی تھا کہ جسے چاہیں گولی مار دیں، جان سے مار ڈالیں، مزاحمت کرنے والے کو شوٹ کر دیں ——— لیکن یہ کریڈٹ بہر حال جنرل چشتی کو جاتا ہے کہ انہوں نے کسی کو خراش کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جنرل چشتی نے جیل کی کال کوٹھری میں بھٹو پر تشدد کیا۔ جنرل چشتی کا کہنا ہے کہ بھٹو سے میری کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی اور اگر ہوتی تو میں اُسے اُسی رات کیوں نہ پورا کرتا جب میرے پاس "جسے چاہوں شوٹ کر دوں" کا اوپن چیک موجود تھا۔ کوئی جرنیل اتنا گرا ہوا نہیں ہوتا کہ وہ قیدی پر تشدد کرے، مرے ہوئے کو جاکر مارے!

یہاں یہ انکشاف بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ جنرل چشتی کو جب "آپریشن فیئر پلے" کا آرڈر ملا تو جنرل ضیاء الحق نے چشتی سے کہا کہ بھٹو خاندان کا کام تمام کر دیا جائے ——— چنانچہ جنرل چشتی کے الفاظ میں؛

"میں چاہتا تو بھٹو خاندان کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور اس کی وجہ سے جنرل ضیاء الحق سے میرے اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بھٹو کے مقدمہ کی سماعت کے دوران جنرل ضیاء نے مجھ سے کہا،

"کتنا اچھا ہوتا اگر آپ اُس رات یہ سارا جھگڑا ہی مٹا دیتے، سب کا کام کر دیتے۔"

جنرل چشتی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ آج بھٹو خاندان اگر زندہ ہے تو صرف میری وجہ سے ———

یہ بات جنرل چشتی نے آج نہیں بلکہ جنرل ضیاء الحق کی زندگی اور عہدِ اقتدار میں بتائی تھی۔ "مون ڈائجسٹ" نے اُن کا پورا انٹرویو تو شائع کر دیا لیکن راقم نے اس بات کو اس لئے گول کر دیا کہ اس سے "مون ڈائجسٹ" اور خود راقم الحروف کی بقا کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ قبل ازیں "مون ڈائجسٹ" کے کئی شمارے ضبط ہو چکے تھے۔ اب شماروں کے ساتھ خود میں "ضبط" نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا کہ اپنے آپ پر آفتوں اور بلاؤں کو نازل ہونے کی "دعوت" نہ دی جائے۔ چنانچہ جنرل چشتی کے انٹرویو کا یہ حصہ دانستہ روک لیا گیا، جسے آج ظاہر کیا گیا ہے۔

۵ جولائی کو ذوالفقار علی بھٹو کو حراست میں لینے والے بریگیڈیر امتیاز اللہ وڑائچ کو جنرل ضیاء الحق اور جنرل کے ایم عارف نے تین ماہ پہلے (یعنی اپریل میں) چیف آف آرمی سٹاف کے دفتر میں بلا کر کہا تھا کہ تمہیں بھٹو کو گرفتار کرنا ہوگا ——— اس کے لئے امتیاز اللہ وڑائچ تین ماہ تک منصوبہ بندی کرتا رہا۔ تاہم اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ دن اور وقت کا تعین وہ لوگ خود کریں گے۔ بالآخر وڑائچ کو ۴-۵ جولائی کی درمیانی رات کا وقت دیا گیا۔ چونکہ ضیاء الحق نے بھٹو کو رات پرائم منسٹر ہاؤس میں گزارنے کی اجازت دے دی تھی اس لئے گرفتاری ۵ جولائی کو عمل میں آئی اور پرائم منسٹر ہاؤس میں اس ایکشن کی سربراہی بریگیڈیر امتیاز اللہ وڑائچ نے کی۔

مزید برآں جنرل چشتی کو "یہ حکم" بھی ملا تھا کہ مارشل لاء کا مقصد صرف اور صرف بھٹو کو ختم کرنا ہے ——— چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اس مارشل لاء

نے سوائے بھٹو کی پھانسی کے اور کوئی بھی کام انجام نہیں دیا بلکہ پورے ملک کو "ایڈھاک ازم" پر چلانے کی کوشش کی کیونکہ ان لوگوں کو "حکم" ہی ملا تھا۔

بریگیڈیئر امتیاز اللہ وڑائچ نے ۵ رجولائی کی صبح کو ذوالفقار علی بھٹو سے جاکر کہا کہ آپ کی وزارتِ عظمیٰ کا دور ختم ہوا۔ فوج نے حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے اور اب آپ ہماری حراست میں ہیں' اس لئے چلنے کو تیار ہو جائیں۔ وڑائچ نے رات کو بھٹو سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ آپ کہیں باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ پرائم منسٹر ہاؤس سے باہر نکلنے والے کسی بھی فرد کو گولی کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ کسی مزاحمت کی ضرورت نہیں۔ شوق پورا کرنا ہو تو زندگی کا داؤ لگا کر دیکھ لیجئے۔

جواب میں بھٹو نے کہا کہ راولپنڈی کے کور کمانڈر جنرل چشتی سے میری بات کرادیں، میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔

بریگیڈیئر امتیاز اللہ نے جنرل چشتی سے رابطہ قائم کرکے انہیں بھٹو کی خواہش سے آگاہ کیا لیکن چشتی نے یہ ملاقات مناسب نہ سمجھی۔ انہیں ایک تو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق سے وفاداری ملحوظ رکھنے کا خیال تھا۔ دوسرے لاشعوری طور پر بھٹو کی شخصیت کا جلال و دبدبہ چشتی کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ کابینہ کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کرتے رہے تھے۔ بھٹو کی شخصیت کا سحر بہرحال اُن پر طاری تھا اور انہیں خدشہ تھا کہ بھٹو انہیں کسی "دوسری سمت" نہ موڑ دیں چنانچہ انہوں نے ملاقات سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ مارشل لاء کے باعث انہیں بے پناہ مصروفیات ہیں۔ بریگیڈیئر امتیاز اللہ وڑائچ، بھٹو اور چشتی کے درمیان رابطہ کا ذریعہ تھے۔ بالآخر بھٹو نے انہی کے ذریعہ جنرل چشتی کو پیغام دیا۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنے "آپریشن" کی ناکامی کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لئے تمام پیش بندیاں پہلے سے کر رکھی تھیں۔ حالانکہ اُن کے ساتھی جرنیلوں میں سے کسی بھی دوسرے فرد نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ آرمی ہاؤس میں ۴ رجولائی کی رات کو ایک ہیلی کاپٹر "پرواز کے لئے تیار" کھڑا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر جنرل ضیاء الحق نے اپنے لئے کھڑا کر رکھا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جنرل صاحب نے اس اقدام سے پہلے اپنے بال بچوں کو بھی بیرون ملک لندن بھیج دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ اُن کی چہیتی بیٹی زین کے دل کا آپریشن ہے اور یہ آپریشن بھی خصوصیت سے ان دنوں میں رکھا گیا تھا جن دنوں وہ خود اپنا "فوجی آپریشن" کرنے والے تھے۔ زین کے دل کے آپریشن کے نام پر اپنے خاندان کو پاکستان سے اس لئے بھیجا گیا کہ فوجی آپریشن پر کسی کو شک و شبہ نہ ہو۔

یہ قدم اٹھانے سے پہلے جنرل صاحب نے حسبِ معمول و حسبِ روایت و حسبِ سابق استخارہ بھی کرلیا تھا۔ اس کے باوجود ان کا دل مطمئن نہ تھا یا ضمیر کی کوئی خلش تھی جو اپنے ہی محسن "کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی پر اندر سے کھائے جارہی تھی۔ وہ سخت بے چین و مضطرب تھے اور مسلسل دعائیں مانگ رہے تھے کہ "آپریشن فیئر پلے" کامیاب ہو جائے۔ اپنے دفتر میں ٹیلی فون کے قریب ہی انہوں نے مصلّٰے بچھالیا تھا اور تسبیح کے دانے "شمار" کرنے لگے تھے۔

انہیں یہ خدشہ بھی لگا تھا کہ پرائم منسٹر ہاؤس سے ریکارڈ کی بعض اہم دستاویزات کو بھٹو ضائع نہ کردے یا انہیں پی ایم ہاؤس سے باہر بھیجنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اس کی روک تھام کے لئے انہوں نے اگرچہ تمام انتظامات کرلئے تھے اور پی ایم ہاؤس کو محاصرہ میں لینے والے فوجیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ سب سے پہلے پی ایم ہاؤس کے دفاتر پر قبضہ کریں اور پھر اس کی سختی سے نگرانی کریں کہ وہاں سے کوئی ریکارڈ

مسعود محمود حراست کے دوران

اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے اور نہ ہی بھٹو دفتر میں داخل ہونے پائے۔

بھٹو نے یہ کوشش ہی نہیں کی ورنہ میں ممکن تھا کہ اسی رات "مزاحمت" کے الزام میں اُن کا پتہ کاٹ دیا جاتا۔

بہرحال تسبیح و استخارہ اور دعاؤں کے باوجود جنرل ضیاء کی بے چینی کسی طور ختم نہ ہو رہی تھی۔ انہوں نے سکون و اطمینان کا سانس اس وقت لیا جب جنرل چشتی نے آکر اُن سے کہا:

"پیر و مرشد سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تمام رہنما گرفتار کر لئے گئے ہیں اور تمام اقدامات آپ کے حکم کے مطابق مکمل ہو گئے ہیں"

خیال رہے کہ چشتی صاحب جنرل ضیاء کو پیر و مرشد، یا مرشد کہہ کر مخاطب کرتے تھے ——

تب جا کر اُن کے چہرے پر مسرت کی چمک ابھری۔ انہوں نے سکھ کا سانس لیا اور کامیاب آپریشن پر چشتی کو مبارکباد دی ——

اس رات فوج نے برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت سے سرکاری افسروں کو بھی حراست میں لیا۔ بعد میں جن حکام نے، فوجیوں سے تعاون کا وعدہ کیا انہیں چھوڑ دیا گیا لیکن کئی ایسے بھی تھے جو اُس حراست میں دم توڑ گئے۔ حامد جلال ایسے ہی ایک افسر تھے وہ وزیرِ اعظم کے سیکرٹریٹ میں انفارمیشن کے شعبہ میں کام کرتے تھے۔ دل کے مریض تھے، حراست میں وہ جاں بحق ہو گئے۔

فوجی جب جنرل ٹکا خاں کو گرفتار کرنے گئے تو انہوں نے گرفتاری میں کچھ لیت و لعل سے کام لیا، گرفتاری کے لئے آنے والے کیپٹن سے جنرل ٹکا خاں نے دریافت کیا "یہ 'کُو' نیچے سے ہوا ہے یا اُوپر سے؟" (مطلب یہ کہ جرنیلوں نے انقلاب برپا کیا ہے یا عام افسروں نے۔) کیپٹن بے چارہ اس سوال کا جواب کیا دیتا۔ وہ خاموش رہا تو جنرل ٹکا خاں نے کہا:۔

"دیکھو۔ میں تمہارا کمانڈر انچیف رہا ہوں۔ فوج کا سب سے بڑا عہدیدار۔ تم مجھے کیوں گرفتار کرنے آئے ہو۔ تمہیں کچھ خیال کرنا چاہیئے۔ میں کوئی معمولی فرد نہیں۔ میں جرنیل رہا ہوں۔ میں نے پاکستان کی جنگیں لڑیں اور فتوحات حاصل کی ہیں۔ بس لحاظ سے میرے کچھ حقوق ہیں۔ تمہیں احساس ہونا چاہیئے کہ تم کس کے پاس آئے ہو——!"

دراصل جنرل ٹکا خاں کو یہ زعم تھا کہ فوج انہیں گرفتار نہیں کرے گی کیونکہ وہ تو خود فوج سے وابستہ رہے ہیں۔

جنرل ٹکا خان کے گرفتاری سے انکار پر فوج کے کیپٹن نے "آپریشن فیئر پلے" کے انچارج جنرل فیض علی چشتی سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بتایا کہ جنرل ٹکا خان گرفتاری نہیں دینا چاہتے، ان حالات میں کیا کیا جائے؟

جنرل چشتی نے کیپٹن سے کہا "جنرل سے کہو کہ وہ عزت و احترام سے گرفتاری پیش کر دیں، اسی میں ان کا وقار ہے"

بالآخر جنرل ٹکا خان نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔

چار پانچ جولائی کی وہ درمیانی رات، بھٹو کے اقتدار کی آخری رات تھی۔ اس رات ایک بجے کے لگ بھگ سیکرٹری داخلہ مسٹر چودھری کو دوسرے سیکرٹریوں نے فون کیا کہ کچھ فوجی افسران کے گھروں میں وارد ہوئے ہیں۔ (چادر اور چار دیواری کے تحفظ کی پہلی وارداتیں جن میں رات کو لوگوں کے گھروں کے اندر چھاپے مارے گئے) ان افسروں نے کہا کہ فوجی، انہیں جنرل ہیڈ کوارٹر لے جانے پر مصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان وارداتوں سے یہ افسر اور ان کے بال بچے سخت ہراساں ہوئے۔ یہ ڈر بھی تھا کہ یہ طلبی پروانۂ موت نہ

بن جائے۔

سیکرٹری داخلہ مسٹر چودھری کا بیان ہے کہ انہوں نے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی (جو بعد میں پنجاب کے گورنر ہوئے) کو فون کیا۔ پہلے فون پر تو فوجی انٹیلی جنس کے اس سربراہ نے کمال معصومیت سے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن آدھ گھنٹہ بعد جب دوبارہ فون کیا گیا تو انہوں نے بڑی سادگی سے فرمایا "معلوم ہوتا ہے کہ فوج نے حکومت سنبھال لی ہے"

ظاہر ہے کہ اس "ٹیک اوور" کے انتظامات پہلے سے کئے گئے تھے اور فوجی انٹیلی جنس کو اس کا علم تھا۔ اس کی ریہرسل بھی باقاعدہ ہوئی۔ یہ تمام سلسلہ ایک منظم منصوبہ کے تحت عمل میں آیا۔ پیر پگارا نے "لانگ مارچ" کا جو اعلان کیا تھا، وہ محض ایک دھوکا اور فوجی اصطلاح "کیموفلاج" تھا (اس کے تحت دھواں کہیں اور اٹھتا ہے جبکہ حملہ کسی اور طرف کیا جاتا ہے)۔ لانگ مارچ تو کیا ہونا تھا، کہ پیر صاحب نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ایسے احتجاجی مظاہروں اور جلوسوں کی قیادت فرمانے کی زحمت نہیں کی۔ تاہم اس اعلان کے پردہ میں آرمی کو یہ موقع ضرور مل گیا کہ وہ پرائم منسٹر ہاؤس اور وزیراعظم کی حفاظت کے نام پر فوجی دستوں کو حرکت میں لے آئے۔ چنانچہ بھٹو سے یہ کہا گیا کہ لانگ مارچ کے باعث حفاظتی اقدام کے طور پر اسلام آباد میں فوجی دستے تعینات کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح وفاقی دارالحکومت میں فوج جمع کرنے کا ایک معقول اور بہترین بہانہ پیدا کر لیا گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فوج اور قومی اتحاد میں کس درجہ اشتراکِ عمل پایا جاتا تھا۔

اسلام آباد میں مختلف مقامات پر فوج متعین ہونے سے جنرل ضیاء الحق اور ان کے جرنیلوں کو "ٹیک اوور" میں کوئی مشکلات پیش نہیں آئیں۔ اگر فوج وہاں پہلے سے جمع نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ فوجی دستوں کی اچانک نقل و حرکت اور اسلام آباد میں ان کے اجتماع سے بھٹو چوکنا ہو جاتا اور کوئی دوسری تدبیر بروئے کار لاتا۔

سب سے پہلے فیڈرل سیکیورٹی فورس کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ ہوا۔ چاروں طرف سے اس کی ناکہ بندی کر کے اس کے تمام اسلحہ خانوں، گاڑیوں، دفتروں اور بیرکوں پر قبضہ کر لیا گیا۔

ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود نے "مزاحمت" کی کوشش کی۔ یہ "مزاحمت" بس اتنی ہی تھی کہ جب اس کے گھر پر چھاپہ مار فوجی افسر پہنچے تو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا اور ہنگامی طور پر سیکرٹری داخلہ کو فون کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ایسے حالات میں بے چارہ سیکرٹری داخلہ کیا کر سکتا تھا؟ بہرحال غلام جیلانی کا حوالہ دے کر مسعود محمود کو سمجھایا گیا کہ مزاحمت کرنا بے سود ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے کوئی نقصان بھی ہو جائے ——— اِس بات سے مسعود محمود کی تسلی نہ ہوئی۔ بالآخر سیکرٹری داخلہ خود اس کے گھر پہنچے لیکن اس وقت تک مسعود محمود کو غائب کیا جا چکا تھا۔ گھر کے پھاٹک پر اس کے دو بچے اور بیوی کھڑی تھی۔ سیکرٹری داخلہ نے مناسب الفاظ میں خاتون کو تسلی دی تو وہ پھوٹ پڑی اور کہا "اگلے روز میرے بچے کا میٹرک کا امتحان تھا اب کیا ہوگا؟"

دوسرے بہت سے افسر جن میں سول انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر، وزیراعظم کے سیکرٹری، کیبنٹ سیکرٹری، ایف آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل، سب گرفتار کر کے جی۔ ایچ۔ کیو اور پھر وہاں سے دوسرے مقامات پر لے جائے جا چکے تھے اور ان سے تفصیلی "پوچھ گچھ" ہو رہی تھی۔

ستم ظریفی

لطف یہ ہے کہ اس تمام کارروائی سے چند گھنٹے پہلے جنرل ضیاء الحق نے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی اور فوج کی وفاداری کا مکمل اور غیر مشروط یقین دلایا تھا۔ پھر چند گھنٹے بعد وزیرِ اعظم سمیت تمام وزراء اس "وفاداری" کی زد میں آکر گرفتار کر لئے گئے۔ حزبِ مخالف کے چیدہ چیدہ رہنما بھی گرفتار ہوئے۔

یُوں ۵ جولائی کی صبح طلوع ہوئی تو ملک میں تیسرا مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔ جنرل ضیاء اس کے چیف ایڈمنسٹریٹر تھے جو ۹۰ دن میں الیکشن کا وعدہ فرما رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں یہ "کاروائی" مکمل کرنے کے بعد جنرل ضیاء الحق صبح سویرے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس یعقوب علی خاں سے اُن کے چیمبر میں ملے اور اپنی اس "واردات" پر ان سے قانونی مشورہ دینے کی فرمائش کی۔ حالانکہ جب سب کچھ کر لیا تھا تو پھر مشورہ کی کیا ضرورت رہ گئی تھی ؛ تاہم جنرل ضیاء نے کہا :

" مارشل لاء عارضی ہے اور صرف ۹۰ دن کے لئے نافذ کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد فضا کو خوشگوار بنانا اور عام انتخابات کی راہ ہموار کرنا ہے ۔" اِس پر چیف جسٹس نے انہیں مشورہ دیا :

" اوّلاً آئین کو بالکل نہ چھیڑا جائے ۔ ثانیاً کوئی فوجی عدالتیں قائم نہ کی جائیں۔ ثالثاً صدرِ مملکت' چوہدری فضل الٰہی کو اُن کے عہدے پر قائم رکھیں۔ رابعاً مارشل لاء انتظامیہ سوائے امن و امان کے بقایا نظمِ حکومت میں کوئی دخل نہ دے اور اپنے مقرر کردہ ۹۰ دن کے بعد تمام اختیارات سول انتظامیہ کو واپس کر دے۔ ساتھ ہی مارشل لاء ختم کر کے فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے ۔"

یہی نہیں چیف جسٹس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ :

" اگر اس ۹۰ دن کے اندر کسی فرد یا جماعت نے مارشل لاء کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا تو یہ عدالت اپنے سابقہ فیصلے (عاصمہ جیلانی کیس) کی پابند ہے ۔" (یعنی مارشل لاء کے خلاف رائے دے گی)۔

اِس "مشورہ" پر جنرل ضیاء الحق نے چیف جسٹس کو یقین دلایا کہ اِن تمام باتوں پر مارشل لاء انتظامیہ سختی سے کاربند رہیگی۔ چیف جسٹس نے یہ اہتمام کر لیا تھا کہ یہ تمام گفتگو من و عن ریکارڈ کر لی۔ اس ریکارڈ کی ایک ایک کاپی سپریم کورٹ کے ہر جج کو روانہ کر دی اور ایک کاپی سپریم کورٹ کے ریکارڈ میں محفوظ کرا دی کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت ______

چیف جسٹس سے اس گفتگو کے بعد جنرل صاحب نے سیکرٹری داخلہ کو فون کیا اور کہا "چوہدری صاحب' ملاقات ہو سکتی ہے ؟ " چوہدری صاحب نے کہا "حکم فرمایئے ۔"

چنانچہ ملاقات کے لئے بارہ بجے کا وقت مقرر ہوا اور چوہدری صاحب "ٹھیک وقت" پر جی ایچ کیو پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر جنرل صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور کہا :

" یہ اقدام مَیں نے نہایت مجبوری اور دکھ سے کیا ہے ۔" پھر کچھ توقف کر کے انہوں نے فرمایا " میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ مَیں

جسٹس انوار الحق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے عہدۂ صدارت کا حلف لے رہے ہیں (۱۶ ستمبر ۷۸ء)

خود کو رسول انتظامیہ کے بکھیڑوں میں ڈالوں۔ فوج میں میرے اپنے جو فرائض ہیں وہ مجھے ہر وقت مصروف رکھتے ہیں لہٰذا وزارتِ داخلہ کا سب کام آپ کرتے رہیں۔"

اس کے بعد چوہدری صاحب کو خوش کر کے انہوں نے دریافت کیا:

"مارشل لاء کے متعلق عوام کا کیا ردِ عمل ہوگا؟"

چوہدری صاحب نے جواب دیا "یہ کوئی پہلا مارشل لاء تو ہے نہیں، اس لئے عوام کا ردِ عمل بڑا سلجھا ہوا ہوگا۔ وہ جاننا چاہیں گے کہ اس کا جواز کیا ہے؟ یہ کب تک رہے گا اور ملک کے آئین کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟"

جنرل ضیاء الحق نے بڑے اعتماد اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں اور میرے رفقاء ان امور پر نہایت صاف ستھرا مؤقف رکھتے ہیں۔ اس مارشل لاء کا مقصد حکومت اور حزبِ مخالف میں فضا کو خوشگوار بنانا ہے۔ اس کے لئے تین ماہ مقرر ہیں۔ اس میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں ہوگا۔ آئین کو ہرگز نہیں چھیڑا جائے گا۔ آئین صرف تین ماہ کے لئے معطل ہوگا۔ تاکہ امنِ عامہ برقرار رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چوہدری فضل الٰہی بدستور صدرِ مملکت رہیں گے۔"

اس پر سیکرٹری داخلہ نے کہا:

"اس صورت میں عوام کا ردِ عمل مخالفانہ نہیں ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگ سکون کا سانس لیں۔"

اسی روز جنرل صاحب نے ٹیلی ویژن پر عوام سے خطاب کیا اور کہا:

"میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے اس ملک کی عظیم قوم سے خطاب کرنے کا موقع دیا۔ آپ نے سُن لیا ہوگا کہ بھٹو حکومت ختم کر دی گئی ہے اور اس کی جگہ ایک عبوری حکومت قائم ہوئی ہے۔

"فوج کا اقتدار سنبھالنا کبھی خوشگوار اقدام نہیں ہوتا۔ ہماری فوج واقعتاً چاہتی ہے کہ ملک کی حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں رہے۔"

"میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نہ کوئی سیاسی عزائم رکھتا ہوں اور نہ فوج اپنے جنگی پیشہ سے الگ ہونا چاہتی ہے۔ میرا کام صرف اور صرف الیکشن کرانا ہے جو اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ہوں گے۔ الیکشن کے فوراً بعد اقتدار منتخب حکومت کو سونپ دیا جائے گا۔"

"میں آپ کو حلفیہ یقین دلاتا ہوں کہ میں اس پروگرام سے انحراف نہیں کروں گا۔"

"آئندہ تین ماہ صرف الیکشن کی تیاری پر صرف کروں گا اور بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کسی دوسرے کام پر وقت ضائع نہیں کروں گا۔" قریب قریب یہی مضمون باقی جرنیلوں کے اعلانات کا تھا۔

لیکن اس کا مقصد جو بعد میں واضح ہوا یہ تھا کہ عوام کے فوری اور مخالفانہ ردِ عمل کو روک دیا جائے ورنہ جب ملک میں کوئی ہنگامہ نہ ہو حکومت اور حزبِ اختلاف میں جھگڑا نہ رہے۔ الیکشن کا معاہدہ طے پا جائے تو پھر مارشل لاء کا کیا جواز تھا؟

۹۰ دن کا یہ فارمولا، جو عوامی ردِعمل کو روکنے کے لئے لایا گیا، کارگر ثابت ہوا۔ اِس قلیل مدت کے لئے کوئی بھی مارشل لا پر کیا اعتراض کرتا؛ اسی دوران بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر کی نظربندی کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا اور ضمانت کی درخواست دی۔ اسی طرح کی اور درخواستیں بھی آئیں۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے تمام درخواست دہندگان کو سہالہ لانے کا حکم دیا تاکہ انہیں وہاں سے عدالت میں طلب کیا جاسکے۔ اِس پر مسٹر اے کے بروہی، مارشل لا کے وکیل کی حیثیت سے سپریم کورٹ میں پہنچے اور کہا،

" قیدیوں کو سہالہ لانے کا حکم واپس لے لیا جائے۔"

چیف جسٹس :- "آپ یہ درخواست لکھ کر رجسٹرار کو دے جائیں۔"

ظاہر ہے کہ اس کے بعد بروہی صاحب پھر نہیں آئے۔ البتہ چیف جسٹس کو ریٹائر کر دیا گیا۔ ملک میں تو ذرائع ابلاغ کی زبان گنگ تھی تاہم لندن سے شائع ہونے والے 'ملت' نے اس اقدام پر لکھا :

"چیف جسٹس سپریم کورٹ کو اس وقت عہدہ سے ریٹائر کر دیا گیا جب وہ مارشل لا کے خلاف رٹ کی سماعت کر رہے تھے۔ ملک کی عدلیہ کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔"

اِسی اخبار نے ۲۶ر ستمبر کو لکھا :

"چیف جسٹس نے، جنرل ضیاء اور فوجی ٹولے کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر کے عدلیہ کے لئے شاندار روایت قائم کی ہے۔"

اور " لندن ٹائمز " نے لکھا :

" جنرل ضیاء نے چیف جسٹس کو صرف اس لئے معزول کیا کہ چیف جسٹس سابق وزیرِ اعظم کی نظربندی کے خلاف مقدمہ کی سماعت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ انہیں ریٹائر کر دیا گیا۔ آئین پر مارشل لاء کے حکم کی فوقیت کی یہ ایک بھونڈی مثال ہے۔"

دراصل جنرل ضیاء الحق کو خطرہ تھا کہ چیف جسٹس 'عاصمہ جیلانی کیس' کی طرح، مارشل لاء کو غیر قانونی اور غیر آئینی اقدام قرار دے دیں گے۔ اِس خوف نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ چیف جسٹس کو چلتا کریں۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ مارشل لاء نافذ کر دینے کے باوجود جنرل ضیاء الحق اس اقدام کو "مارشل لا" کا نام دینے سے گریزاں تھے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ آئین کے تحت اسکی سزا موت تھی، اس لئے شعوری یا لاشعوری طور پر وہ "مارشل لا" کے لفظ کے استعمال سے گریزاں تھے اور اسے الیکشن کیلئے "عبوری انتظام" کا نام دے رہے تھے۔

اِس عجیب و غریب پالیسی پر جنرل جمال سید میاں نے اُن سے کہا "آپ گھوڑے پر سوار ہیں اور پھر یہ دعویٰ ہے کہ اس پر بوجھ نہ ڈالا جائے سوار کے ساتھ گھوڑے پر بوجھ تو ہوگا۔ اب آپ اُسے کوئی نام بھی دیں مگر عملاً پوزیشن یہی ہے کہ مارشل لا نافذ ہو چکا ہے، اس لئے اسے 'مارشل لا' ہی کہیے 'عبوری انتظام' بے معنی بات ہے۔"

جنرل ضیاء نے جواب دیا "آپ درست فرماتے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ ہم پر آئین توڑنے کا الزام عائد نہ آئے جو مارشل لاء کے نفاذ سے آسکتا ہے۔" چنانچہ اسی رات یہ فیصلہ بھی ہوا کہ آئین توڑنے کی بجائے اسے عارضی طور پر معطل قرار دیا جائے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مارشل لاء کے نفاذ پر فوج میں ۸۰ فیصد لوگوں کو یقین تھا کہ یہ مارشل لا، خود بھٹو صاحب کے ایماء پر لگایا گیا ہے فوج سے باہر بھی بہت سے لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے، اُن کا خیال تھا کہ حالات نے جو رُخ اختیار کر لیا تھا اور دو سیاسی عناصر جس طرح ٹکرا رہے تھے، اس میں کوئی ریفری ہی حالات درست کر سکتا تھا۔ ابتداً میں خود جنرل ضیاء الحق نے بھی یہی تاثر دیا کہ ہم دونوں فریقوں کو لڑائی سے روکنے، اور الیکشن کرانے کے لئے آئے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو وزارتِ عظمیٰ کی معزولی کے بعد پرائم منسٹر ہاؤس میں

آٹھواں باب

اُس رات کی روایات و
حکایات
جنرل ضیاء کے کھلے اور
درپردہ ساتھیوں کی زبانی

جنرل ٹکا خان

بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے جنرل ضیاء الحق نے چند جرنیلوں کو ساتھ ملا کر کئی ماہ پہلے سے ہی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس کا اعتراف خود اُن کی زبان سے سُن لیجئے۔ یہ ایک انٹرویو ہے جو جنرل ضیاء نے "اُردو ڈائجسٹ" کے منظورِ نظر ایڈیٹر الطاف حسن قریشی کو دیا۔ جنرل ضیاء نے کہا:

"قریشی صاحب جس مکان میں آپ بیٹھے ہیں بس یہیں سارا منصوبہ تیار ہوا۔ وہ بھی آج ہی کی طرح ایک خاموش اور پُرسکون رات تھی مگر اس کے بطن سے سربستہ راز تخلیق ہوئے تھے۔ دراصل ہمارا مشن بہت کٹھن تھا۔ وہ اس لئے کہ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ فوج کو سیاست میں داخل نہ ہونے دوں گا اور نہ اقتدار سنبھالوں گا اور سیاسی مسائل یا بحران کو سیاسی عمل کے ذریعے حل ہونے میں مدد دوں گا۔ ۱۰ مارچ کو اپوزیشن نے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کیا تو سیاسی صورتِ حال سنگین ہو گئی چنانچہ ہم نے راولپنڈی میں اعلیٰ فوجی افسروں کا ایک اہم اجلاس بلایا اور معاملات کے سارے پہلو زیرِ بحث آئے۔ اسی وقت ہم نے کئی متبادل تجاویز پر غور کیا۔ ان تجاویز میں اقتدار سنبھالنے کی بات بھی تھی۔ تمام افسروں نے اس امر پر اتفاق کیا کہ ہم سیاست میں ملوث ہونے سے بہرصورت گریز کریں گے اور صرف آخری چارۂ کار کے طور پر، حکومت پر قابض ہونے کا پروگرام بنائیں گے۔ اس اہم اجلاس کے بعد ہم سیاسی احوال کا جائزہ لیتے رہے۔"

شہروں میں جزوی مارشل لاء کے دوران فوجی افسر احکامات کی خلاف ورزی کرتے رہے لیکن ان کا کورٹ مارشل نہیں ہوا بلکہ انہیں اپنا کام مکمل کرنے پر صرف تبدیل کیا جاتا رہا۔ مزید برآں چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے جنرل ضیاء ذاتِ خود سیاسی حالات میں گہری دلچسپی لے رہے تھے اس کا وہ خود اعتراف کرتے اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ انہوں نے بعض احکامات جاری کرنے میں فوجی ڈسپلن کی خلاف ورزی بھی کی ——

"۱۱ر اپریل کے بعد ہمارا دائرہ کار تین شہروں میں وسیع ہوگیا۔ مئی کے پہلے ہفتے میں انار کلی لاہور میں گولی چلی تو حالات نے نیا رُخ اختیار کرلیا۔ تین بریگیڈیئر بڑے مضطرب تھے۔ چنانچہ مَیں خود لاہور پہنچا۔ انہوں نے کہا خدا کے لئے ہمیں یہاں سے تبدیل کر دیجئے۔ اُن کی خواہش کا احترام کیا گیا۔ میرے لئے سب سے اہم اور نازک مسئلہ فوج کے اندر مکمل نظم وضبط برقرار رکھنا تھا۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں وفاداریوں پر اثر نہ پڑے چنانچہ اس زمانے میں میرے قلم سے چھ سے زائد احکام جاری ہوئے۔ میرے احکام براہِ راست بٹالین کمانڈروز کو بھیجے گئے۔ یہ تجربہ پہلی بار کیا گیا تھا، ورنہ چیف آف اسٹاف براہِ راست صرف کور کمانڈروں کو ھدایت بھیجتا ہے۔"

"مئی کے پہلے عشرے میں کور کمانڈروں کا ایک اور اہم اجلاس ہوا۔ حالات پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یہ فیصلہ ہوا کہ مسٹر بھٹو کو سیاسی تصفیے کی ضرورت کا شدید احساس دلایا جائے۔ مَیں نے مارچ کے آخر ہی میں اُن سے کہہ دیا تھا کہ مذاکرات کے ذریعے سیاسی معاملات طے کئے جائیں۔ وہ یہی کہتے رہے، مجھے وقت دیجئے۔ اگر اس وقت مَیں نے اپوزیشن کو مذاکرات کی پیش کش کی یا اُن کی ایک آدھ بات مان لی تو ملک میں ایسی افراتفری پھیلے گی کہ پھر اس پر قابو نہ پایا جاسکے گا۔ مَیں نے سوچا کہ یہ معقول بات ہے چنانچہ فوج نے خاصا سہارا دیا۔ مسٹر بھٹو نے یوں تو مذاکرات کا ذکر شروع ہی میں کر دیا تھا لیکن باقاعدہ دعوت اپریل کے آخر میں دی تھی۔ دس بارہ مئی کے لگ بھگ انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ مَیں حالات سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں لیکن اپوزیشن کا رویّہ غیر منطقی اور غیر جمہوری ہے۔ مجھے کچھ وقت اور درکار ہے۔ انہی دنوں انہوں نے قومی اسمبلی میں تقریر کی اور عام انتخابات کے بجائے ریفرنڈم کی تجویز پیش کر دی۔ اس کے خلاف تقریباً ہر سطح پر شدید ردِ عمل ہوا۔ فوجی افسروں اور جوانوں کے جذبات صاف پڑھے جاسکتے تھے۔ اس مرحلے پر ہم نے مسٹر بھٹو پر واضح کر دیا کہ یہ طرزِ عمل مناسب نہیں۔ قوم انتخابات کا مطالبہ کر رہی ہے اور آپ ایک نیا ایڈونچر کرنا چاہتے ہیں۔ اس مرتبہ ہمارے پیغام میں قدرے سختی اور شدت تھی۔ ہماری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بھٹو صاحب نے مولانا مفتی محمودؒ سے ملاقات کی اور از سرِ نو انتخابات کی بنیاد پر مذاکرات کی دعوت دی"

(پھر انہی جنرل ضیاء صاحب نے قوم کے انتخابات کے مطالبہ کو ماننے کی بجائے اسلام کے نام پر ریفرنڈم کرایا اور اس کے ذریعے خود کو "منتخب صدر" قرار دے ڈالا)

"جون کے وسط میں اہم فوجی افسروں کا اجلاس اسی مکان میں ہوا۔ مَیں نے تمام کور کمانڈروں کو رات کے کھانے پر بلایا اور ساری تفصیلات اُن کے سامنے رکھ دیں۔ ہم سب نے اتفاقِ رائے سے طے کیا کہ اب آپریشن پہلے سے ناگزیر نظر آتا ہے تاہم سیاسی جماعتوں کو ابھی اور مہلت دی جائے۔ اگر معاملات خوش اسلوبی سے انجام پا جاتے ہیں تو فوج کا سر درد ختم ——— اور اگر حالات کے بگاڑ میں مزید شدت اور وسعت پیدا ہوجائے تو پھر آپریشن سے اجتناب نہ کیا جائے۔ اسی رات اس آپریشن کا نام "آپریشن فیئر پلے" تجویز ہوا۔ یہ بھی طے ہوا کہ آپریشن کے وقت کا تعین چیف آف آرمی سٹاف کریں گے۔ ہم نے یہ راز فقط اپنے تک محدود رکھا اور سی جی ایس کو بھی ہمراز نہ بنایا۔ میرے اسٹاف افسر بھی اس آپریشن سے کلیتہً بے خبر تھے۔"

جون کے آخری دنوں میں مسٹر بھٹو نے فوجی جرنیلوں کو کابینہ کے اجلاس میں بلانا شروع کر دیا۔ بعض مواقع پر عجیب وغریب باتیں سامنے آئیں۔ ایک رات مسٹر غلام مصطفےٰ کھر اور مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے کہا کہ اپوزیشن شرارت سے باز نہیں آتی۔ اس کے لیڈر فتنے اٹھا رہے ہیں،

ہم اِن سب کو قتل کر دیں گے۔ ٹکا خان کے لب و لہجہ میں اور بھی تیزی تھی۔ اُن کا ارشاد تھا کہ پاکستان کی خاطر دس بیس ہزار افراد قتل بھی کر دینے پڑیں تو کوئی بڑی بات نہیں ـــــ مسٹر بھٹو بار بار کہتے "جنرل صاحب! دیکھا آپ نے میری کابینہ کا موڈ، مَیں اِن حالات میں اپنے وزیروں کا ساتھ دینے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں"

یکم جولائی کو یہی تماشہ رات کے ڈیڑھ بجے تک ہوتا رہا۔ دوسری جولائی کو بھی اسی ڈرامے کی ریہرسل کی گئی۔ تین جولائی کی رات کو میرے اعصاب نے حقیقی خطرہ بھانپ لیا چنانچہ مَیں بڑے اقدام کا جائزہ لینے لگا۔ حکومت کی ذہنی کیفیت میرے سامنے تھی۔ اَب صرف اپوزیشن کے نقطۂ نظر کا انتظار تھا۔ شام کے پانچ بجے مجھے معلوم ہوا کہ نواب زادہ نصراللہ خاں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں چنانچہ مَیں نے اسی وقت اس پریس کانفرنس کی پُوری رپورٹ حاصل کی۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کا ردِعمل وہی تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ چنانچہ ساڑھے پانچ بجے کے قریب مَیں نے راولپنڈی سے باہر احکام جاری کر دیئے کہ رات کے بارہ بجے نقطۂ آغاز ہوگا۔

شام کے آٹھ بجے پرائم منسٹر ہاؤس سے ٹیلی فون آیا کہ آج رات کابینہ کا پھر اجلاس ہوگا اور آپ کی شرکت ضروری ہے۔ جلدی وقت بتا دیا جائے گا۔ یہ پیغام میرے لئے بہت زیادہ تشویش کا باعث بنا۔ اگر بارہ بجے تک اجلاس جاری رہا اور مَیں بھی اس میں شریک ہوا تو پھر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، چنانچہ راولپنڈی کے لئے مَیں نے وقت آگے بڑھا دیا۔ ایک ایک لمحہ جسم کے اندر کانٹے کی طرح پیوست ہوا جاتا تھا، لاکھوں وسوسے، ہزاروں خدشات، یہ بھی اندیشہ تھا کہ ہمارے منصوبے کا اگر کسی کو علم ہو گیا تو کچھ بھی وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ یہ راز صرف چند افراد تک محدود تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عجیب طرح کا احساس منڈلانے لگا تھا۔

بھٹو کابینہ کے اہم وزیر مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں "۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات نے پی این اے کی عوامی طاقت کو پُوری طرح ثابت کر دیا کیونکہ اس روز ملک بھر کے پولنگ بوتھ ویران پڑے تھے اور صرف پیپلز پارٹی کے امیدوار میدان میں رہ گئے تھے۔ صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ اس درجہ مکمل تھا کہ مجھے یہ شک ہونے لگا کہ پی این اے نے انتخابی نتائج کے خلاف ۱۴ مارچ سے جو تحریک چلانے کی دھمکی دی ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ ۱۱ مارچ کو پی این اے نے ملک بھر میں ہڑتال کی اپیل کی اور بلاشبہ ملک کے بیشتر شہروں خصوصاً کراچی میں عوام نے پی این اے کی اپیل کا مثبت جواب دیا۔ ۱۲ مارچ کو احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ملک بھر کی سڑکیں آنسو گیس، لاٹھی چارج اور ہائے ہائے کے نعروں سے گونجنے لگیں۔ ۱۸ مارچ کو قومی اتحاد کے کئی اہم رہنما جن میں ایئر مارشل اصغر خاں شاہ احمد نورانی، شیر باز مزاری وغیرہ شامل تھے گرفتار کر لئے گئے۔ پی این اے اپنی مختلف اپیلوں کا عوام کی جانب سے مثبت جواب پا کر، خاصا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ اگرچہ گرفتاریوں کی خبریں اخبارات میں کم ہی آتی تھیں لیکن خصوصاً کراچی آتش فشاں بن چکا تھا۔ ہنگامے اِس قدر بڑھے کہ کراچی کے بعض علاقوں میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ پولیس کی مدد کے لئے ایف ایس ایف اور فوج کے دستے طلب کر لئے گئے تھے۔ نئی کراچی، لیاقت آباد، ناظم آباد اور فیڈرل بی ایریا کے علاقوں میں فوج نے مکمل کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ اس کے باوجود پٹھان کالونی میں ایک ہولناک سانحہ نے جنم لیا جب عوام کے مشتعل ہجوم نے پیپلز پارٹی کی وارڈ کمیٹی کے صدر حبیب الرحمٰن کے گھر کو آگ لگا دی اور ۱۴ افراد کو زندہ جلا دیا۔ گھر کے اندر سے ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں دو حملہ آوروں کی ہلاکت کی بھی اطلاعات ملیں۔ پیپلز پارٹی کے دفاتر کو آگ

لگائی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ سرکاری اور نجی املاک بھی نشانہ بن رہی تھیں۔

(سب سے ہولناک مالی نقصان ری پبلک موٹرز کی آگ سے ہوا جس کے نتیجے میں ۲۵ کروڑ روپے کی گاڑیاں اور دیگر سامان نذرِ آتش ہوا) کراچی سے بھڑکنے والی یہ آگ رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گئی اور تمام نمایاں قائدین کی گرفتاری کے بعد تحریک پوری طرح عوام کے ہاتھ میں چلی گئی۔ مساجد نے تحریک کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لاہور کی مسجدِ شہداء نے تو اس سلسلہ میں عالمی شہرت حاصل کی۔ اوّل، دوئم اور سوئم صف کے تمام قائدین کی گرفتاری کے بعد مساجد کے آئمہ حضرات نے عملاً حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت سنبھال لی تھی اور انتخابی دھاندلیوں کے خلاف شروع ہونے والی تحریک اب "نظامِ مصطفٰے کے نفاذ کی تحریک" میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کو "نظامِ مصطفٰے کے نفاذ کی تحریک" میں تبدیل کرنے میں مرکزی کردار جمعیت علمائے پاکستان نے ادا کیا۔ ۱۲ مارچ کو پاکستان الیکشن کمیشن نے سرکاری طور پر نتائج کا اعلان کر دیا۔ نو منتخب قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ۲۶ مارچ کو طلب کر لیا گیا تھا جس میں اراکین کو حلف اٹھانا تھا اور آئندہ پانچ سال کے لئے حکومت تشکیل دینا تھی۔ اِدھر قومی اتحاد ۲۶ مارچ سے پہلے احتجاجی تحریک کو مزید سنگین اور شدید کرنا چاہتا تھا اور مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے دھمکی دے دی تھی کہ ۲۶ مارچ کو قومی اسمبلی کے "غیر آئینی اور غیر قانونی" اجلاس میں شرکت کے لئے ارکانِ اسمبلی اپنی ذمہ داری پر جائیں۔ چار ہفتے کی تحریک میں تقریباً ۲ کروڑ روپے کی املاک تباہ و برباد کی جا چکی تھیں۔ قومی اتحاد کے ایک اہم رہنما ایئر مارشل اصغر خاں نے مسلح افواج کے سربراہوں کو ایک خط لکھا جس میں انہیں بھٹو حکومت کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی گئی تھی اور بی بی سی کے مطابق اس خط کی تین ہزار کاپیاں دیگر فوجی افسروں میں بھی تقسیم کرائی گئی تھیں۔

وزیرِ اعظم وسط مارچ میں ہی فوج کے اعلیٰ افسران کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی میٹنگیں شروع کر چکے تھے۔ ابتداً میں وہ خود ہی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے مختلف جرنیلوں سے ملاقاتیں کرتے رہے جن میں انہوں نے اپنی حکومت کی بقاء اور قومی اتحاد کے ایجی ٹیشن کو کچلنے کے سلسلے میں فوج کی مدد حاصل کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ جوں جوں ایجی ٹیشن بڑھتا گیا، سروسز چیفس اور کور کمانڈرز کے ساتھ وزیرِ اعظم کی ملاقاتیں بھی بڑھتی گئیں۔ اِن ملاقاتوں کے دوران جہاں مسٹر بھٹو جرنیلوں کو کرید کرید کر ان کے خیالات اور سوچوں سے خود کو آگاہ رکھنے بلکہ جرنیلوں کو اپنے سامنے ایکسپوز ہوتے دیکھنا چاہتے تھے وہاں انہیں سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ وہ خود بھی جرنیلوں کے سامنے ایکسپوز ہوتے چلے گئے اور جرنیلوں پر اُن کی کمزوریاں اور انتظامیہ پر اُن کی ڈھیلی گرفت عیاں ہوتی چلی گئی۔ جرنیلوں کو سیاسی معاملات میں ملوث کرنا اور اُن کے ساتھ سیاسی معاملات پر بحث کرنا گویا اُن پر سوچ اور فکر کے نئے دروازے کھولنے کے مترادف تھا اور دراصل یہیں سے سیاسی معاملات میں جرنیلوں کو اپنی اہمیت کا احساس ہونا شروع ہوا۔

۴ر جولائی ۱۹۷۷ء کی شب، جرنیلوں کے انتہائی اقدام کا نقطۂ آغاز تھا۔ سیاست میں فوج کی مداخلت کا دروازہ، درحقیقت خود وزیرِ اعظم بھٹو ۱۹۷۴ء میں ہی کھول چکے تھے جب بلوچستان میں انہوں نے مری اور مینگل قبائل کے خلاف جنرل ٹکا خاں کے ذریعے ملٹری آپریشن کرایا تھا جنرل ٹکا خاں مشرقی پاکستان میں قتلِ عام کرانے کے سلسلے میں پہلے ہی خاصی شہرت رکھتے تھے اور مشرقی پاکستان سے "قصاب" کا خطاب لے کر واپس آئے تھے۔ یہ صاحب یحییٰ دَور میں بھٹو اور پیپلز پارٹی کے زبردست مخالف تھے۔ اگر ۱۹۷۳ء میں وزیرِ اعظم بھٹو کی مقبولیت کا گراف

۱۹۷۷ء جیسا ہوتا تو یہ ایک یقینی بات تھی کہ خود جنرل ٹکا خاں ہی بلوچستان کے آپریشن کے بعد، مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیتے لیکن مسٹر بھٹو کی خوش قسمتی تھی کہ ملک کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور سندھ میں وزرائے اعلیٰ کی انتظامی امُور پر گرفت اور غلام مصطفیٰ کھر کے علاوہ غلام مصطفیٰ جتوئی کی ذاتی مقبولیت نے عوام میں مسٹر بھٹو کی ساکھ قائم رکھی اور ٹکا خاں بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی جسارت نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے نزدیک بھٹو حکومت کے زوال میں جہاں بے شمار اسباب وعوامل نے اپنا اپنا کردار ادا کیا، وہاں ان کے زوال کا ایک اہم سبب وہ ظلم وتشدد تھا جو وزیرِ اعظم سے ملنے والی کرسیوں پر بیٹھ کر بیوروکریسی کے کل پرزوں نے عوام پر روا رکھا تھا۔ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کا قول ہے کہ "کافر کی حکومت چل سکتی ہے۔ مشرک اور منافق کی حکومت بھی چل سکتی ہے لیکن ظالم کی حکومت نہیں چل سکتی"۔ ہمارے دورِ حکومت میں عوام کی زبانیں بند رکھی گئیں۔ اُن کے سر جھکائے گئے۔ نتیجے کے طور پر جب ۷ر جنوری کو انتخابات کے اعلان کے بعد ۱۱ر جنوری کو قومی اتحاد کے قیام کا اعلان ہوا تو پھر ایک دم عوام کے ہاتھ بھی کھُلے اور زبانیں بھی۔ جھکے ہوئے سر بھی اٹھے اور گردنیں بھی۔ ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے، چنانچہ یہ صُورتِ حال بھٹو دَور کے ان ظالموں کے ساتھ بھی پیش آئی اور یہ لوگ اپریل ہی میں رسّی تڑا کر بھاگنے کے چکر میں نظر آنے لگے۔ یہ لوگ اتنے حواس باختہ تھے کہ مسٹر بھٹو نے کسی بھی معاملے میں ان لوگوں سے بات کرنا ترک کر دیا تھا۔

اپریل ۱۹۷۷ء میں جہاں پی این اے کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور پولیس تحریک کو روکنے میں ناکام ہو چکی تھی، وہاں مسٹر بھٹو کے بیوروکریٹ صاحبان پر بھی بوکھلاہٹ طاری تھی اور اب مسٹر بھٹو اپنے دورِ عروج کے اِن مشیرانِ کرام کے مشوروں پر عمل کرنے کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ پی این اے کی تحریک سے مسٹر بھٹو پر عوام کی اصل طاقت کا مظاہرہ ہو چکا تھا جو کبھی خود اُن کی قوت کا سرچشمہ تھی۔ وزیرِاعظم کے نزدیک اَب اُن کے مشیران کسی کام کے نہ رہے تھے یا پھر جرنیلوں کے ساتھ، میٹنگوں کا دائرہ وسیع کر رہے تھے۔ ایئر مارشل اصغر خاں تو انتخابی مہم کے دَوران ہی مسعود محمود اور اس کی قبیل کے تمام افسران کا نام لے کر وزیرِاعظم بھٹو سمیت سب کو کوہالہ کے پُل پر پھانسی دینے کے دعوے کرتے رہے تھے اور مسٹر بھٹو کے اقتدار کا تخت ڈولتے دیکھ کر یہ لوگ اپنا وجود بچانے کے چکر میں تھے۔ مسٹر بھٹو کے اِن مشیروں نے انہیں بڑی حکمتِ عملی کے ساتھ عوامی حمایت سے محروم کر دیا تھا۔

اَب جب بھٹو پر اُن کی حقیقت کھُلی تو انہوں نے اُن لوگوں کو عضوِ معطل بنا کر ایک طرف تو اپنے سیاسی رفیقوں کو اہمیت دی۔ اور دوسری طرف فوج کے جرنیلوں کا سہارا لیا۔ یہاں بھی انہوں نے اگرچہ جہاں ایک صحیح فیصلہ کیا اور بیوروکریسی کا حصار توڑ کر، عوام اور اپنے سیاسی رفیقوں کی طرف واپس آئے وہاں اُن سے جرنیلوں کا سہارا لینے کی آخری غلطی بھی سرزد ہوئی اور بدقسمتی سے بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہی ہوا کرتی ہیں اور ہر بڑے آدمی کے زوال میں اس کی کسی نہ کسی ایسی ہی غلطی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

سیاسی اُفق پر وزیرِاعظم نے پنجاب کی اپنی روٹھی ہوئی طاقت اور اپنے جانشین ملک غلام مصطفیٰ کھر کو منایا اور دوبارہ اپنے پہلو میں جگہ دی۔ انتخابی مہم کے انچارج رفیع رضا بھی ہار بیٹھے تھے۔ آئینی اور قانونی معاملات کی ڈرافٹنگ کیلئے مسٹر بھٹو، حفیظ پیرزادہ پر اور سیاسی افہام وتفہیم کی فضا بحال کرنے نیز علمائے کرام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے وزیرِاعظم مجھ پر بھروسہ کر رہے تھے۔ کور کمانڈرز کے ساتھ مختلف امور میں بھی حفیظ پیرزادہ اور مَیں ہی وزیرِاعظم کی معاونت کرتے تھے۔ بعض میٹنگوں میں حامد رضا گیلانی، حنیف خاں اور ایک آدھ میں شیخ رشید، ٹکا خاں، اور

عزیز احمد بھی شریک ہوئے۔ ایک دو میں غلام مصطفےٰ جتوئی اور ممتاز علی بھٹو بھی شریک ہوئے۔ بھٹو صاحب جرنیلوں کے ساتھ غلام مصطفےٰ جتوئی کے خوشگوار اور خلوص پر مبنی تعلقات سے بھی استفادہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ بحیثیت وزیر اعلیٰ سندھ انہوں نے جہاں ایک عام آدمی کا اپنے حسن سلوک اور اخلاق سے دل جیتا تھا، وہاں بہت سے جرنیل بھی اُن کی شرافتِ قلبی کا احترام دل سے کرتے تھے۔

جس میٹنگ میں آبجی ٹیشن کے خاتمہ کے لئے بعض شہروں میں جزوی مارشل لاء کے نفاذ کا فیصلہ ہوا۔ اس میں وزیرِ اعظم کے علاوہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق، ایئر مارشل ذوالفقار علی خاں، حفیظ پیرزادہ، عزیز احمد اور میجر جنرل عبداللہ ملک شامل تھے۔ وزیرِ اعظم بھٹو نے اِس میٹنگ میں پولیس کے کردار پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ لوگ تحریک کے دوران پولیس والوں کو ہار پہناتے ہیں۔ یہ لوگ ان سے، کولڈ ڈرنکس قبول کرتے ہیں۔ ادھر عدلیہ کا یہ حال ہے کہ ادھر ہم کسی کو گرفتار کرتے ہیں ادھر اسے مجسٹریٹ رہا کر دیتے ہیں۔ وزیرِ اعظم کی بات ختم ہوئی تو چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے رضاکارانہ پیش کش کرتے ہوئے کہا:

"SIR WE WILL SORT THEES OUT."

اِس پر وزیرِ اعظم نے ان سے استفسار کیا "کیسے؟"

"ایسے مقامات پر مارشل لاء لگا دیتے ہیں جہاں زیادہ گڑبڑ ہے" جنرل ضیاء الحق نے جواب دیا۔ اِس پر مسٹر بھٹو نے غور سے اُن کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے:۔

"مارشل لاء کیسے لگایا جائے اس کی تو آئین میں گنجائش نہیں ہے ——"

جنرل ضیاء الحق گویا ہوئے "سر! آئین میں ترمیم بھی تو کی جا سکتی ہے"

اِس تجویز کے سامنے آنے پر مسٹر بھٹو نے اٹارنی جنرل یحییٰ خاں کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا۔ یہ میٹنگ اپریل کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی، اور اس کے راوی ایئر چیف مارشل (ریٹائرڈ) ذوالفقار علی خاں ہیں لیکن اس سے ایک ہفتہ پہلے پی ایم ہاؤس میں ایک اور میٹنگ ہوئی تھی جس کے راوی (ریٹائرڈ) میجر جنرل عبداللہ ملک ہیں۔ میجر جنرل عبداللہ ملک کے بارے میں، یہاں میں مختصراً یہ عرض کروں گا کہ وزیرِ اعظم بھٹو انہیں بیحد پسند کرتے تھے اور جیسا کہ چند مواقع پر میرے سامنے انہوں نے جنرل عبداللہ ملک کے بارے میں اظہارِ خیال کیا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وزیرِ اعظم آئندہ چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر جنرل ملک کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جنرل عبداللہ ملک بڑی خوبیوں والے انسان ہیں اور حقیقت پسندی کے علاوہ اظہارِ حقیقت اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اُن دنوں بھی وہ بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کر دیا کرتے تھے جب مسٹر بھٹو کے مشیرانِ کرام ہر وقت انہیں اُلٹے سیدھے مشورے دینے میں مصروف رہتے تھے۔ جنرل ملک ذاتی طور پر مسٹر بھٹو کے بیحد وفادار اور مداح تھے۔ اِن دنوں وہ چیف آف آرمی سٹاف کے چیف آف سٹاف تھے۔

جنرل عبداللہ ملک بتاتے ہیں کہ ایک شام گھر پر انہیں وزیرِ اعظم کی طرف سے فون آیا جس کے ذریعے انہیں پی ایم ہاؤس پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ جنرل عبداللہ ملک نے پروٹوکول کا خیال کرتے ہوئے اپنے باس جنرل محمد ضیاء الحق کو رنگ کر کے بتانا چاہا کہ وزیرِ اعظم نے انہیں بلوایا ہے لیکن چیف آف آرمی سٹاف سے اُن کی بات نہ ہو سکی۔ شام کو تقریباً سات بجے وزیرِ اعظم ہاؤس میں حاضر ہونا تھا۔ چنانچہ وقت پر پہنچے اور انہیں

ڈرائنگ رُوم میں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیرِاعظم تشریف لے آئے اور انہوں نے جنرل عبداللہ ملک کے ساتھ پہلی مرتبہ ملکی صورتِ حال پر گفتگو کی۔ وزیرِاعظم نے جنرل ملک سے دریافت کیا کہ کیا ایجی ٹیشن کو ختم کرنے کے لئے مارشل لاء لگایا جائے۔ جنرل عبداللہ ملک نے اُن کو نفی میں جواب دیا اور کہا کہ حالات کو سول ذرائع سے درست کیا جائے اور سیاسی معاملات میں فوج کو کم سے کم ملوث کیا جائے۔ "یُوں آئین بھی تو اِس کی اجازت نہیں دیتا سر!" جنرل ملک نے اپنے دلائل کے آخر میں کہا۔

"تم نے آئین پڑھا ہے!" مسٹر بھٹو نے قدرے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"ہم تو حلف ہی آئین کے تحت اٹھاتے ہیں سر!" جنرل ملک نے قدرے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

اِس پر مسٹر بھٹو نے انٹرکام اٹھایا اور دریافت کیا "حفیظ پیرزادہ کہاں ہے اسے بھیجو۔"

حفیظ پیرزادہ کے آنے تک بعض مخصوص مقامات پر جزوی مارشل لاء کے نفاذ کے امکانات کا جائزہ لیا جاتا رہا اور جنرل ملک مسلسل اس خیال کو رد کرتے رہے۔ حفیظ پیرزادہ پہنچے تو انہوں نے فوراً رائے دی۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں! کل اسمبلی بلاکر آئین میں ترمیم کریں گے۔" (یہی بات جنرل ضیاء نے کہی تھی وہی پیرزادہ نے کہی)

جنرل ملک نے پھر مخالفت کی اور کہا "سر! ترمیم حالات کو مزید خراب کرے گی اور احتجاج ہوگا۔"

اِس پر وزیرِاعظم نے گویا فیصلہ دیتے ہوئے کہا "یہ سیاسی معاملہ ہے اِسے آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

جنرل عبداللہ ملک نے کہا "ٹھیک ہے سر! آپ اس پر آرمی چیف کی رائے لے لیں۔" میٹنگ ختم ہو گئی

جنرل عبداللہ ملک نے گھر پہنچ کر ساری بات جنرل ضیاء الحق کو بتائی کہ وزیرِاعظم نے انہیں بلایا تھا اور کل وہ غالباً آپ سے اِس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

جزوی مارشل لاء کے نفاذ کے بعد چیف آف آرمی سٹاف اور کورکمانڈرز کے ساتھ میٹنگیں خاصے تسلسل کے ساتھ شروع ہو گئیں اور ان میں سے بیشتر میں حفیظ پیرزادہ اور مسٹر بھٹو کے ساتھ ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جزوی مارشل لاء کے نفاذ نے مکمل مارشل لاء کے نفاذ کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ آئین میں اس کے لئے ترمیم اگلے ہی روز کر دی گئی اور اس کے بعد جرنیلوں کی سوچ بھی مکمل طور پر بدل گئی وہ بجا طور پر یہ سوچنے لگے تھے کہ اگر حفاظت کرنا ہے تو پھر وہ خود کیوں نہ اقتدار سنبھال لیں۔ آخر مسٹر بھٹو کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے' جبکہ قوم کا ایک بڑا حصہ ان کے اقتدار کا مخالف ہو چکا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جرنیلوں کے نام اصغر خاں کا خط بھی اُن کی سوچیں بدلنے کا باعث بنا تھا اور پی این اے کے جن رہنماؤں سے کچھ جرنیلوں کے تعلقات کی رپورٹیں بھی انٹیلی جنس بیورو کے ذریعے مسٹر بھٹو تک پہنچی تھیں' جس کا تذکرہ وزیرِاعظم نے چیف آف آرمی سٹاف سے بھی کیا تھا۔ اس پر جنرل ضیاء الحق نے وزیرِاعظم سے احتجاج کیا تھا کہ انٹر سروسز انٹیلی جنس کی موجودگی میں جرنیلوں کے پیچھے انٹیلی جنس بیورو کو لگانا فوج کی توہین کے مترادف ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیئے۔ وزیرِاعظم نے جنرل ضیاء الحق کو نہ صرف انٹیلی جنس بیورو کی طرف سے جرنیلوں کی نگرانی ختم ہونے کا یقین دلایا بلکہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس اکرم شیخ کو فوری طور پر جرنیلوں کی نگرانی ختم کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیئے۔ وہ ہر صورت میں جنرل ضیاء الحق کو مطمئن کرنا چاہتے تھے اور اُن کی اِس تین

دہانی پر انہیں مکمل بھروسہ تھا کہ قومی اتحاد کے رہنماؤں سے جرنیلوں کے تعلقات کی تحقیقات وہ کرائیں گے۔ چیف آف آرمی سٹاف کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وزیرِ اعظم نے فوری نوعیت کے چند اور فیصلے بھی کئے تاکہ جنرل ضیاء الحق مطمئن ہو سکیں اور ۱۴ مئی کو انہوں نے اس گفتگو کے اگلے ہی روز اکرم شیخ کو ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کے عہدے سے ہٹا کر اپنے سپیشل سیکرٹری راؤ رشید کو ڈی آئی جی مقرر کر دیا۔ اکرم شیخ کو ایف آئی اے کا ڈائریکٹر لگا دیا گیا اور میاں اسلم حیات وٹو کو ایف آئی اے کی سربراہی سے ہٹا کر او ایس ڈی اسٹیبلشمنٹ ڈویژن لگا دیا گیا۔ ان پے در پے اقدامات کے ذریعے مسٹر بھٹو جرنیلوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ وہ اُن کی وفاداریوں پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ انٹیلی جنس بیورو نے اس کے بعد جرنیلوں کی نگرانی مکمل طور پر ختم کر دی اور اسی اقدام نے بیوروکریسی کو پوری طرح باور کرا دیا کہ اب بھٹو حکومت کا خاتمہ قریب ہے اور فوج اقتدار سنبھالنے والی ہے۔ چنانچہ بیوروکریسی کے اہم کل پرزوں نے بھی جرنیلوں سے روابط میں اضافہ کر دیا اور مستقبل کے حکمرانوں کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۲۰ اپریل کو جب وزیرِ اعظم نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی مداخلت کا الزام عائد کیا، اس وقت بھی اقتدار کا انحصار جرنیلوں کی صوابدید پر تھا۔ لیکن مئی کے آخر تک تو صورتِ حال مکمل طور پر اُن کے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور حالات پر جرنیلوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گویا جزوی مارشل لاء کا نفاذ بھٹو کے ہاتھ پاؤں باندھ گیا تھا۔

نواں باب

مذاکرات کے لیڈر

مارشل لاء کے بہروپ کا پردہ چاک کرتے ہیں

مارشل لاء مذاکرات کی ناکامی پر نہیں بلکہ ناکامی
فوجی پلاننگ کے نتیجہ میں آئی

نوابزادہ نصراللہ خان، پروفیسر غفور، مولانا نورانی، کوثر نیازی،
حفیظ پیرزادہ، ایئر مارشل اصغر خان، سردار قیوم، مصطفےٰ جتوئی
کے انٹرویو

ذوالفقار علی بھٹو مذاکرات کے دوران آخری پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں

○

یہ کوئی راز نہیں بلکہ جانی بوجھی اور کھلی حقیقت ہے کہ تمام اندرونی اور بیرونی سازشوں کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو نے ۴ر جولائی تک ملک کے سیاسی معاملات پر قابو پالیا تھا، اور قومی اتحاد سے ان کا سمجھوتہ طے پا گیا تھا۔ ۴ جولائی کو معاہدے کا مسودہ تیار تھا۔ قومی اتحاد کے ۳۲ نکات میں سے ۳۱ نکات منظور کر لیے گئے تھے اور ۳۲ واں نکتہ خود اتحاد والوں نے چھوڑ دیا تھا۔ ۵ر جولائی کو اس معاہدہ پر دستخط ہونا تھے۔ اس ضمن میں نواب زادہ نصراللہ خان نے ۴ر جولائی کو اپنی ایک پریس کانفرنس میں قومی اتحاد کی طرف سے کامیابی کی نوید سنا دی تھی اور یہ پریس کانفرنس نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبار "پاکستان ٹائمز" کے ڈاک ایڈیشن میں شائع بھی ہو گئی تھی اس کی سرخی تھی "فاختائیں جیت گئیں، عقاب ہار گئے"

لیکن ۵ر جولائی کے "پاکستان ٹائمز" کے لوکل ایڈیشن سے یہ خبر حذف کر دی گئی تھی اور اس کی جگہ مارشل لاء نمودار ہو گیا تھا۔

حکومت اور قومی اتحاد کے مذاکرات میں شامل رہنماؤں سے میں نے وقتاً فوقتاً جو انٹرویو لیے ان سب سے یہی حقیقت واضح ہوتی اور یہی تاثر ابھرتا ہے کہ حکومت اور حزب مخالف میں سمجھوتہ ہو گیا تھا اس لیے مارشل لاء قطعی غیر ضروری تھا۔ بھٹو بھی اسی روز اپنی پریس کانفرنس میں اعلان کر چکے تھے کہ پیرزادہ اور پروفیسر غفور کل صبح میٹنگ کریں گے اور شام کو مذاکراتی ٹیم کی میٹنگ میں سمجھوتہ پر دستخط ہو جائیں گے۔ عبدالحفیظ پیرزادہ کا بیان ہے کہ ۴ر جولائی کو معاہدہ ہو چکا تھا، ۵ر جولائی کو پیرزادہ نے اس معاہدہ پر پیپلز

پارٹی کی طرف سے دستخط کرنا تھے۔ معاہدہ کے مسودات پر وفیسر غفور کے پاس تھے جب کہ پیرزادہ نے ان کی ایک نقل چیف آف آرمی سٹاف کو بھی دے دی تھی۔

مختلف سیاستدانوں سے میرے انٹرویو ریکارڈ پر موجود ہیں اور وہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ سمجھوتہ ہو چکا تھا اور مارشل لاء کا کوئی جواز نہیں تھا۔ آیئے ان انٹرویوز کے جستہ جستہ حصوں پر نظر ڈال لیں۔

نوابزادہ نصراللہ خان کا بیان ہے ــــ "کون کہتا ہے کہ مذاکرات کامیاب نہیں ہوئے۔ اختلافات کی وسیع خلیج کو پاٹنے کے لیے بہت سے امور طے کیے جانے تھے گفت و شنید کے بہت سے مرحلے تھے اور یہ سب کچھ ہوا بھی ــــ فوج کے بیچ میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی جس وقت فوج آئی اس وقت مذاکرات مکمل ہو چکے تھے اور فریقین میں سمجھوتہ طے پا چکا تھا۔ یہ طے پایا تھا کہ انتخابات ۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دوبارہ ہوں گے۔ رات بھر ہونے والے مذاکرات کی تفصیلات پر مشتمل مسودہ تیار ہو کر دستخط ہونا باقی تھے لیکن بدقسمتی سے پی این اے پیپلز پارٹی کو سمجھوتہ کی اس دستاویز پر دستخط کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اور اسی رات ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ میرے نزدیک مارشل لاء کا کبھی بھی کوئی جواز نہیں ہوتا۔ جمہوریت کی بدترین شکل بھی مارشل لاء سے بہتر ہوتی ہے۔ پاکستان میں لگنے والے تینوں مارشل لاء (ایوب، یحییٰ، ضیاء) بلاجواز تھے۔ ان کے نتیجہ میں ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔"

سوال: ۲۲ واں نکتہ کیا تھا جو آپ نے واپس لے لیا۔؟

جواب: "یہ کہ وزیراعظم مستعفی ہو جائیں یہ نکتہ ہم نے واپس لے لیا تھا کیوں کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق وزیراعظم کے مستعفی ہو جانے کی صورت میں بھی نئے وزیراعظم کے انتخاب تک بھٹو صاحب اپنے منصب پر قائم رہ سکتے تھے پھر اس نکتے پر اصرار کا بھلا کیا جواز تھا جب بھٹو نے ہمارے ۳۱ نکات منظور کر لیے تو ۲۲ ویں نکتہ کو ہم نے ازخود واپس لے لیا تھا۔ ہم چونکہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے خلاف نہیں تھے اس لیے اپنے نکات کو آئین سے متصادم نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے اپنے تمام مطالبات تسلیم کروا لیے تھے مثلاً یہ کہ انتخابات نئے سرے سے ہوں گے چاروں صوبوں کے گورنر پی این اے کے مشورہ سے مقرر کیے جائیں گے چیف الیکشن کمشنر کا تقرر پی این اے کے مشورہ سے ہوگا۔ ۸ اکتوبر جو انتخابات کی تاریخ تھی اس تاریخ تک سارے نظم و نسق کی نگرانی کیلئے ایک ایسٹیبلشمنٹ کونسل کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کونسل میں پانچ آزاد پیپلز پارٹی سے لیے جانے تھے اور پانچ پی این اے سے اس کونسل میں کسی مسئلہ پر اختلاف کی صورت میں سپریم کورٹ کو ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر اختلافی مسئلے پر اپنا فیصلہ دینا تھا جو کہ دونوں پارٹیوں کے لیے تسلیم کیا جانا واجب تھا۔

ایک مرحلہ پر یہ طے پایا تھا کہ انتخابات تک پیپلز پارٹی اور پی این اے کی مخلوط حکومت قائم کر دی جائے

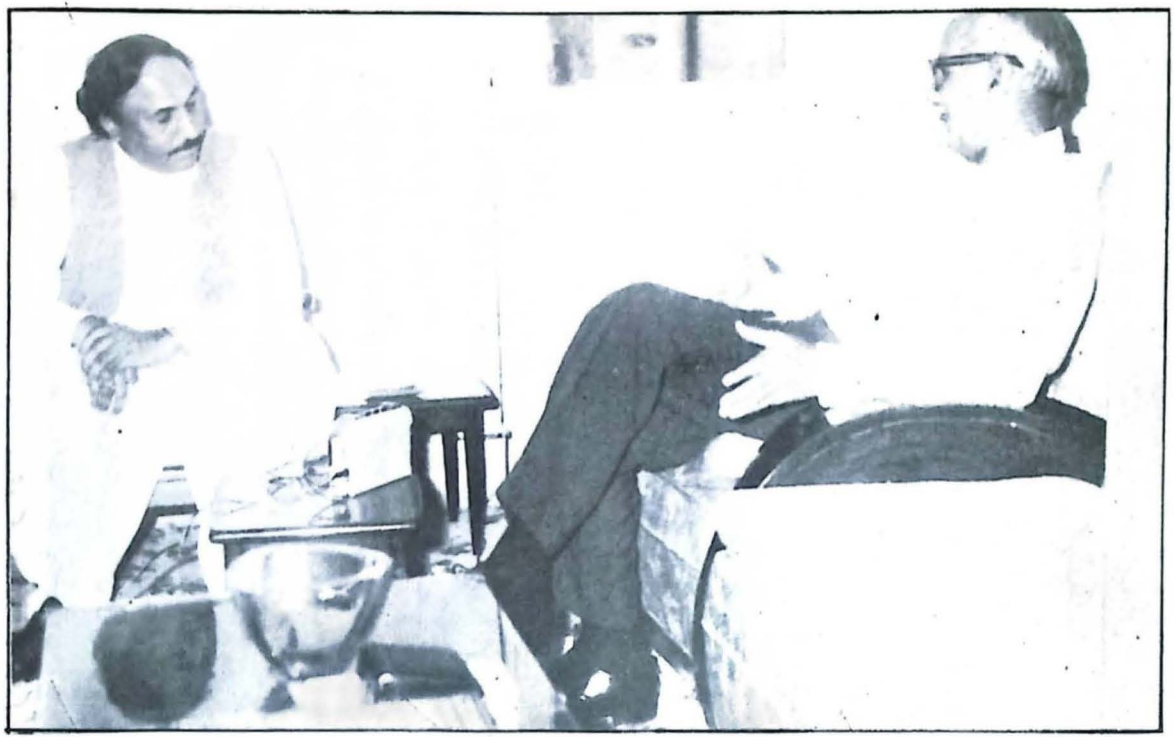

ادیب جاودانی جنرل ٹکا خان سے انٹرویو لے رہے ہیں

جیسا کہ ۱۹۴۶ء میں وائسرائے کی سرکردگی میں عبوری حکومت بنی تھی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے نمائندے موجود تھے۔ پیپلز پارٹی نے کچھ اور پیش کشیں بھی کی تھیں مگر ہم نے قبول نہیں کی تھیں۔"

سوال: مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب "اور لائن کٹ گئی" میں لکھا ہے کہ ایئر مارشل اصغر خان، بیگم نسیم ولی خاں، شیر باز مزاری اور مولانا شاہ احمد نورانی حکومت کے ساتھ کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھے ان کا اصرار تھا کہ اب مارشل لاء کا انتظار کر لیا جائے۔؟

جواب: "میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس لیے نہیں کہوں گا کہ پی این اے اور پیپلز پارٹی کے مذاکرات پر میں خود لکھنا چاہتا ہوں مولانا کوثر نیازی نے اپنے نقطۂ نظر سے ان مذاکرات کا جائزہ لیا ہے۔ اور بہت سے حقائق سے صرفِ نظر برتا ہے یہ حقائق تاریخ کی امانت ہیں اور جس زاویۂ نگاہ سے ان حقائق کو میں نے دیکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ سب کچھ سامنے آجانا چاہیئے۔ راؤ عبدالرشید نے اپنے بیوروکریٹک نقطۂ نظر سے ان حقائق کو اپنے طویل انٹرویو جو میں نے دیکھا" میں بیان کیا ہے اب مذاکرات کی اصل کہانی اور اس کے پسِ پردہ حقائق کو تاریخ کی غلطیاں درست کرنے کے لیے سامنے آجانا چاہیئے۔ دونوں مذاکراتی ٹیموں کے سربراہ مولانا مفتی محمود صاحب اور بھٹو صاحب اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ تاہم میرے اور مولانا کوثر نیازی کے علاوہ پروفیسر غفور اور عبدالحفیظ پیرزادہ موجود ہیں اس قسم کی کتابوں میں لکھنے والے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو ہی نمایاں کرتے ہیں اس طرح اصل حقائق سامنے نہیں آپاتے ـــ میرے پاس اس سلسلہ میں سب کچھ میری ڈائریوں میں نوٹ ہے یہ سب کچھ میرے پاس تاریخ کی امانت ہے۔ پیپلز پارٹی اور پی این اے کے مذاکرات کا جو انجام ہوا یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا اب وقت آگیا ہے کہ میں تاریخ کا یہ قرض لوٹا دوں یہ مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے ان مذاکرات کو فوجی مداخلت سے عمداً ناکام بنایا گیا اور اس طرح ملک اور قوم سے ایک تاریخی بے وفائی کے ذریعے اس ملک کو تباہی کے دہانے پر جا کھڑا کیا گیا ـــ پی این اے اور پیپلز پارٹی، ملک میں دو ہی سیاسی قوتیں تھیں تیسری کوئی سیاسی قوت ملک میں موجود نہیں تھی اگر دونوں سیاسی قوتیں سمجھوتے

کا اعلان کر دیتیں تو پھر کسی فوجی طالع آزما کو قطعاً جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی ایوانِ اقتدار کی طرف دیکھتا۔ فوجی طالع آزماؤں نے اس وقت اقتدار پر شب خون مارا جب انہیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ نئے دن کا آفتاب اپنے دامن میں قوم کے لیے نئے انتخابات کی نوید اور سمجھوتے کی روشنی لے کر آئے گا۔ سمجھوتے پر فریقین کے دستخطوں میں تاخیر اس لیے بھی ہوئی کہ قومی اتحاد کی

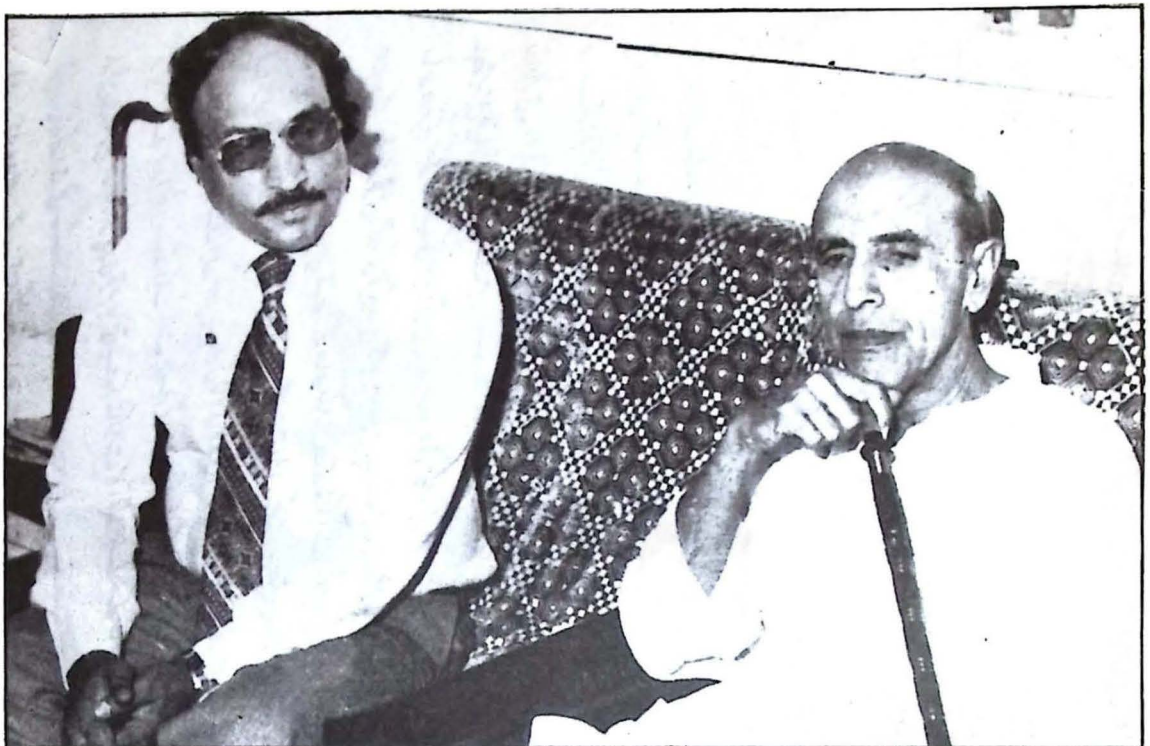

ادیب جاودانی نوابزادہ نصر اللہ خاں سے انٹرویو کرتے ہوئے

سوچ میں یکسانیت نہیں تھی۔"

سوال ، نوابزادہ صاحب : آپ بھٹو کے ساتھ پی این اے کے مذاکرات میں ہر مرحلہ پر شامل رہے ان مذاکرات میں افواجِ پاکستان کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا جاتا رہا آپ کے خیال میں فوجی جرنیلوں نے مارشل لاء کا منصوبہ کتنا عرصہ پہلے بنایا تھا ؟

جواب ، فوجی طالع آزماؤں نے بھٹو کو بہت جلد راستے سے ہٹا دینے کی مساعی کر ڈالی تھی بھٹو کو اقتدار میں لانے کے صرف چند ماہ بعد جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خاں نے ٹیک اوور کرنے کی سازش بنالی یہ سازش ناکام ہوگئی۔ بعد میں ان دونوں کو ریٹائر کر کے سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا جب پی این اے اور پیپلز پارٹی کے مابین محاذ آرائی شروع ہوئی تو فوجی طالع آزماؤں نے وردی سمیت سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تینوں ڈیفنس سروسز کے چیفس نے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف سمیت پریس کانفرنس کر کے پیپلز پارٹی کی حمایت میں ایک مشترکہ بیان دیا یہ پہلا موقع تھا جب مجھے اس امر کا گمان گزرا کہ ان جرنیلوں میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہے جو اقتدار میں آنے کی خواہش رکھتا ہے اور موقع ملنے پر وہ ٹیک اوور کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ میں نے بھٹو صاحب کو انتباہ کیا کہ وہ جرنیلوں کو سیاست کی چاٹ نہ لگائیں مگر ان کا خیال تھا کہ جرنیل ان کے وفادار ہیں وہ پی این اے کے رہنماؤں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ انھیں فوج کی پشت پناہی حاصل ہے جنرل ضیاء الحق کو مذاکرات میں لانے لگے مذاکرات کے دوران میری ان کے (ضیاء الحق کے) ساتھ دو مرتبہ بھٹو صاحب کی موجودگی میں جھڑپ ہوئی ضیاء الحق نے یہ بات تو شدت کے ساتھ محسوس کر لی تھی کہ قومی اتحاد کی تحریک پر قابو پانا حکومت کے بس میں نہیں۔ تب انھوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ پی این اے کے ساتھ حکومت کے مذاکرات ناکام رہیں جب تک جنرل ضیاء کو یہ یقین رہا کہ مذاکرات کامیاب نہیں ہوں گے وہ تماشا دیکھتے رہے جب انہیں یقین ہوگیا کہ مذاکرات کامیاب ہوگئے ہیں اور اب ان کی ناکامی کا کوئی امکان نہیں انہوں نے اسی رات ٹیک اوور کر لیا اس کے بعد انہوں نے ایک بات بڑے تواتر سے کہی کہ ملک میں سول وار ہو رہی تھی اس لیے مارشل لاء ناگزیر تھا حالانکہ پوری قوم جانتی ہے کہ مذاکرات کا آغاز ہونے کے ساتھ قومی اتحاد نے اپنی تحریک بند کر دی تھی۔"

سوال ، نواب زادہ صاحب صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خاں نے مجھے ایک ملاقات کے دوران بتایا تھا کہ بھٹو نے پی این اے کے لیڈروں کو بہت پہلے انتباہ کر دیا تھا اگر وہ (پی این اے والے)

ادیب جاودانی آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان سے انٹرویو کرتے ہوئے

مذاکرات کو کامیاب نہیں بناتے تو وہ (بھٹو صاحب) ملک کو فوج کے سپرد کر دیں گے ؟

جواب: "بھٹو صاحب نے ایسا کبھی نہیں کہا میرے علاوہ بھی مذاکراتی ٹیموں کے اراکین حیات ہیں پروفیسر غفور ہیں، عبدالحفیظ پیرزادہ ہیں اور مولانا کوثر نیازی ہیں وہ سب گواہ ہیں کہ بھٹو صاحب نے ایسی کوئی بات کبھی نہیں کہی تھی۔"

پروفیسر عبدالغفور سے پوچھا گیا۔

"سنا ہے آپ نے بھٹو مرحوم سے ملاقات کے دوران کہہ دیا تھا کہ اگر آپ نے قومی اتحاد سے ہونیوالے مذاکرات کو طول دیا تو ملک میں مارشل لا لگ جائے گا کیا آپ کو پہلے سے اس بات کا علم تھا ؟"

جواب: "ہاں۔ لیکن میں نے یہ کسی علم کی وجہ سے نہیں کہا تھا وہ میرا ایک سیاسی تجزیہ تھا ملک میں ایک تحریک چل رہی تھی اور پیپلز پارٹی مذاکرات کو طول دے رہی تھی ہر شخص اندازہ لگا سکتا تھا کہ اگر مذاکرات طول پکڑ گئے تو مارشل لا لگ جائے گا میں نے یہ بات بھٹو صاحب سے کہی تھی آپ نوابزادہ نصراللہ، کوثر نیازی اور حفیظ پیرزادہ سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر بھٹو صاحب کا جواب یہ تھا کہ ہم حالات سے نمٹ سکتے ہیں، میں نے بھٹو سے کہا تھا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان معاہدہ طے پا چکا ہے لیکن آپ مسودے میں تبدیلیاں کر رہے ہیں اور جب تک آپ تبدیلیوں پر اصرار کریں گے مارشل لا لگ جائے گا۔ یہ ایک فطری نتیجہ تھا۔"

سوال: ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات کے دوران بھٹو صاحب غیر ملکی دورہ پر کیوں چلے گئے تھے ؟

جواب: یہ تو انھوں نے ہمیں بھی نہ بتایا۔ انھوں نے یہی کہا تھا کہ میں بہت تھک گیا ہوں لاڑکانہ جا کر آرام کرنا چاہتا ہوں، ہم نے کہا کہ ساری باتیں آپ طے کر چکے ہیں کیوں نہ ایک دن میں یہ کام مکمل کر لیں پھر جا کر آرام کریں ہم بھی بہت تھک گئے ہیں انھوں نے ہمیں یہ نہیں کہا تھا کہ میں غیر ملکی دورے پر جا رہا ہوں، یہ معاہدہ ایک ہفتے میں ہو سکتا تھا۔ جسے ایک مہینے تک طول دیا گیا۔

سوال: یہ جو معاہدہ نہ ہو سکا تو کیا سیاسی جماعتوں کا بھی اس میں کوئی قصور تھا ؟

جواب: جی ہاں، پاکستان قومی اتحاد کے اندر بھی بہت سے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ معاہدہ نہ کیا جائے اور مارشل لاء لگے۔ لیکن اکثریت نے ان کی بات نہ مانی۔

سوال: وہ با اثر سیاستدان جو ملک میں مارشل لاء لگنے کے حامی تھے کیا انہیں بعد میں اس سے کوئی فائدہ پہنچا ؟

جواب: قومی اتحاد کے لیڈروں نے باقاعدہ بیانات دیئے تھے کسی بند کمرے میں یہ بات نہیں کہی تھی بلکہ کچھ اور لوگوں نے فوج کو خط لکھے تھے کہ آپ مارشل لاء لگائیں تاکہ ملک میں خونریزی ختم ہو اور انتخابات کی راہ ہموار ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایمانداری کے ساتھ یہ بات سوچتے تھے کہ پاکستان پیپلز پارٹی معاہدہ

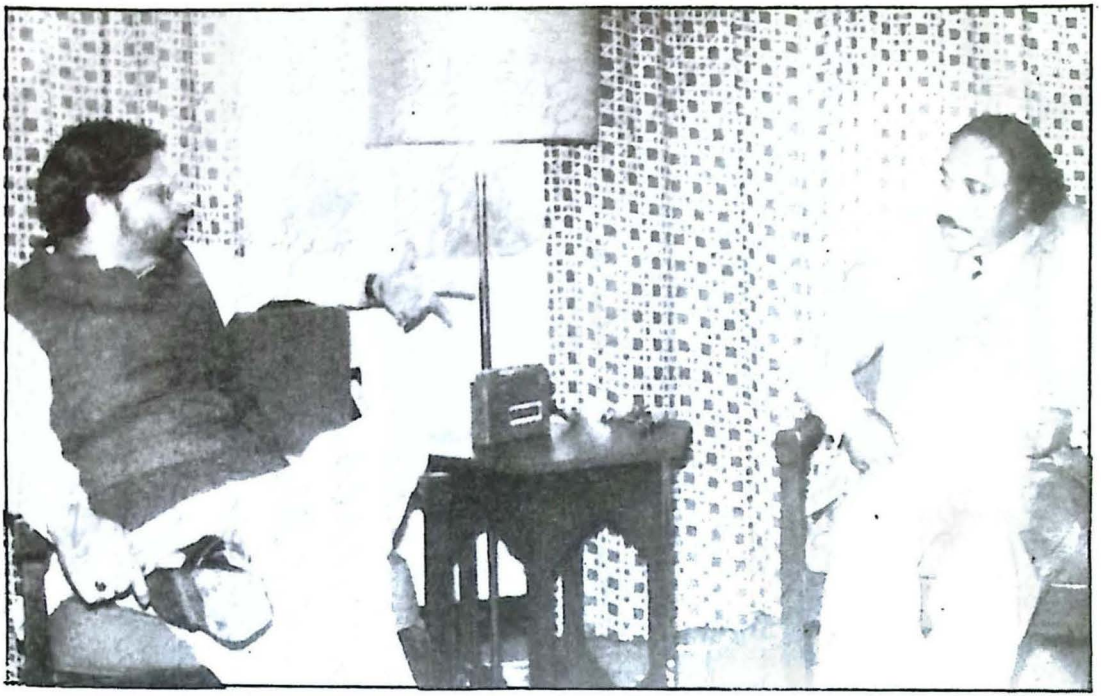

ادیب جاودانی مولانا کوثر نیازی سے انٹرویو لے رہے ہیں

کرے گی مگر انتخابات نہیں کروائے گی اور اگر کروائے گی تو وہ منصفانہ نہیں ہوں گے فوج کے ساتھ ان کا باقاعدہ رابطہ تھا۔ مثلاً ایئر مارشل اصغر خان یہ سمجھتے تھے کہ فوج کا آدمی کوئی غلط بیانی نہیں کرے گا فوج کا آدمی سیاسی آدمی نہیں ہوتا وعدے کرے گا تو پورے کریگا اور انتخابات کروائے گا۔

سوال: سنا ہے ان دنوں قومی اتحاد کے لیڈروں کو اصغر خان نے یقین دہانی کرائی تھی کہ فوج ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات کروا دے گی؟

جواب: انہوں نے سب کی موجودگی میں مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ میں شخصی طور پر اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ فوج ۹۰ دن میں انتخابات کروا دے گی اس وقت ان سے کہا گیا کہ آپ کی شخصی ضمانت کیوں کر قبول کریں؟ اس فوج میں آپ کی پوزیشن کیا ہے؟ آپ یہ کس حیثیت سے کہتے ہیں کہ میں شخصی طور پر ضمانت دیتا ہوں کہ فوج انتخابات کروا دے گی آپ ریٹائرڈ ہیں مارشل لاء آپ تو نہیں لگائیں گے لیکن ان کا خیال تھا کہ فوج وعدے سے نہیں پھرے گی اور جو بات کرے گی بالکل ٹھیک کرے گی۔

مولانا کوثر نیازی سے دریافت کیا گیا کہ مذاکرات کے آخری مرحلہ پر بھٹو اچانک بیرونی ممالک کے دورہ پر کیوں گئے تھے اور اس دورہ کے مذاکرات پر کیا اثرات ہوئے؟

مولانا کوثر نیازی نے کہا "بھٹو صاحب کی سیاست میں جہاں تدبر اور ذہانت تھی وہاں ایک عنصر شعبدہ بازی کا بھی تھا اس عنصر کو بسا اوقات ان کے قریبی رفقاء بھی نہیں سمجھ پاتے تھے جب پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ اصولی طور پر سمجھوتہ ہو چکا تھا اس مرحلے پر فریقین کے دستخطوں سے پہلے جب انہوں نے اچانک چند بیرونی ممالک کا دورہ کرنے کا پروگرام بنا لیا تو یہ بات انتہائی چونکا دینے والی تھی میں نے ان سے کہا تھا کہ بیرونی ممالک کے دورے کا یہ کونسا وقت ہے آپ کی غیر حاضری میں بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں آپ کو اس مرحلہ پر ملک سے باہر نہیں جانا چاہیئے لیکن چونکہ اس وقت تک مذاکرات کی کامیابی کا تاثر پیدا ہو گیا تھا اور یہ خبر آچکی تھی کہ سمجھوتہ ہونے کو ہے اس لیے وہ یہ نفسیاتی تاثر ڈالنے کے بعد مطمئن تھے کہ اب حالات ان کی گرفت میں ہیں ــــ آنے والے واقعات نے ثابت کیا کہ ان کا فیصلہ دانشمندانہ نہیں تھا۔ خالی گھر جنوں کا مسکن ہوتا ہے مختلف عناصر کے مابین ہونے والی سیاسی گفتگوؤں کے نتیجہ میں بالآخر سمجھوتہ پر فریقین کے دستخط نہ ہو سکے اگر وہ یہ دورہ نہ کرتے اور سمجھوتے پر اپنی توجہ

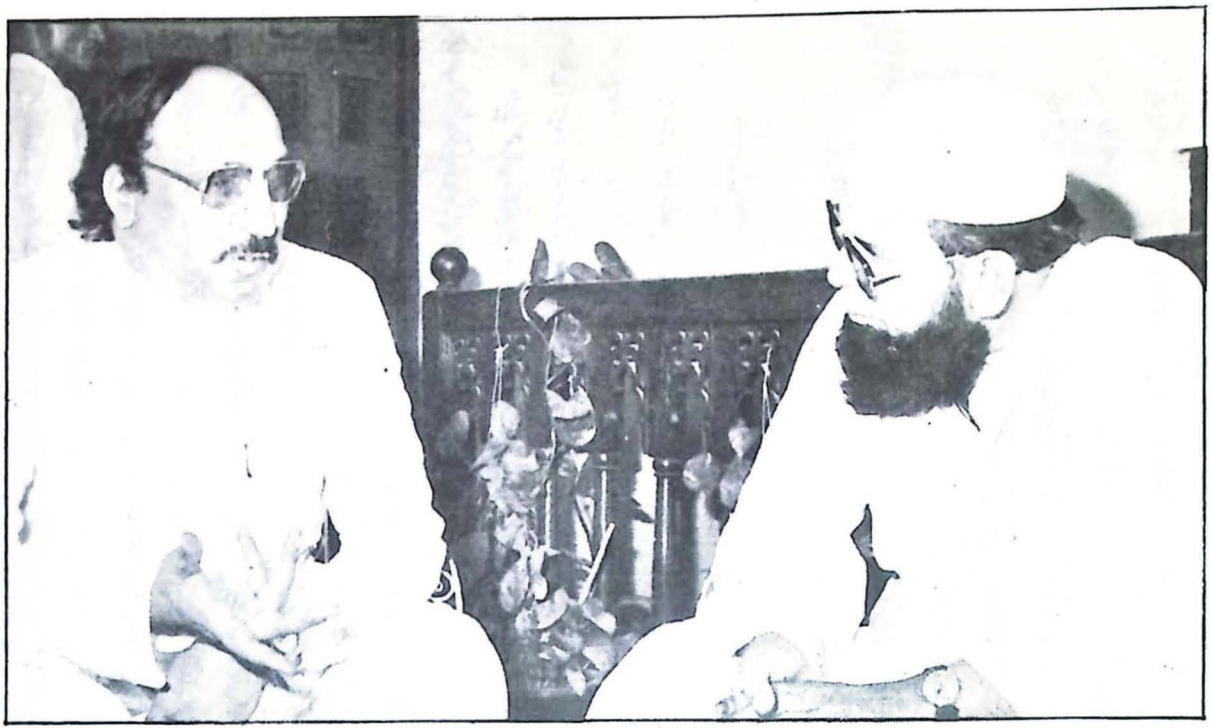

ادیب جاودانی اور مولانا شاہ احمد نورانی

مبذول رکھتے مذاکراتی ٹیموں کو مین میخ نکالنے کے لیے وقت نہ ملتا اور سمجھوتے پر دستخط ہو کر اس کی خبر نشر ہو جاتی تو یہ ملک اور قوم کے لیے اور خود فریقین کے لیے بہت اچھا ہوتا۔

سوال : مولانا صاحب، بعض حلقوں کا خیال ہے کہ بھٹو مرحوم کو فوج کے عزائم کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مارشل لاء لگ جائے گا مگر انہوں نے عمداً ایسا ہونے دیا؟

جواب : جاودانی صاحب، یہ بات تو میں نے بھی بھٹو مرحوم کو بتائی تھی کہ حالات حکومت کے کنٹرول سے باہر ہو رہے ہیں اور ان حالات میں فوج آجائے گی میں نے یہ بات مئی ۱۹۷۷ء میں کہی تھی اور بھٹو مرحوم نے میرے تجزیے سے اتفاق کیا تھا مگر میرے خیال میں یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ بھٹو نے مارشل لاء کو خود لگنے کا موقع دیا وہ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ شاید حالات میں کوئی بہتری پیدا ہو جائے۔

بھٹو کی سب سے بڑی غلطی،

جمعیت العلمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی سے "مون ڈائجسٹ" کے لیے ایک انٹرویو کے دوران دریافت کیا گیا۔

سوال : جیسا کہ آپ نے تسلیم کیا ہے کہ بھٹو انتہائی زیرک اور ذہین سیاستدان تھے، وہ انتہائی محنتی اور مدبر وزیراعظم بھی تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اتنی جلد زوال کیوں آیا اور وہ ناکام کیوں ہوئے؟

جواب : بھٹو، بنیادی طور پر عوام سے ووٹ لے کر آئے تھے مگر انہوں نے ایسی غلطیاں کیں جن کا انہیں نقصان ہوا انھوں نے آئین میں پانچ چھ ترامیم کیں بعد ازاں جب حالات خراب ہوتے تو مذاکرات کرنے میں تاخیر کی اور جب مذاکرات شروع ہوتے تو فیصلہ کرنے میں تاخیر کی انہیں چاہیئے تھا کہ وہ سیاسی اداروں کو مضبوط کرتے مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔ اپوزیشن کو بھی مستحکم نہ کیا، پریس پر بھی پابندیاں رکھیں، آئین میں ترامیم کرتے وقت اپوزیشن کو اعتماد میں نہیں لیا عوام کے نمائندوں کو اختیارات کے ذریعہ، باتیں کرنے سے روکا۔ یہ بڑی بنیادی باتیں تھیں جو غلط ہوئیں، ذوالفقار علی بھٹو سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ عوام نے انہیں بڑی محبت سے اور امیدوں سے قیادت بخشی لیکن جب ان کے لیے دوبارہ عوام کے پاس جانے کا وقت آیا تو انھوں نے عوام پر اعتبار نہ کیا اور انتخابات میں دھاندلی پر انحصار کیا اس کی وجہ سے ان کی سیاسی جماعت بحران کے وقت مفلوج ہو گئی اور نہ صرف وہ خود اقتدار سے علیحدہ ہوئے بلکہ ۱۹۷۳ء کا آئین بھی معطل ہوا۔ اور پھر اس آئین کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خاں سے پوچھا گیا کہ آخری دنوں میں بھٹو صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں اتحاد کے لیڈروں سے کہا تھا کہ اگر انہوں نے کوئی سمجھوتہ نہ کیا تو فوجیں آجائیں گے ایئر مارشل اصغر خان نے فوجی افسروں کو خط بھی لکھا تھا کیا اس وقت بھی بھٹو صاحب کو ہوش نہ آیا ؟

جواب : میرا خیال ہے کہ بھٹو صاحب جس چیز پر چل رہے تھے اس پر چلنے والا بالآخر پھنس جاتا ہے وہ کنفیوز ہو گئے تھے بھٹو صاحب جو اپنی قوت فیصلہ کے لیے بڑے مشہور تھے وہی بھٹو اس مرحلہ پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے وہ کبھی لیبیا جاتے کبھی ادھر کبھی اُدھر — کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ، یہ سب اُن کے کنفیوژن کا اظہار تھا مذاکرات میں ان کی کمزوری کا ثبوت تھا۔ میں نے بھٹو صاحب کو پیغام بھجوایا تھا کہ آرمی آرہی ہے اسے اپنے ذمے نہ لیں۔

سوال : آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ آرمی آرہی ہے ؟

جواب : ہمیں امریکہ کے واقعات کا پتہ چل جاتا ہے ساری دنیا کی خبریں آجاتی ہیں اپنے گھر میں رہتے ہوئے اس کا پتہ نہیں چل سکتا تھا ؟ مولانا کوثر نیازی نے بھی اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے "۳ جولائی کی صبح سردار عبدالقیوم مجھ سے ملنے آئے اور بیٹھتے ہی کہنے لگے " ہمارے بعض لیڈروں کا آرمی سے رابطہ ہے اور خطرہ ہے کہ آرمی ٹیک اوور نہ کر لے آپ مسٹر بھٹو سے کہیں کہ وہ سمجھوتے پر دستخط کرنے میں تاخیر کریں بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ مجھے اور مفتی صاحب کو بھٹو صاحب سے ملوا دیں "

میں کابینہ کے اجلاس سے لیٹ ہو رہا تھا لیکن سردار عبدالقیوم کے سنسنی خیز انکشاف کے بعد میں نے اپنے بیڈ روم میں آکر گرین لائن پر وزیراعظم سے رابطہ کیا اور انہیں سردار صاحب کے انتباہ سے آگاہ کیا۔ وزیراعظم غالباً ناشتہ کر رہے تھے ساری بات سُن کر بولے "یار، انہیں چھوڑو یہ لوگ فقط مجھ سے انٹرویو لینے کے بہانے تلاش کر رہے ہیں" "یا خدا" میں ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا ان نازک لمحات میں بھی انہیں کس شدت سے یہ احساس تھا کہ ان سے ملنا کتنا اہم ہے ؟

میں نے سردار عبدالقیوم سے معذرت کی اور بتایا کہ اس وقت تو بہت ضروری اجلاس میں جا رہا ہوں واپسی پر انہیں بتا سکوں گا کہ وزیراعظم سے ان کی ملاقات کب ہو سکتی ہے ؟ میں بھیانک سوچوں کے سمندر میں غرق کابینہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے پی ایم ہاؤس پہنچا تقریباً پون گھنٹہ پہلے اجلاس شروع ہو چکا تھا جونہی میں کیبنٹ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا میری نظر جنرل ضیاء پر پڑی جو وزیراعظم کے بالمقابل بیٹھے ہوئے تھے مجھے دیکھتے ہی مسٹر بھٹو مسکراتے ہوئے بولے ،

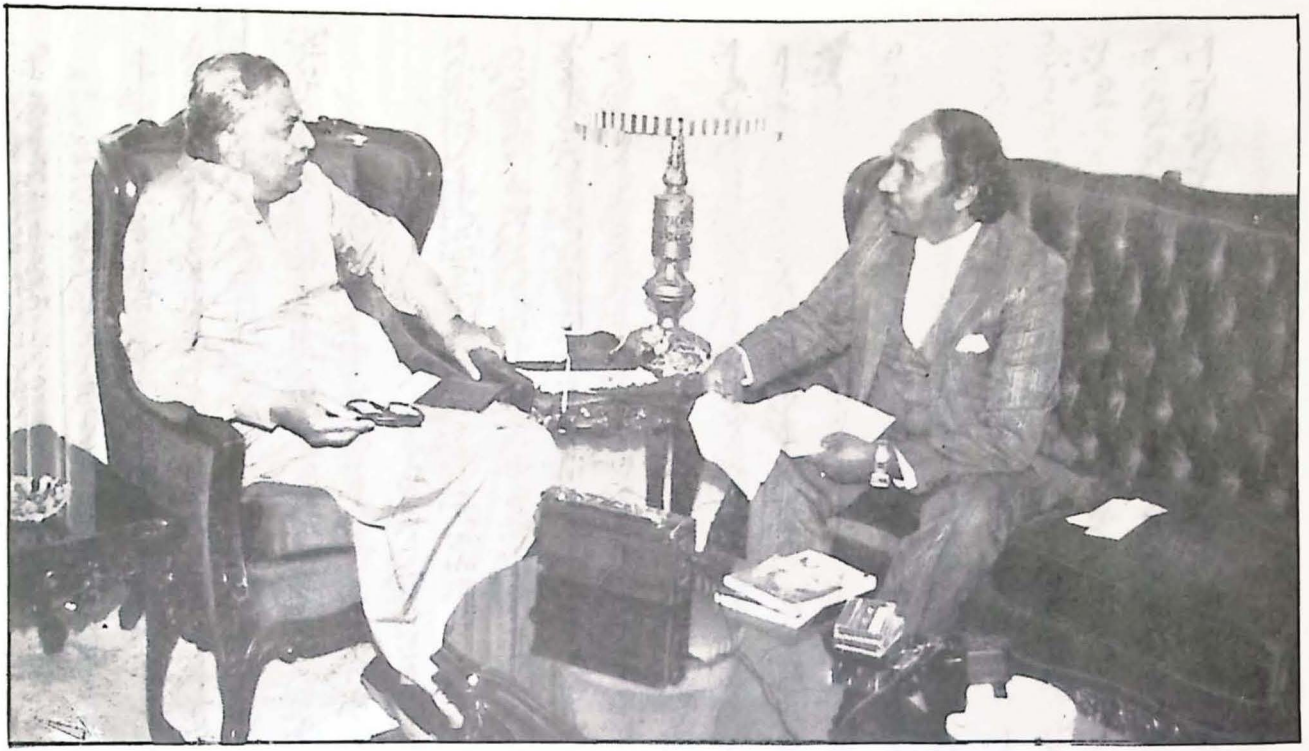

ادیب جاودانی غلام مصطفےٰ جتوئی سے انٹرویو لے رہے ہیں

"لو وہ آگئے، اب خود ہی سردار صاحب سے ہونے والی بات بتائیں گے" غالباً یہی موضوع زیر بحث تھا میں نے اختصار کے ساتھ سردار عبدالقیوم سے ہونے والی گفتگو سے کابینہ کو آگاہ کیا، جنرل ضیاء الحق شاید پہلے ہی سردار عبدالقیوم کے خدشات کو مسترد کر چکے تھے۔ وزیراعظم نے دیگر وزراء کو اس پر اظہارِ خیال کی دعوت دی تو سب سے پہلے حفیظ پیرزادہ نے اسے پی این اے کا "نیا شوشہ" قرار دیا پھر میں نے دیکھا کہ اکثر وزراء ان کے ہم خیال تھے اور وزیراعظم کی مدح سرائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے میں نے بھٹو کو دعوت دی اور کہا کہ یہ الوداعی دعوت ہے اس کے دو گھنٹے بعد مارشل لاء لگ گیا۔

سردار عبدالقیوم کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ پی این اے کے اندر کچھ ایسے عناصر تھے جنہیں یقین تھا کہ وہ منصفانہ انتخابات میں نہیں جیت سکتے اس لیے بھٹو کو ضرور ہٹانا چاہیئے جو مارشل لاء کے ذریعہ ہی ممکن تھا اس لیے وہ مارشل لاء کے خواہشمند تھے انھوں نے خود مجھ سے کہا کہ چھوڑو بھی، کیا بات کرتے ہو جمہوریت کی اور انتخابات کی — فوج کو آنے دو، فوج آئے گی اور ۹۰ دن کے اندر اندر اقتدار ہمیں دے دے گی قرائن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوج نے کوشش کی کہ مذاکرات کامیاب نہ ہوں تاکہ بہرصورت ہم آجائیں ان کی پلاننگ مجھے اس قسم کی دکھائی دیتی تھی کہ وہ مذاکرات کی ناکامی کے نتیجہ میں نہیں آئے بلکہ ناکامی ان کی پلاننگ کے نتیجہ میں آئی۔

غلام مصطفےٰ جتوئی سے ملاقات ہوئی اور راقم نے ان سے دریافت کیا کہ بھٹو نے اپنے آخری دنوں میں اتحاد کے رہنماؤں کو انتباہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کوئی سمجھوتہ کر لیں وگرنہ "فرشتے" آجائیں گے یا پھر کوئی راسپوٹین بھی آسکتا ہے —

جناب جتوئی نے واضح کیا کہ یہ بات صرف جلدی سمجھوتہ کر لینے کے لیے کہی گئی ہوگی کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ بھٹو کو مارشل لاء کا اتنا سخت اندیشہ ہوتا اور وہ اس کی روک تھام کے لیے کچھ نہ کر پاتے وہ اتنے ذہین اور طاقتور ضرور تھے کہ اگر انہیں مارشل لاء کا اشارہ بھی ہو جاتا تو وہ اس کا توڑ کر سکتے تھے اس لیے میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ بھٹو کو مارشل لاء لگنے کا اشارہ مل گیا تھا۔

ان سے دریافت کیا گیا کہ یہ ممکن ہے کہ بھٹو نے انتخابات میں دھاندلی کو تسلیم کرنے کی بجائے یہ بہتر سمجھا ہو کہ مارشل لاء کو آنے دیا جائے اور انھوں نے دانستہ اس سے چشم پوشی کی ہو از سرِ نو انتخابات سے انہیں اپنی مقبولیت کم ہونے کا خطرہ ہو جب کہ مارشل لاء کی صورت میں وہ مظلوم بن کر سامنے آتے اور زیادہ مقبولیت پاتے۔

جتوئی صاحب نے کہا کہ بھٹو تو پہلے ہی پاکستان کے سب سے مقبول لیڈر تھے، انہیں مارشل لا کا ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ ایک زیرک سیاستدان تھے اور سمجھتے تھے کہ فوج ایک بار آ جائے تو پھر اس کی واپسی مشکل ہوتی ہے۔ خون خرابے کے بغیر یہ واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

پوچھا گیا کہ مذاکرات کے آخری مرحلہ میں اچانک غیر ملکی دورہ کی کیا تک تھی؟ ایسا کیا مشن تھا جس کے لیے وہ بیرونِ ملک گئے جب کہ اس دورہ سے سمجھوتہ میں تاخیر ہوئی اور فوج کو ٹیک اوور کا موقع مل گیا، کیا یہ دورہ سیاسی غلطی نہیں تھا۔؟

جتوئی صاحب نے کہا۔

"محسوس تو یہی ہوتا ہے کہ بھٹو صاحب کو اس وقت غیر ملکی دورہ پر نہیں جانا چاہیئے تھا خود مجھے یہ دورہ عجیب سا لگا تھا میں نے بے چینی محسوس کی تھی میرا دل کہہ رہا تھا کہ میرا قائد غلطی کر رہا ہے، چنانچہ میں نے انہیں فون کر کے اپنی کیفیت بیان کی تو انھوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں واپس آ کر بتاؤں گا کہ یہ دورہ کیوں ضروری تھا؛ میں خاموش ہو گیا پھر اسلام آباد واپس آ کر انھوں نے مجھے بلایا بھی، مگر میرا خدشہ دُور ہو گیا تھا مذاکرات پھر شروع ہو گئے تھے اور بالآخر کامیاب ہو گئے تھے مگر عین اسی مرحلہ پر انہوں نے ٹیک اوور کر لیا۔ اس کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ اتحاد کے ساتھ سمجھوتہ ہو گیا تھا صرف دستخط ہونا باقی تھے اور ان تمام حالات سے جنرل ضیاء آگاہ تھے اس کے باوجود انھوں نے ٹیک اوور کیا ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اگر بھٹو اس وقت غیر ملکی دورہ پر نہ جاتے تو ملک کو یہ طویل ترین مارشل لا نہ دیکھنا پڑتا بہر حال یہ ہمارا مقدر تھا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا اور خدا کو یہی منظور تھا۔

مارشل لاء کی کہانی

اصغر خان کی زبانی

پاکستان تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) محمد اصغر خان کا شمار پاکستان قومی اتحاد کے ان راہنماؤں میں ہوتا ہے جنہیں پیپلز پارٹی کے ساتھ پی این اے کے مذاکرات کے دوران ہارڈ لائنر سمجھا جاتا رہا ہے انہوں نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ "بھٹو کا اقتدار چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ملک بھر میں ہونے والے مظاہروں کو دبانے کے ساتھ ساتھ اس صورت حال کی شدت کو کم کرنے کے لیے انہوں نے قومی اتحاد کو مذاکرات کی میز پر لانے کا فیصلہ کیا۔ مذاکرات کا آغاز کرنے کے لیے ۲۰ اپریل کو مفتی محمود کو ہری پور جیل

ادیب جاودانی ایئر مارشل اصغر خاں سے مصروف گفتگو

سے راولپنڈی سہالہ کے پولیس ریسٹ ہاؤس میں منتقل کیا گیا۔ اگلے دنوں میں جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد، پروفیسر غفور احمد اور مولانا جان محمد عباسی، پاکستان جمہوری پارٹی کے نواب زادہ نصر اللہ خاں اور جمعیت العلمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی کو ملک کی مختلف جیلوں سے سہالہ لایا گیا۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کی بیگم ولی خان کو بھی خان پور ریسٹ ہاؤس سے سہالہ منتقل کیا گیا۔ مجھے ۲۷ اپریل کو اور آزاد جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے سردار عبدالقیوم کو اس سے اگلے دن سہالہ لایا گیا۔ پیر پگاڑا کو نظر بند نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اسلام آباد میں تھے انہیں ہمارے ساتھ مشورہ کرنے کے لیے ملاقات کی اجازت تھی۔

میرے سہالہ آنے کے دوسرے ہی دن ہمارے سب سے پہلے ملاقاتی سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب تھے۔ وہ ہمارے لیے شاہ خالد کا پیغام لے کر آئے تھے کہ بھٹو کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے وہ سہالہ میں اکثر ہمیں ملنے آتے اور ان کی حتمی کوشش یہ تھی کہ ہم دوبارہ انتخابات کروانے کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں۔ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ کی ہم سے ملاقات کا بھی یہی مقصد تھا ان ملاقاتوں کے دوران ہم نے ان دونوں حضرات پر اپنا حتمی نقطۂ نظر واضح کیا۔ جو انھوں نے وزیر اعظم تک پہنچا دیا۔ سہالہ میں قیام کے دوران مفتی محمود کو متعدد مرتبہ ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ جہاں ایک مرتبہ لیبیا کے وزیر خارجہ نے ان سے ملاقات کی۔ مفتی محمود نے بعد ازاں ہمیں بتایا کہ لیبیا کے وزیر خارجہ ان سے لیے گفتگو کر رہے تھے جیسے وہ بھٹو کے کوئی وزیر ہوں۔ انہوں نے مفتی محمود سے ملاقات کے بعد پریس کے لیے ایک بیان میں قومی اتحاد پر الزام لگایا کہ وہ امریکہ کی ایک عالمی سازش میں شامل ہے۔ چند دن پہلے ۲۸ اپریل کو پارلیمنٹ کے ایک مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے بھی قومی اتحاد پر یہی الزام لگایا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا کہ پریس کے لیے بیان دینے سے پہلے لیبیا کے وزیر خارجہ کی اچھی طرح بریفنگ کی گئی تھی۔ پارلیمنٹ سے اسی خطاب کے دوران بھٹو نے برطانیہ، مغربی جرمنی اور مصر کے خلاف بھی سخت ترین الزام تراشی کی تھی۔

قومی اتحاد پر بھٹو کی طرف سے الزام تراشی تو سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اس مشکل صورت حال سے نپٹنے کے لیے اس قسم کے الزامات لگانے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن لیبیا کے وزیر خارجہ کی طرف سے ایسے طرز عمل کا اظہار نہ صرف انتہائی غیر ضروری تھا بلکہ سفارتی آداب کے بھی منافی تھا۔ میں عرب ممالک کے سفیروں سے قومی اتحاد کے مذاکرات کو بے سود سمجھتا تھا۔ یہ ملاقاتیں دراصل ہمیں عرب ممالک میں وزیر اعظم کی مقبولیت اور حمایت سے مرعوب کرنے کے لیے کروائی جا رہی تھیں اور اس عمل میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ہمارے بعض ساتھی ان ملاقاتوں سے وقتی طور پر خاصے مرعوب ہوئے تھے اور ہر بار جب یہ سفیر حضرات اپنی ملاقاتوں میں ہمارے بعض ساتھیوں کو ذرا نرم رویہ اپنانے پر تیار کر جاتے، تو ہمیں بعد میں انہیں پھر اپنے رویے میں سختی

پروفیسر غفور ادیب جاودانی کو مذاکرات کی کہانی سنا رہے ہیں

پیدا کرنے پر آمادہ کرنا پڑتا تھا۔

بھٹو نے ہمارے قیام سہالہ کے دوران سی ایم ایچ راولپنڈی اور سہالہ ریسٹ ہاؤس میں مفتی محمود سے متعدد ملاقاتیں کیں، وزیراعظم جب بھی سہالہ آتے تو مفتی محمود کے علاوہ باقی سب کو اس احاطے کی دو میں سے ایک بیرک میں بھیج دیا جاتا تھا۔ دوسری بیرک جس میں مفتی محمود رہائش پذیر تھے اس میں ڈرائنگ روم بھی تھا۔

بھٹو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں مفتی محمود سے اسی ڈرائنگ روم میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

ایک ایسی ہی ملاقات کے دوران مفتی صاحب کو جو دفاعی مسائل سے نابلد تھے ایک جرنیل۔ نے نقشوں کی مدد سے پاکستان کو درپیش فوجی خطرے سے آگاہ کیا۔ مفتی صاحب ایسی تمام میٹنگوں کے بعد ہمیں اس کی مکمل تفصیل سے آگاہ کرتے تھے انہوں نے اس میٹنگ کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک بڑے نقشے کی مدد سے پاکستان کی سرحدوں کے نزدیک بھارت اور افغانستان کی فوجی تنصیبات اور صف بندی کے متعلق بتایا نقشے پر سُرخ جھنڈیوں میں بھارت اور افغانستان کی فوجی تنصیبات اور مورچہ بندی کو ظاہر کیا گیا تھا جب کہ سبز جھنڈیوں کی مدد سے پاکستان کی تنصیبات اور صف بندی ظاہر کی گئی تھی اور ایک جرنیل مفتی صاحب کو ان سب کی تفصیلات بتانے کے لیے بھٹو کے ہمراہ تھا۔

یہ جرنیل پون گھنٹے تک تفصیلات بیان کرتا رہا جب کہ بھٹو کی نظریں نقشے کے بجائے مفتی صاحب پر لگی رہیں غالباً بھٹو مفتی محمود کے چہرے کے تاثرات سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ متاثر ہو رہے ہیں یا نہیں۔

اس ملاقات کے اختتام پر بھٹو نے مفتی محمود سے کہا۔

"مجھے امید ہے آپ ملک کو درپیش فوجی خطرات سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہوں گے"

مفتی محمود نے جواباً کہا "میں نے یہ تفصیلات بڑے غور سے سنی ہیں اور مجھے ملک کو درپیش فوجی خطرات پر بڑی تشویش ہے"

وزیراعظم نے اپنی بے پناہ خوشی کو چھپاتے ہوئے مفتی محمود سے پوچھا "آپ کے خیال میں اس کا کیا حل ہے۔"

مفتی محمود کا جواب برمحل اور نہایت مختصر تھا کہ ۔ "انتخابات"

اس کے بعد مفتی محمود کو ہمارے سہالہ میں قیام کے دوران اس قسم کی بریفنگ نہیں کی گئی۔

وزیراعظم کو ہم نے تین مطالبات پیش کیے تھے ان کا استعفیٰ نئے الیکشن کمیشن کی تقرری اور دوبارہ انتخابات۔ تاہم مفتی محمود نے پہلے مطالبے میں ترمیم کرتے ہوئے یہ تسلیم کر لیا کہ یہ تو رسماً کہہ دیا گیا تھا اور انتخابات کے انعقاد تک بھٹو کو وزیراعظم رہنے دیا جائے گا۔ بھٹو نے قومی اسمبلی کو توڑنے کے ہمارے مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو پیر پگاڑا سے مصافحہ کر رہے ہیں

وہ اس مسئلے پر ہمارے ساتھ سودے بازی کرنا چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ اُن کے وزراء کی ایک ٹیم ہمارے ساتھ مذاکرات کرے۔ اس کے برعکس ہم نے دوبارہ انتخابات کروانے کا اپنا مطالبہ منظور ہونے سے پہلے ایسی کسی گفتگو کو خارج از امکان قرار دے دیا۔ سہالہ میں مفتی محمود کے ساتھ بھٹو کے مذاکرات میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوئی اور مئی کے آغاز میں یہ واضح ہو گیا تھا کہ کسی تصفیے پر پہنچنا ناممکن ہے۔

باہر قومی اتحاد کی تحریک پیر پگاڑا کی وجہ سے ایک عارضی ناکامی کے علاوہ اپنے اسی جوش و جذبے سے جاری تھی۔ پیر پگاڑا قومی اتحاد کے قائمقام صدر تھے انہوں نے پورے ملک سے راولپنڈی تک لانگ مارچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا زبردست پراپیگنڈہ ہوا۔ سارے ملک سے عوام اس لانگ مارچ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے، عام خیال یہی تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو گرتے ہوئے اقتدار کے خلاف یہ آخری دھکا ثابت ہوگا۔ پولیس کے ذریعے لوگوں کی تلاشی اور سڑکوں کے بند کیے جانے جیسی زبردست پابندیوں کے باوجود بہت سے لوگ راولپنڈی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، وہ لوگ جو راستے کی پابندیوں سے بچ نکلے، انہیں راولپنڈی پہنچنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ ریلیں بند کر دی گئیں، اس طرح راولپنڈی ایک مقبوضہ شہر کا منظر پیش کر رہا تھا۔

پیر پگاڑا، جنہیں وزیراعظم ہاؤس تک اس جلوس کی قیادت کرنا تھی، نہ جانے کیوں ایک رات پہلے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں منتقل ہو گئے، پھر یہ عمل قابلِ فہم تھا کہ انہیں ان کے کمرے میں پابند کر دیا گیا۔ وہاں بھٹو نے ان سے ملاقات کی اور اگلے دن اخبارات میں ان دونوں کی ایک تصویر چھپی جس میں پیر پگاڑا، بھٹو کو ہوٹل سے نکلتے وقت دوستانہ الوداع کہتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ لانگ مارچ جس کا اتنا زیادہ پراپیگنڈہ ہوا تھا۔ جب ناکامی کا شکار ہوا، قومی اتحاد کے کارکن اور وہ لوگ جو اس میں حصہ لینے کے لیے آئے تھے، مایوسی اور ابتری میں مبتلا ہو گئے۔

قومی اخبارات میں پیر پگاڑا کی سہالہ میں آمد و رفت کے بڑے چرچے تھے اور پریس کے ساتھ ان کی بات چیت کے نتیجے میں عوام کو یہ تاثر مل رہا تھا کہ جیسے ہم یہاں ایک لمبی پکنک پر آئے ہوئے تھے، ایک موقع پر جب وہ ہمارے لیے آئس کریم لے کر آئے تو اخبارات میں اس طرح کی کہانیاں چھپیں جیسے ہم یہاں قیام کے دوران دعوتیں اڑاتے ہیں، ان دنوں اخبارات میں جہاں قومی اتحاد کے مظاہروں اور کارکنوں کے ہلاک ہونے کی رپورٹیں چھپ رہی تھیں۔ اس قسم کی خبروں کی اشاعت کارکنوں پر یقیناً اچھا تاثر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ پیر پگاڑا کو اپنی عادات اور پریس کو متواتر بیانات دینے سے باز رکھنے کی تمام کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد ہم میں سے بعض نے یہ سوچا کہ وزیراعظم کے ساتھ مذاکرات میں تو کوئی بھی پیش رفت ہو نہیں رہی۔ بہتر ہے کہ ہم واپس،

میر علی احمد تالپور وفات سے چند روز پیشتر اپنی کراچی کی رہائش گاہ پر ادیب جاودانی سے محو گفتگو

جیلوں میں بھیج دیا جائے تاکہ ہمارے کارکن جو باہر اپنی قربانیاں وجدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں اُن کے حوصلے بلند رہیں۔ اس سلسلہ میں وزیراعظم کو ایک خط لکھنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ خط میں نے لکھا اور مفتی محمود صاحب نے اس پر دستخط کر دیئے اور یہ خط ایک پولیس افسر کو دے دیا گیا جو وزیراعظم تک پہنچانے کے لیے اس خط کا منتظر تھا۔

اسی روز قومی اسمبلی میں چیف آف آرمی سٹاف اور فوج کے دوسرے افسروں کے نام کوٹ لکھپت جیل سے لکھے گئے میرے ایک کھلے خط پر بحث کرنے کے لیے تحریک التوا پیش کی گئی۔ وزیراعظم نے قومی اسمبلی کو بتایا کہ میرے خلاف غداری کے الزام میں قانونی کارروائی کرنے پر غور کیا جا رہا ہے، وزیر دفاع نے کہا کہ میرا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔

اس خط کی تقسیم ایک بڑا مسئلہ تھی لیکن تحریک التوا اور وزیراعظم کی تنقید کی وجہ سے اسے اخبارات پر حکومتی کنٹرول اور سنسر کے باوجود اتنی شہرت ملی کہ میرے خط کو مسلح افواج کے تقریباً سبھی افسروں نے پڑھا۔ بھٹو کے بعض بہی خواہوں نے یہ خط لکھنے پر تنقید کرتے ہوئے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے مسلح افواج کو حکومت کا نظم و نسق سنبھالنے کی دعوت دی ہے۔

یہ خط مسلح افواج کو یہ یاد دہانی کرانے کے لیے لکھا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے اعلیٰ افسروں کے صرف قانونی احکامات کی تعمیل کا عہد کیا ہے۔

یہ خط اقتدار سنبھالنے کا دعوت نامہ نہیں تھا۔

مذاکرات کے نتیجہ میں سمجھوتہ طے پانے کے سلسلہ میں بھٹو دور کے وفاقی وزیر قانون مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۷۷ء کے ان مذاکرات میں یکم اور دو جولائی کی درمیانی رات کو تاریخی موڑ مڑنے کا ایک مرحلہ آیا تھا۔ اُس رات کی بات چیت صبح پانچ بجے تک جاری رہی اس کے باعث "معاہدہ" بھی طے پا گیا۔ حکومت کی طرف سے بھٹو صاحب اور اپوزیشن کی طرف سے پروفیسر غفور اس معاہدہ کی نوک پلک سنوار رہے تھے۔ جو امر طے ہو جاتا اس کے مطابق مسودات میں کانٹ چھانٹ یا تصحیح کر دی جاتی تھی۔ یہ سارا کام ختم ہو گیا تو مفتی محمود نے پیش کش کی کہ اس معاہدہ پر دستخط کر دیئے جائیں لیکن بھٹو صاحب نے اصرار کیا کہ آپ کا تو جماعتوں کا ایک اتحاد ہے اس لئے آپ کو اپنے دوسرے رفقاء سے بھی مشورہ کر لینا چاہیئے۔ مفتی صاحب نے پھر کہا اس کی ضرورت نہیں لیکن بھٹو صاحب نے رسماً بات کر لینے پر زور دیا۔ شرکائے اجلاس نے بھی اس کی تائید کی اور یہ دلیل دی کہ اب تو دستخط ہی کرنا ہیں جو شام تک کسی لمحے بھی ہو جائیں گے۔ اس طرح سمجھوتہ طے پانے کا ایک سنہرا موقع کھو دیا گیا اور دستخط کرنے کا وہ لمحہ پھر کبھی نہ آ سکا۔ کیونکہ دوسری رات قومی اتحاد کی طرف سے مزید دس نکات پر مشتمل مطالبات آ گئے اور اس سے بھی پہلے ۱ر جولائی کی صبح کو چیف آف آرمی سٹاف نے اس

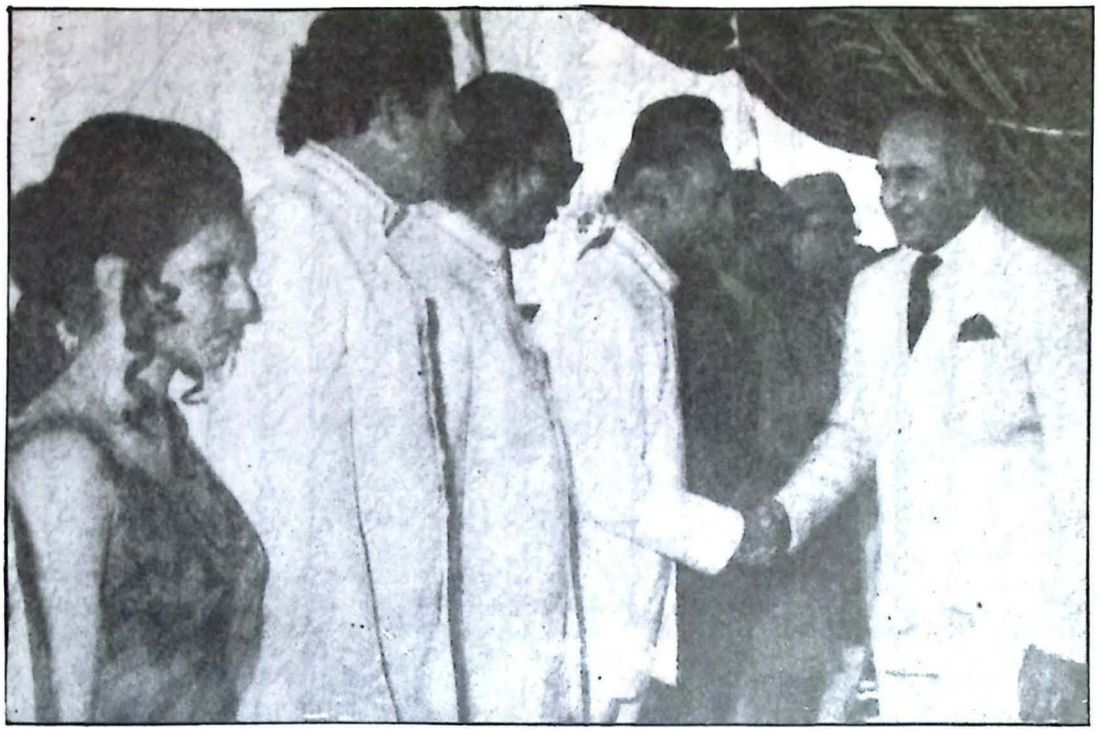

ذوالفقار علی بھٹو مذاکرات کے دوران عرب ممالک کے دورہ پر روانہ ہو رہے ہیں آخر میں حفیظ پیرزادہ اور بیگم پیرزادہ کھڑی ہیں

سمجھوتہ کی ایک کاپی اپنے لئے منگوائی اُن کا کہنا تھا کہ عدلیہ اور فوج نے اس معاہدہ پر عمل کرانا ہے اس لئے انہیں اس سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ یہ ایک رسمی سی بات سمجھی گئی اور کسی نے اس پر سنجیدگی سے کوئی توجہ نہیں دی اور نہ کوئی "خطرہ" محسوس کیا۔ وجہ یہ تھی کہ مئی ۱۹۷۷ء میں فوجی انقلاب کا کچھ خدشہ محسوس ہوا تھا لیکن جب نئے انتخابات منعقد کروانے پر رضامندی کا اظہار ہو گیا اور تمام رہنماؤں نے نئے انتخابات کو قبول بھی کر لیا تو ظاہر ہے کہ سیاسی رہنماؤں کے نزدیک فوجی "ٹیک اوور" کا کوئی جواز نہ رہا تھا۔ البتہ ۱۵ مئی سے پہلے بعض کور کمانڈروں کا دباؤ تھا کہ فوج میں بے چینی ہے اس لئے دونوں فریق آپس میں کوئی معاہدہ کیوں نہیں کرتے۔ اس دباؤ کا اظہار وفاقی کابینہ کے اجلاسوں میں اور بعض دوسرے پلیٹ فارموں سے کیا گیا۔ کابینہ کے اجلاسوں میں جرنیل بریفنگ کے لئے آتے رہے تھے اور یہ کوئی خاص یا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ البتہ مجھے بعض لوگوں کے اس دعوے کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ بھٹو صاحب نے جنرل ضیا کو باہمی شرکت سے حکومت چلانے کی کوئی پیش کش کی تھی۔ جو لوگ ایسے دعوے کرتے ہیں انہیں اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ بھٹو صاحب جنرل ضیا کو ان کے عہدے سے علیحدہ کرنے والے تھے۔ جب یہ طے تھا کہ عدلیہ نے انتخابات کرانا ہیں اور فوج نے ان کے انعقاد کی نگرانی کرنا ہے تو کسی کو اس کے عہدے سے ہٹانے کی کیا ضرورت رہتی ہے؟ صورت حال یہ تھی کہ معاہدہ تو طے تھا، چند رسمی باتیں اور طریق کار طے ہونا تھا۔ یہ تمام معاملات نپٹ جانے کے باعث ہی بھٹو صاحب نے بعض اسلامی ممالک کے دورے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ان ممالک کا شکریہ ادا کیا جائے جنہوں نے بحران کے وقت پاکستان کا ساتھ دیا۔ یہ دورہ تین چار دن میں مکمل کرنے کا خیال تھا مگر اس میں پورا ایک ہفتہ صرف ہو گیا۔ اس کی وجہ سے بھی وقت ضائع ہوا اور الجھنیں پیدا ہوئیں۔

۱۲ جولائی کو پی این اے کی طرف سے جو دس نکات موصول ہوئے تھے ان پر وفاقی کابینہ نے ۱۳ جولائی کو اپنے اجلاس میں غور کیا تھا۔ اس اجلاس میں جنرل ضیاء الحق، کور کمانڈر جنرل چشتی اور جنرل عبداللہ ملک بھی شامل ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب نے ان جرنیلوں کو بتایا کہ کل تو پی این اے والے اتفاق رائے کر گئے تھے مگر آج انہوں نے نئے نکات بھیج دیئے ہیں۔ اسی رات بھٹو صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ اگر وہ دس نئے نکات لا سکتے ہیں تو ہم بھی نئے نکات لائیں گے۔ یہ ایک بچکانہ ضد تھی، پی این اے کے دس نئے نکات میں کوئی قابل ذکر یا اہم بات نہیں تھی صرف چند معمولی باتوں کی وضاحتیں وہ چاہتے تھے۔ پھر ۱۴ جولائی کو کابینہ کا ایک اور اجلاس ہوا۔ اُن دنوں ریٹائرڈ ائر مارشل اصغر خان نے سمجھوتہ کے خلاف موقف اختیار کر رکھا تھا اور وہ یہ دھمکی بھی دے رہے تھے کہ وہ کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہونے دیں گے۔ یہی ریٹائرڈ ائر مارشل تھے جنہوں نے جرنیلوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر بھی اکسایا تھا اور یہ کہا تھا کہ حکومت کا ہر حکم ماننا ان

کے لیے ضروری نہیں۔ بہرحال ان حالات میں معاملات چل رہے تھے۔ ۴ جولائی کی شام کو ہم پرائم منسٹر ہاؤس کے لان میں بیٹھے تھے۔ ممتاز بھٹو اور غلام مصطفےٰ جتوئی بھی موجود تھے، بھٹو صاحب نے ہم سب کو بتایا کہ کل ان کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کر دیتے ہیں۔ اس کی خبر دینے کے لیے اخبار نویسوں کو رات کے گیارہ بجے بلایا گیا۔ بارہ بجے تک پریس کانفرنس جاری رہی۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے مجھے ہدایت کی کہ میں اتحاد کی مذاکراتی ٹیم سے رابطہ کر کے انہیں بھی اس فیصلہ سے مطلع کر دوں لیکن میں جب اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو ایک بجکر پچاس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ صبح سویرے انہیں مطلع کر دوں گا لیکن وہ صبح بہت دور چلی گئی۔ میں لباس بدل کر اپنے سٹڈی روم میں بیٹھا تھا کہ فوجی مجھے گرفتار کرنے آ گئے حالانکہ ہم یہی سمجھتے رہے کہ اب فوج کے آنے کا کوئی خدشہ نہیں، معاہدہ طے ہے اور اگلے روز اس پر صرف دستخط ہونا باقی ہیں۔ نگران کونسل بھی بن رہی تھی۔ کسی تنازعہ کو طے کرنے کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کا بھی فیصلہ ہو گیا تھا اور سپریم کورٹ نے ۲۴ گھنٹوں میں فیصلہ دینا تھا غرضیکہ تمام معاملات طے شدہ تھے اس لئے کسی خدشے یا خطرے کا تصور بھی نہیں تھا۔

یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی قیادت اس خطرے کا ادراک نہ کر سکی۔ وہ بھٹو صاحب کو بچانے میں بھی ناکام رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ پارٹی خود انتشار کا شکار تھی اس کے اپنے بہت سے تضادات تھے۔ باہمی اختلافات موجود تھے اور ان کے باعث پارٹی کمزور ہو رہی تھی اس لئے اگر بھٹو صاحب کو بچانے کی کوئی جدوجہد ہوتی بھی تو وہ زیادہ دور تک اور زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی تھی۔

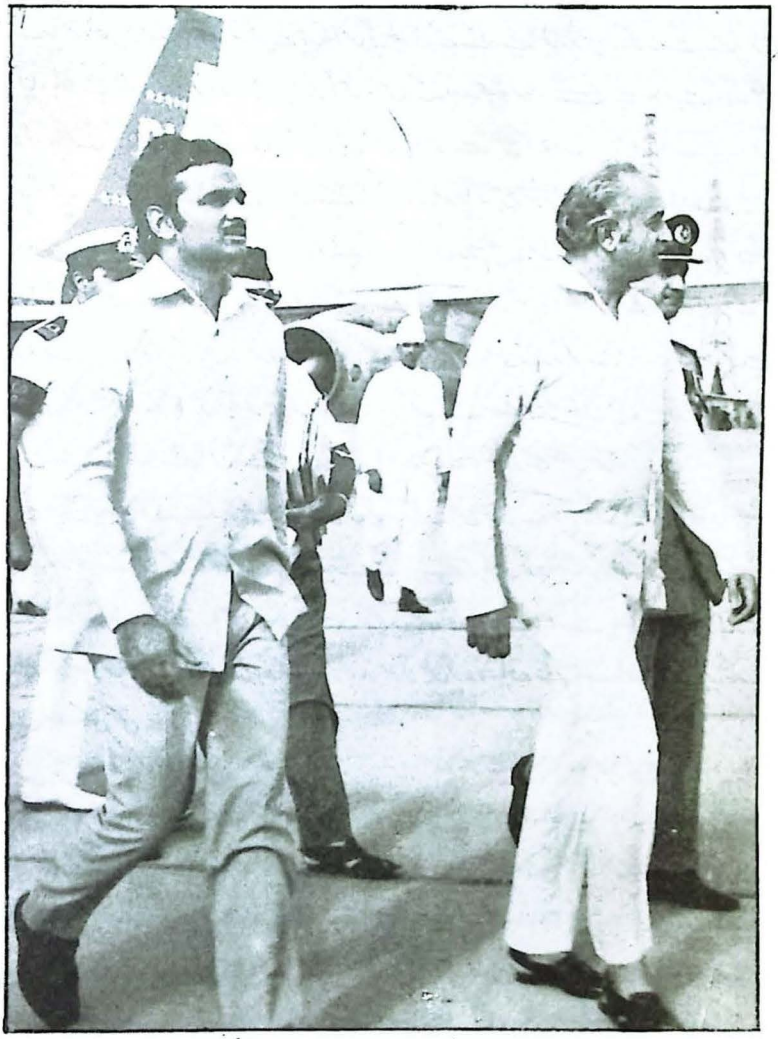

غلام مصطفےٰ کھر اور ذوالفقار علی بھٹو

دسواں باب

سازش کا انکشاف اور سازش کے تین فریق

غیر ملکی ہاتھ ملوث ہونے کی دستاویز،
غلام اسحاق کی تحویل میں چلی گئی

خانہ جنگی خارج از بحث ہے، خانہ جنگی
اور چیز ہوتی ہے۔

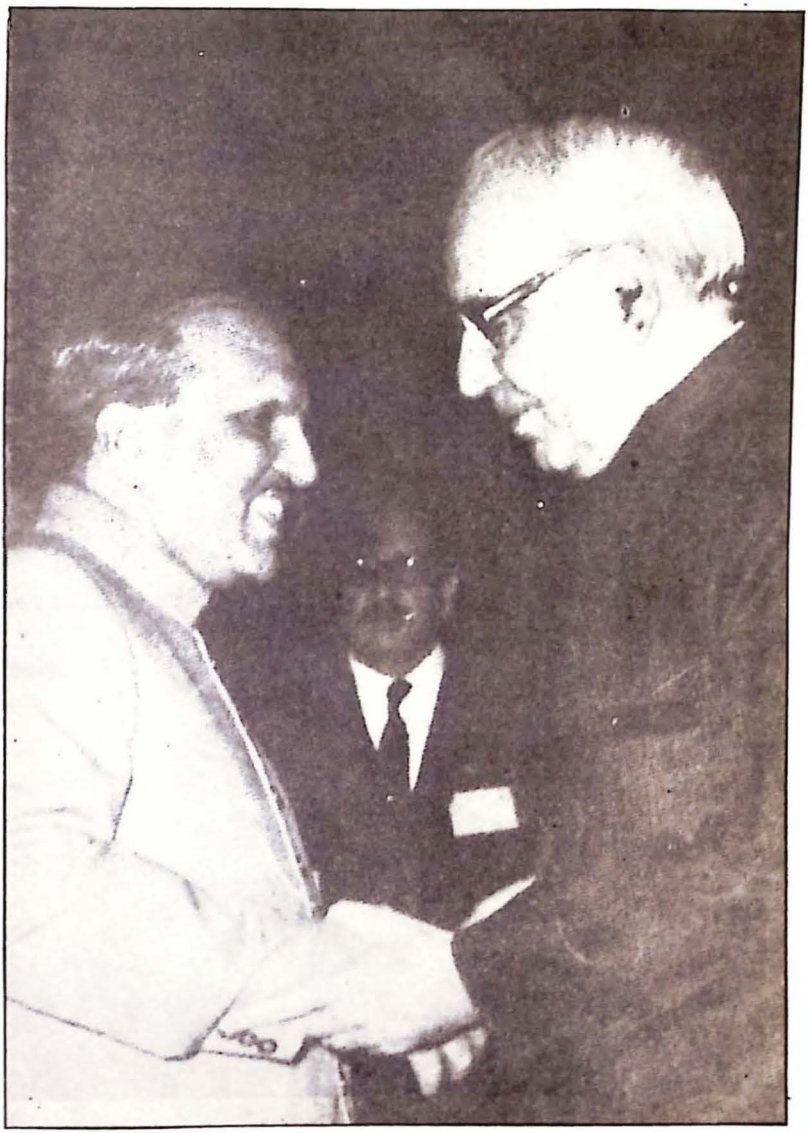

صدرِ پاکستان غلام اسحٰق خان، جنرل ضیاء الحق کا استقبال کر رہے ہیں

اس وقت تیسری دنیا کے اتحاد و ترقی کے لئے سب سے بڑا خطرہ فوجی انقلابات ہیں۔ سامراجیت کا دور ختم ہو چکا ہے صرف چند خطے ہیں جہاں سامراجیت کو ابھی دفن کیا جانا ہے۔ ان مقامات پر بھی اسے دفنانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔

تیسری دنیا کے لئے سب سے پہلا مسئلہ آمریت سے اپنی حفاظت کرنا ہے اور اس کا بہترین طریقہ فوجی انقلابات کو روکنا ہے۔ بیرونی سامراج کا سب سے بڑا رابطہ اندرونی آمریت کے ساتھ ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر ملکی آمریت، فوجی انقلابات کی مدد کے بغیر، ہماری سرزمینوں پر پھل پھول نہیں سکتی۔ فوجی انقلابات، قومی اتحاد کے بدترین دشمن ہوتے ہیں۔ یہ "تختے الٹ کارروائیاں" قوم کو تقسیم کرتیں اور اسے بنیاد سے محروم کر دیتی ہیں اگر اس دعویٰ پر کسی کو کوئی شک ہو تو پاکستان کے واقعات سے اس پر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ انہی کے باعث پاکستان دو ٹکڑے ہوا۔

تیسری دنیا کے عوام نے اگر غیر ملکی غلبہ یا آمریت کی مزاحمت کرنا ہے تو انہیں سب سے پہلے اندرونی دشمن سے خود کو محفوظ رکھنا ہوگا۔ فوجی انقلابات وہ "پل" ہیں جن پر چل کر غیر ملکی آمریت ہماری سرزمینوں میں آتی ہے۔ غیر ملکی عناصر کی طرف سے قومی اتحاد کی حمایت، کسی "محبت" کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ غیر ملکی عناصر اور قومی اتحاد کے درمیان ایک مفاہمت ہو چکی تھی۔ معاہدہ یا سازشں یہ تھی کہ ایجی ٹیشن کے ذریعہ سے بھٹو حکومت

کا تختہ اُلٹنے میں اس (اتحاد) کی مالی اور سیاسی مدد کی جائے۔ پہلے مرحلہ میں فوج اقتدار پر قبضہ کرے اس مقصد کے لئے فضا ہموار کی جائے اور رکاوٹیں دُور کی جائیں۔ یہ تمام شرائط فروری ۱۹۷۷ء میں انتخابات سے پہلے ہی طے کر لی گئی تھیں۔ امریکہ نے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا مسئلہ حل ہونے تک پاکستان کی امداد روکنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس پر احتجاج نہ تو غیر متوقع تھے اور نہ ہی یہ کوئی نئی بات تھی بلکہ یہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کا ایک لازمی حصہ تھے۔ پی این اے نے اس "سودا" میں اپنا حصہ پورا کرنا تھا۔ اس ضمن میں ڈپلومیٹک طرز کے بیانات اور کٹھ پتلی اخبارات کے نعرہ دار اداریے، عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے محض ایک سٹنٹ تھے۔ پی این اے کا خیال ہے کہ اس نے ایک بار عوام کو بے وقوف بنایا ہے اور وہ ایک بار پھر سے بھی عوام کو بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ اس چیلنج کے جواب میں عوام کو متحرک کرنے کے لئے مضبوط اقدامات کی ضرورت ہے۔ جو لوگ بھی لالچ اور حرص کی بنیاد پر کام کرتے ہیں وہ بالآخر پاکستان کے عوام کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اگر پی این اے کو قومی مفاد اور پاکستان کے عوام کی بہبود سے کوئی دلچسپی ہوتی تو وہ انتخابات کے دوران ۱۵ کروڑ روپے کی غیر ملکی رقم وصول نہ کرتا۔ اس کے بعد مزید ۵ کروڑ روپے بھٹو حکومت کے خلاف ہنگامہ آرائی کے لئے وصول کئے گئے۔ اس طرح پاکستان کے اہم ترین مفادات کا سودا چکا دیا گیا۔

دوسرے فریق نے معاہدہ کی شرائط میں اپنا حصہ پورا کر دیا۔ اس کے بعد جو چیخ و پکار شروع ہوئی وہ محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے "ہدایات" کے عین مطابق تھی۔ حکومت میں پی این اے کی شمولیت کیلئے مذاکرات محض ایک ڈھونگ یا نمائش تھے۔ پانچ نکات کے مطالبہ کا شور بھی 'پی این اے کی آزادی ظاہر کرنے کے لئے سجایا گیا۔

اس قسم کی سازشوں کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا اور نہ لیا جا سکتا ہے۔ ایسے کام میں دائیں ہاتھ کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ بایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے۔

مکمل منصوبہ ایک محفوظ ترین راز ہے۔ اس سازش میں پی این اے کی صرف ایک پارٹی اور اس پارٹی کے صرف ایک سیاستدان کو مکمل اعتماد میں لیا گیا صرف اسے ہر بات بتائی گئی۔ خاکساروں کو اس منصوبہ کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی گئی انہیں صرف نظامِ مصطفےٰ کے نعرہ پر آلۂ کار بنایا گیا۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی پر بھی اصل منصوبے کا انکشاف نہیں ہوا۔ رابطے اور پیغام رسانی کا ایک واحد چینل جماعت اسلامی تھی اور میاں طفیل محمد اس کا ذریعہ تھے۔ دوسروں کو اس سازش کی صرف جزئیات کا علم تھا اور تھوڑی بہت سطحی سی معلومات حاصل تھیں چنانچہ یہ منصوبہ ایک فرد سے دوسرے فرد تک اور ایک پارٹی سے دوسری پارٹی تک مختلف رنگوں میں تعبیر ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ اشتعال پیدا کرنے والے میاں طفیل محمد نے بعد میں امریکہ پر بڑی شدت سے تنقید شروع کر دی۔ یہ سب کچھ سادہ لوح عوام کو دھوکا میں ڈالنے کے لئے ہوا۔ حالانکہ عوام اس امر کو نہیں سمجھے کہ پولنگ کے دن پی این اے نے بڑے شہروں مثلاً کراچی، حیدرآباد اور ملتان میں تشدد کے زبردست مظاہرے کئے۔ پولنگ سٹیشنوں پر حملے کئے اور انہیں آگ لگائی۔

پی این اے کے رہنماؤں کی طرف سے انتخابی نتائج کا اعلان ہونے سے پہلے ہی حکومت سنبھال لینے کی دھمکیاں آج بھی بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں گونجتی ہیں ۔ 'ٹولہ' پی این اے کی صفائی پیش کرنے پر مجبور ہے اور پی این اے اس ٹولہ کی صفائی پر مجبور ۔!

فوجی حکومت کے وائٹ پیپر کا دعویٰ ہے کہ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کا سیلاب آنے کا الزام کوئی بنیاد نہیں رکھتا نہ ہی ایجی ٹیشن میں کسی قسم کے غیر ملکی ہاتھ ثابت کرنے کی کوئی شہادت ملی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وائٹ پیپر کی سرکاری لانڈری پی این اے کو اتنا صاف ستھرا کرنے کے لئے کیوں فکرمند تھی ؟ بھٹو نے جرنیلوں پر تو غیر ملکی سرمایہ وصول کرنے کا الزام نہیں لگایا تھا، پی این اے پر لگایا تھا لیکن حکومت پی این اے کی صفائی پر اُتر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ خود اپنی صفائی کر رہی تھی۔ پی این اے کی معصومیت ثابت کرنے کی کوشش دراصل اپنی معصومیت کا ثبوت مہیا کرنا تھی۔ 'ٹولے' کی صفائی اسی وقت ہوتی ہے جب پی این اے کی صفائی ہو جائے۔ اسی لئے "غیر ملکی سرمایہ کی وصولی کا الزام" بے بنیاد نظر آیا اور ایجی ٹیشن میں "کسی غیر ملکی ہاتھ" کی شہادت نہ مل سکی۔

اگست ۱۹۷۷ء میں جب بھٹو راولپنڈی آئے تو انہوں نے وزیر خارجہ عزیز احمد سے دفتر خارجہ کی تیار کردہ پچاس صفحات کی اس دستاویز کی ایک کاپی طلب کی جس میں "غیر ملکی ہاتھ" ملوث ہونے کے بارے میں "باب اور سطر" تک کا حوالہ تھا۔ عزیز احمد نے بھٹو سے کہا کہ ان کے پاس جو واحد کاپی تھی وہ انہوں نے سیکرٹری جنرل ان چیف مسٹر غلام اسحٰق کو دے دی ہے۔ اب فوجی حکومت کا وائٹ پیپر کہتا ہے کہ کوئی شہادت دستیاب نہیں حالانکہ بعض ٹھوس واقعات اور دوسرا مواد مثلاً "آپریشن" اور "پیپر جام" اس کے سامنے ہیں لیکن وہ انہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔

غیر ملکی نگرانی کے ایک آپریشن کے تحت "پیپر جام" کا تجربہ فوج نے مارشل لاء ۱۹۵۸ء میں کیا تھا۔ یہ فوج کا انتہائی اہم راز تھا۔ اس کی تربیت چراٹ میں دی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ "پیپر جام" کے ذریعے کسی حکومت کو غیر متحرک کیا جا سکے ۔ جب کراچی میں "پیپر جام" ہوا تو چیف آف آرمی سٹاف اُس وقت سٹپٹا گئے جب بھٹو نے ان سے کہا،

"میں فوج کے اس پرانے منصوبہ سے آگاہ ہوں جس کا نام "پہیہ جام" تھا۔ اس وقت اس لفظ کے استعمال نے ایک ناخوشگوار مشابہت پیدا کر دی ہے"۔

چیف آف آرمی سٹاف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد یہ ضرور کہا کہ بعض ریٹائرڈ فوجی افسر پی این اے میں موجود ہیں۔ جس طرح پی این اے کے تمام سیاستدانوں کو اس منصوبہ کی اندرونی کہانی نہیں سنائی گئی تھی اسی طرح تمام جرنیلوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ اقتدار سنبھالنے کے پہلے سال ہر قسم کی شہادتوں کو ضائع کرنے کا کام مکمل کیا گیا۔

غیر ملکی سرمایہ صرف ایک سیاستدان کے ذریعہ سے بھیجا گیا تھا اور وہ جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد ہیں انہوں نے کس طرح وہ بھاری رقوم تقسیم کیں؟ کن لوگوں میں تقسیم کیں؟ یہ وہ اور پی این اے میں ان کے ساتھی ہی بہتر جانتے ہیں۔ البتہ ۲۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو مجھ کو مری میں یہ اطلاع ملی کہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۷ء کو اسلام آباد میں دستاویزات کے ایک بڑے ڈھیر کو آگ لگائی گئی اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس سال آتش زدگی کی ایسی کئی دوسری وارداتیں ہوئیں اور تمام شہادتیں ختم کر دی گئیں۔ ٹولے کو اطمینان ہو گیا کہ تمام دستاویزات تو ضائع کر دی گئی ہیں، خصوصاً باب اور سطر کی وہ باتیں جن سے میاں طفیل محمد کی اس سازش میں شرکت کا انکشاف ہوتا ہے۔

بعد میں جو کچھ ہوا وہ محض اداکاری تھا۔ سب کچھ تو ایک منظم سازش کے تحت ہو چکا تھا۔ ایک فریق نے رقم رکھی اور مال تقسیم کیا۔ اس فریق نے دوسرے فریق کو اپنے وعدے پورے کرنے کے لئے ایک سال کی مدت دی، اس دوران شہادتیں ضائع کر دی گئیں، پھر دوسرے فریق نے اپنا پاؤں کھینچنا شروع کر دیا، عذر ہائے لنگ گھڑے اور وقت میں توسیع کی اپیلیں کیں۔

تند و تیز بیانات سے کسی ملک کی خود مختاری کے مفادات پورے نہیں ہو جاتے اس کے لئے قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی غیر نمائندہ ٹولہ اس نوع کی قربانیاں نہیں دے سکتا جبکہ عوام صرف قربانیاں دینے والے رہنماؤں کے پیچھے چلتے اور ان پر اعتماد کرتے ہیں۔

صدیوں سے دباؤ کا مقابلہ جوابی دباؤ کی ڈپلومیسی سے کیا جا رہا ہے لیکن یہ غیر نمائندہ حکومت جوابی دباؤ پیدا نہیں کر سکتی۔ عوام کے جوابی دباؤ کے بغیر یہ جنگ ایک ہاری ہوئی لڑائی ہے۔ جنرل ضیاء اور پی این اے کے رہنماؤں نے مشترکہ طور پر یہ خیال کر رکھا تھا کہ امریکی امداد کی بندش سے خود کفالت کا اظہار ہو گا اور یہ بات جیسیں بدلنے کے کام آئے گی ۔ یہ عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش تھی۔ مسئلہ اقتصادی امداد کی بندش کا نہیں تھا بلکہ ری پراسیسنگ پلانٹ کا تھا۔ اس پلانٹ کے حاصل نہ ہونے یا تبدیل شدہ شکل میں حاصل ہونے سے پاکستان کے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ چیف آف سٹاف نے عوام سے اپنے وعدوں کا

ایک پورا سلسلہ توڑا۔ اِن حالات میں کسی غیر ملکی طاقت سے ایک وعدہ بھی بڑی آسانی سے توڑنا ممکن تھا۔ اپنے لئے نہیں بلکہ ملک کے لئے ۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم نے ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل نہ کرنے کیلئے کوئی وعدہ نہیں کیا اور ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے ۔ دباؤ ڈالنے یا اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ سینٹو کو چھوڑ دیا جاتا۔

مغرب کی نماز سے پہلے یا بعد جنرل صاحب کو ٹیلی ویژن پر جا کر غیر ملکی دباؤ کے بارے میں قوم کو اعتماد میں لینا چاہیئے تھا اور سینٹو سے نکلنے کا اعلان کر دینا چاہیئے تھا۔ یہ غیر ملکی دباؤ کے مقابلے کیلئے پہلا قدم ہوتا۔

موجودہ پالیسی کے نتیجہ میں پاکستان خطرناک نتائج کی طرف بڑھے گا۔ ہمیں بھیک کا کاسہ اُٹھا کر ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک جانا پڑے گا ۔ غیر ملکی سربراہ کے پاس جا کر گڑگڑانا ہوگا اور وہ کہے گا:

"آپ نے پچھلے سال بھی وعدہ کیا تھا پھر آپ نے 'پانٹ' چھوڑ دیا"

"پانٹ ۔ ؟ پانٹ کیا ؟"

"اوہ ۔ میرا مطلب ہے پلانٹ ری پراسیسنگ پلانٹ، جو آپ نے نہیں لگایا"

بھٹو یہ لڑائی لڑ رہا تھا اور پلانٹ سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ مگر اس کے بعد۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

یہ کھیل تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب پی این اے نے اس کی روح کو بیچ ڈالا تھا جہاں کسی بیرونی طاقت پر الزام لگانے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اگر خود اپنے اندر غدار نہ ہوتے تو معاملہ کہیں آگے نکل گیا ہوتا۔

اس ضمن میں بھٹو کا دعویٰ تھا:

"میں کسی غیر ملکی طاقت پر الزام نہیں لگاتا کیونکہ ملک کے مفاد پرست عناصر نے مجھے پاکستان کا وقار بلند رکھنے کی سزا دی، میں عوام کی ہمدردی اور حمایت کا ممنون ہوں اور ان عالمی سربراہوں کا جنہوں نے میرے لئے ہمدردی کا اظہار کیا"

پی این اے نے دانستہ جارحانہ رویہ اختیار کیا تاکہ فوجی انقلاب کو دعوت دی جائے۔ انہوں نے "پہیہ جام" اور طویل مارچوں کا سلسلہ شروع کیا۔ پی این اے کے رہنماؤں نے مسلح افواج سے اپیل کی کہ وہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیں۔ پی این اے نے بڑی تعداد میں اسلحہ خریدا اور جہاد کرنے کے لئے مکانوں کی چھتوں سے اذانیں دینا شروع کر دیں۔ انہوں نے ہر قسم کے وار کئے، تصفیہ کے لئے تمام فارمولے مسترد کئے۔ حد یہ کہ وہ اپنے ہی متفقہ فارمولے سے منحرف ہو گئے۔ بھٹو حکومت پر خانہ جنگی منظم کرنے کا الزام آتا ہے، یہ الزام لگانے والے حضرات خانہ جنگی کے معانی و مفہوم سے یکسر بے خبر ہیں۔ کسی خانہ جنگی کے اپنے تاریخی عناصر ہوتے

ہیں، کوئی فوج کسی خانہ جنگی کو نہیں روک سکتی کیونکہ خانہ جنگی تو ہوتی ہی فوج کے دھڑوں میں بٹ جانے سے ہے اور اس طرح فوج خود متحارب و متصادم گروہوں میں سے کسی کے ساتھ ہوتی ہے جیسا کہ لبنان کی تازہ ترین صورتحال میں دیکھا جا سکتا ہے۔

خانہ جنگی میں عوامی شعور ایک خاص سطح پر پہنچا ہوتا ہے۔ مسلح افواج دو یا اس سے زائد کیمپوں (جیسا کہ لبنان میں ہے) میں تقسیم ہوتی ہیں۔ ایک کیمپ استحصال کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے اور دوسرا مظلوموں کے ساتھ ۔ ایسے حالات میں خانہ جنگی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ خانہ جنگی اُن حالات میں نہیں ہوتی جب صرف ایک ٹولہ مفاد پرست عناصر کی حفاظت کے لئے پوری فوج کو استعمال کر رہا ہو۔

جب خانہ جنگی کا ماحول تیار ہوتا ہے تو کوئی فوجی آمریت اسے وقوع پذیر ہونے سے روک نہیں سکتی یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ اگر چیف آف آرمی سٹاف قدم نہ اٹھاتے تو خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔

جنرل چشتی کے بقول اقتدار پر ۲ر جولائی کو ہی قبضہ کر لیا جانا تھا۔ بھٹو کے غیر ملکی دورہ پر جانے کے باعث جرنیلوں کو بڑی آسانی سے اپنے منصوبے مکمل کرنے کا موقع مل گیا تھا تاہم بعض وجوہ سے ۲ر جولائی اور پھر ۴ر جولائی کو کوئی قدم نہ اٹھایا جا سکا۔ البتہ ۴ر جولائی کو رات گئے آخری وار کر دیا گیا۔

لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی کا دعویٰ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کو مروانے کی تمام تر ذمہ داری بھٹو کابینہ کے ایک وزیر مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ پر عائد ہوتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ جب ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد کی تحریک زوروں پر تھی تو مئی یا جون میں بھٹو نے اپنی کابینہ کے وزراء فوج کے سربراہوں اور کور کمانڈروں کا ایک مشترکہ اجلاس طلب کیا تھا جس میں بحث و تمحیص کے بعد بھٹو نے دوبارہ الیکشن کرانے پر آمادگی کا اظہار کیا تو عبدالحفیظ پیرزادہ نے بڑے اشتعال انگیز لہجہ میں اس تجویز کی مزاحمت کی جس کے باعث یہ تجویز ختم ہو گئی اور اس کے باعث بالآخر بھٹو کو تختہ دار اور پیپلز پارٹی کو شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا۔

جنرل چشتی نے بتایا کہ اس اجلاس میں دوسرے لوگوں کے علاوہ جنرل ٹکا خان، حامد رضا گیلانی اور حنیف خان موجود تھے۔

گیارھواں باب

بھٹو کو سازش سے خبردار کر دیا گیا تھا

"آپ اپنی زندگی اور خاندان کو خطرہ میں کیوں ڈال رہے ہیں؟"

بھٹو سے رفیع رضا کا سوال

"میں ان عوام کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں جو خوشی کا مطلب بھی نہیں جانتے۔" بھٹو کا جواب

"پراسیسنگ پلانٹ، ری ایکٹر اور پاور پلانٹ میں فرق ہوتا ہے۔

مسٹر رفیع رضا

سیاسی عمل کو تو بھٹو تاڑ گیا تھا۔ قومی اتحاد کو تشکیل پاتے ہی اس نے محسوس کر لیا تھا لیکن — جس امر کو بھٹو نہ دیکھ سکا اور جس نے اسے بعد میں حیرت زدہ کیا وہ ایسی قوتیں تھیں جو حزب مخالف کی پشت پر کھڑی تھیں ان قوتوں نے وسطِ دسمبر ۱۹۷۶ء سے جمع ہونا شروع کر دیا تھا بلکہ زیادہ صحیح طور پر اس وقت سے جب ہنری کسنجر کو اگست ۷۶ء میں بھٹو نے مایوس کیا اور کسنجر نے دھمکی دی:

"مسٹر پرائم منسٹر۔ آپ کا حشر کر دیا جائے گا۔"

جنوری ۱۹۷۷ء کے اوائل میں بھٹو کو خفیہ ہاتھوں کے بارے میں رپورٹیں ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ اسی ماہ رفیع رضا نے ساڑھے چار گھنٹے تک بھٹو سے طویل بات چیت کی اور بتایا کہ "پاکستان قومی اتحاد وجود میں آ رہا ہے" انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس قومی اتحاد کا صدر کون ہوگا اور دوسرے عہدیدار کون ہوں گے۔ انہوں نے اتحاد کی حکمت عمل اور مقصد سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا کہ صرف تین متبادل راستے ہیں۔

ا۔ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کو بھول جائیے۔ اس منصوبہ کے خاتمہ سے حزب مخالف کا اتحاد وجود میں نہیں آئے گا کیونکہ یہ اتحاد صرف اس لئے کرایا جا رہا ہے کہ اس منصوبہ کو ختم کرایا جا سکے۔

ب۔ انتخابات ملتوی کر دیں یا

ج۔ خطرناک نتائج کا سامنا کریں۔ (مسٹر پرائم منسٹر.....)

رفیع رضا نے زور دے کر کہا کہ انہیں یہ اطلاعات جن "ذرائع" سے ملی ہیں ان کا انکشاف کرنے پر انہیں

مجبور نہ کیا جائے۔ تاہم جو کچھ وقوع پذیر ہونے والا ہے اُس سے پوری طرح آگاہ ہو کر وہ بات کر رہے ہیں۔

بھٹو نے دریافت کیا:

"اِن حالات میں آپ کی پہلی ترجیح کیا ہے؟"

اس پر رفیع رضا نے مشورہ دیا:

"ری پراسیسنگ پلانٹ کو بھول جائیے"

اس کے ساتھ ہی رفیع رضا نے بھٹو کو مطلع کیا کہ حزب مخالف، انتخابات کے دوران اس پلانٹ کو ہرگز اپنا ایشو نہیں بنائے گی کیونکہ اس کا اتحاد تو وجود میں ہی اس لئے آرہا ہے کہ اس منصوبہ کو ختم کرایا جائے صرف کبھی کبھار، لوگوں کو دکھانے کے لئے وہ پلانٹ کا ذکر کیا کریں گے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مخالفوں کو علم ہے کہ عوام ایٹمی پاور پلانٹ، ایٹمی ری ایکٹر اور ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے درمیان فرق کو نہیں جانتے۔

رفیع رضا نے بھٹو کو خبردار کیا کہ اس وقت بھٹو کے اردگرد پائے جانے والے لوگ جو جذباتی شور و غل کر رہے ہیں اور بھٹو کو ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹنے کے مشورے دے رہے ہیں، وہ اس وقت کہیں نظر نہیں آئیں گے جب پردہ گر جائے گا۔

رات کے کھانے پر بھی رفیع رضا کی بات چیت جاری رہی۔ بعد ازاں بھٹو نے اس "قیمتی خفیہ اطلاع اور اس پر رفیع رضا کے "ہمدردانہ مشورہ" کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ تاہم یہ واضح کر دیا کہ

ا۔ الیکشن اب ملتوی نہیں کئے جائیں گے کیونکہ خاصی تاخیر ہو چکی ہے۔

ب۔ یہ بات ری پراسیسنگ پلانٹ پر لاگو ہوتی ہے، اسے اب ترک نہیں کیا جا سکتا۔

بھٹو نے مزید کہا کہ اگر ہم انتخابات ہار گئے تو حزب مخالف خود اس ری پراسیسنگ پلانٹ کے معاہدہ کو ختم کر سکتی یا بدل سکتی ہے لیکن بھٹو حکومت یہ کام نہیں کرے گی۔

رفیع رضا نے جواب دیا

"بلاشبہ منصفانہ انتخابات میں ہم جیت جائیں گے لیکن انتہائی مشتبہ امر یہ ہے کہ ہمیں اس فتح کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے دیا جائے"

رفیع رضا اس سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے کہ اگر الیکشن بھٹو جیت جائے تو پھر کیا ڈر رہ جاتا ہے۔ شاید وہ کھلے الفاظ میں اس سہ فریقی معاہدہ (امریکہ، جرنیل، قومی اتحاد) کا حوالہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے چھیڑنے کے انداز میں بھٹو نے کہا:

"چلو ٹھیک ہے ہم انتخابات ہار جائیں گے یا ہمیں فتح کے ثمرات سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا جائیگا تو؟"

اپنے موٹے شیشے کے چشموں سے بھٹو کو دیکھتے ہوئے، اپنے بالوں کو سیدھا کرنے کے لئے ہاتھ کو کنگھی کے طور پر استعمال کرتے ہوئے رفیع رضا نے ڈرے سہمے لہجہ میں بھٹو سے کہا:

"لیکن سر۔ میں جو چیز آپ کو بتانے کی کوشش کر رہا ہوں وہ الیکشن سے اقتدار سے بڑی چیز ہے جو آپ داؤ پر لگا رہے ہیں۔"

"میں تمہارے نکتہ کو سمجھ گیا ہوں۔" بھٹو نے تیزی سے کہا۔ "اور میرا جواب وہی ہے کہ میں پلانٹ نہیں چھوڑوں گا۔"

بات ختم ہو گئی لیکن جانے سے پہلے رفیع رضا نے بھٹو سے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہی تو بھٹو نے کہا:

"ضرور پوچھیں۔!"

تب رفیع رضا نے کہا:

"آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ آپ اپنے ساتھ اور اپنے خاندان کے ساتھ ایسے خوفناک امکانات پیدا کرنے پر مجبور تو ہیں نہیں۔"

بھٹو نے جواب دیا:

"میں یہ سب کچھ اپنے لئے نہیں یا اپنے خاندان کے لئے نہیں، ایک خوشحال معاشرہ کے لئے کر رہا ہوں۔ میں اپنے ملک کو مضبوط اور ماڈرن بنانا چاہتا ہوں۔ میں ان عوام کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ 'خوشی' کے لفظ کا مطلب کیا ہے؟ بے شک انسانیت کے آنسو تو شاید ہمیشہ بہتے رہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ کم آنسو بہیں اور ان میں کم تلخی ہو۔"

رفیع رضا کے جانے کے بعد بھٹو کے معالج ڈاکٹر نصیر شیخ انہیں دیکھنے آئے۔ ڈاکٹر نے بھٹو کو بتایا کہ اے ڈی سی کے کمرہ میں رفیع رضا انہیں ملے وہ انتہائی پریشان اور متفکر نظر آتے تھے۔ واقعتاً ڈاکٹر نصیر شیخ تجربہ کار اور مشاہدہ رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے مزید کہا۔

"رفیع رضا کا رنگ اُڑا ہوا ہے، ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے یا وہ خود بھوت بن گئے ہیں۔"

بھٹو خاموش رہے تو ڈاکٹر نے دریافت کیا:

"آپ نے انہیں جھاڑا تو نہیں؟ کوئی ڈانٹ تو نہیں پلائی؟"

"نہیں — میں نے انہیں کچھ نہیں کہا" بھٹو نے جواب دیا — "وہ تو مجھے ڈانٹ پلا کر گئے ہیں"

ڈاکٹر ہنسا جیسے کوئی اچھا لطیفہ ہوا ہو، تب بھٹو نے کہا:

"دراصل جس موضوع پر ہم بات کر رہے تھے وہ بہت دہشت ناک تھا"

چنانچہ قومی اتحاد کی تشکیل بھٹو کے لئے کسی تعجب کا باعث نہیں بنی۔ رفیع رضا نے اس کا خاکہ پہلے ہی بیان کر دیا تھا اور یہ بھی کہ کس دھماکہ خیز انداز سے اسے پھٹنا تھا۔ اتحاد پہلے بھی ہوئے تھے۔ جگتو فرنٹ، سی سی ایف اور جمہوری مجلس عمل — لیکن وہ سارے اتحاد "دیسی ہنر" کے مظہر تھے مگر پی این اے "ولائتی ہنر" کا نمونہ تھا۔

۲۳ اپریل ۱۹۷۷ء کو بھٹو نے قومی اسمبلی اور سینیٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا "یہ کوئی دیسی سازش نہیں ہے یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے۔ پاکستان کی اسلامی مملکت کے خلاف ایک ہولناک سازش"

یہ بات سو فیصد درست تھی، بعد کے واقعات نے اسے ثابت بھی کر دیا۔ اس لحاظ سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو منتشر اور تباہ کرنے کی ابتدائی ذمہ داری قومی اتحاد اور فوجی ٹولے پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اس ڈرامہ کے ان دونوں اداکاروں نے کھلے عام ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ غیر ملکی حکومتیں تو اپنی پالیسیوں پر عمل پیرا رہیں گی ان سے گلہ فضول ہے۔ لیکن اب جتنی زیادہ "خود کفالت" کی باتیں ہوتی ہیں اتنی ہی "کفالت اور محتاجی" بڑھتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ صرف ایٹم یا ہائیڈروجن بم بنانے کے لئے ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ یہ توانائی (بجلی، ایندھن، تیل قسم کے وسائل) کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کی مدد سے کارخانے چلتے، ٹیوب ویل حرکت میں آتے اور شہر جگمگ جگمگ کرتے ہیں (لوڈ شیڈنگ ڈراؤنا خواب بن جاتی ہے) پھر یہ کہ ری پراسیسنگ پلانٹ، ری ایکٹر اور پاور پلانٹ بہت مختلف ہوتے ہیں ری پراسیسنگ کا مطلب ہے "از سر نو عمل" — یہ پلانٹ ضائع شدہ یا استعمال شدہ مواد کو دوبارہ عمل میں پھر وہی شکل دے دیتا ہے جو ابتدا میں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ پلانٹ اپنے استعمال میں آنے والی یورانیم کو ضائع نہیں کرتا بلکہ استعمال شدہ مواد کو "ری پراسس" کر کے پھر اسی شکل میں لے آتا ہے۔ یہ خصوصیت ایٹمی پاور پلانٹ یا ایٹمی ری ایکٹر میں نہیں ہوتی اور اسی لئے "ری پراسیسنگ پلانٹ" موجودہ دور کی ایٹمی ٹیکنالوجی کی سب سے ترقی یافتہ شکل ہے۔

وائٹ پیپر میں "پی این اے" کی کسی دھاندلی کا کوئی ذکر نہیں، حد یہ کہ اس میں وہ دستاویز بھی شامل نہیں جس میں "پی این اے" نے مسلح افواج سے کہا کہ وہ بغاوت (انقلاب) برپا کر دیں۔

انتخابات سے بہت پہلے۔

کئی مواقع پر اصغر خاں نے دعویٰ کیا کہ حزب مخالف تو پہلے ہی انتخابات جیت چکی ہے، ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو تو صرف ضابطہ کی کارروائی ہونا ہے۔

پھر انہوں نے یہ بھی پہلے ہی کہہ دیا کہ پی این اے ریڈیو سے کسی اعلان کو قبول نہیں کرے گی جو پی این اے کی فتح کے برعکس ہو۔

پھر یہ کہ ملک کو مفلوج کرنے کے لئے پی این اے نے عام انتخابات سے صرف ایک ہفتہ پہلے عام ہڑتال کے لئے اپیل کی اس سے وسیع پیمانہ پر بدنظمی پھیلی۔ یہی اس ہڑتال کا مقصود تھا ورنہ الیکشن کی تیاری کی بجائے ہڑتال چہ معنی؟ پی این اے کی کھلی غنڈہ گردی اور تشدد، گالیوں اور اشتعال انگیزی کے خلاف الیکشن کمشن کو شکایات بھیجی گئیں، جن کی نقول بھٹو کو بھی روانہ کی گئیں۔ حفیظ پیرزادہ نے الزام لگایا کہ پی این اے نے ایک مکروہ مہم شروع کر رکھی ہے اور الیکشن قوانین کی کھلی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔

پولنگ سٹیشنوں پر حملوں، خواتین ووٹروں کو ہراساں کرنے، پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو بندوقوں سے ہلاک اور زخمی کرنے اور انتخابی دفاتر کو آگ لگانے کی وارداتیں ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات انتخابات سے پہلے ہی قیامت کھڑی کر رہے ہیں ۔۔۔ عجیب بات ہے کہ چیف الیکشن کمشنر کے دونوں بیٹوں آصف سجاد اور وسیم سجاد کی بیویوں نے انتخابی نتائج کے خلاف احتجاجی جلوسوں کی قیادت کی (وسیم سجاد اب چیئرمین سینیٹ ہیں) لیکن فوجی حکومت نے ان وارداتوں کا قطعاً کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یہ اتنا ایک طرفہ تماشا ہے کہ لارڈ نیلسن کی اکلوتی آنکھ کو بھی بند کر دیا جائے لیکن اس کا نوٹس کیسے لیا جاتا کہ یہ سب کچھ تو ایک سوچے سمجھے منصوبے اور معاہدہ کے تحت ہو رہا تھا۔

سازش

بھٹو حکومت کے بعض افراد نے پاکستان کیلئے "نیوز ویک" سے کور سٹوری شائع کرانے کی کوشش کی لیکن عجیب بات ہے کہ پاکستان پر کور سٹوری شائع کرنے کے پختہ وعدہ کے باوجود مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے فوراً بعد نیوز ویک نے آخری لمحہ پر کسی معقول عذر کے بغیر اس سٹوری کی اشاعت کا خیال تبدیل کر دیا مگر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو فوجی انقلاب کے فوراً بعد اسی جریدہ نے جنرل ضیاالحق کو اپنے کور پر شائع کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروری ۱۹۷۷ء میں جو "سہ فریقی معاہدہ" طے پایا تھا اس کے ایک فریق نے "نیوز ویک" کو مارچ ۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کی کور سٹوری شائع کرنے سے روکا جبکہ بعد میں جنرل ضیاالحق کی سٹوری شائع کی گئی۔

وزیراعظم پاکستان مسٹر بھٹو اور امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر (۳۱ اکتوبر ۷۴ء)

بارھواں باب

مثلث کے تین زاویے

"مسٹر پرائم منسٹر ہم آپ کا حشر کر دیں گے"

بھٹو کو یہودی نژاد کسنجر کی دھمکی

ایٹمی پلانٹ کا منصوبہ بھٹو کو تختۂ دار

پر لے گیا

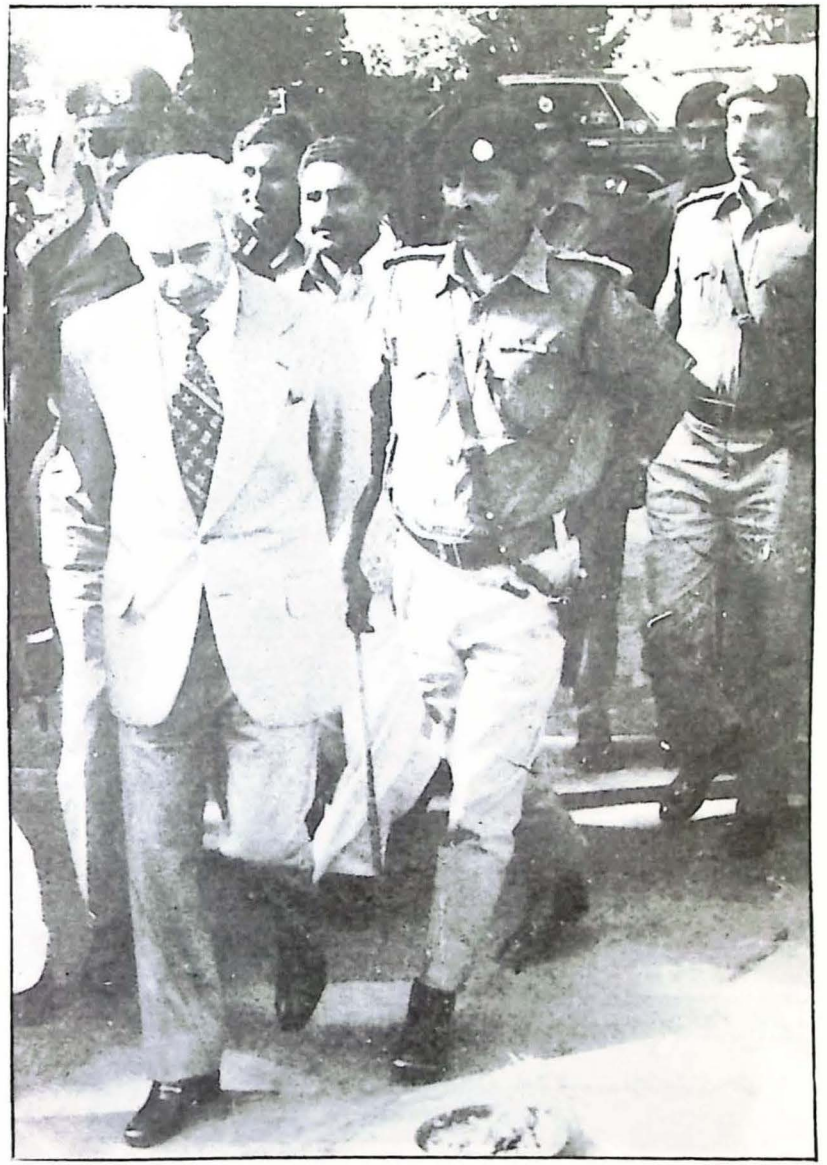

ذوالفقار علی بھٹو پولیس کی حراست میں

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر
اور قومی اتحاد کا گٹھ جوڑ

جنرل ضیاالحق کی فوجی حکومت اور قومی اتحاد میں قریبی روابط اب ایک کھلا راز ہیں جس کا سب سے پہلا ثبوت تو یہی ہے کہ قومی اتحاد جو منصفانہ انتخابات اور جمہوریت کے بلند بانگ دعوے اور نعرے لے کر چلا تھا اور جس کے تحت ایجی ٹیشن میں اس نے بہت سی قیمتی انسانی جانوں کو ضائع کرایا اور کروڑوں روپے کی املاک تباہ کیں، مارشل لاء کے نافذ ہوتے ہی یہ عظیم الشان تحریک جو بڑی جوش و خروش سے پھٹ پڑی تھی، اچانک ایسے ختم ہو گئی جیسے پانی کا بلبلہ۔ یہی نہیں بلکہ جمہوریت کے یہ نام نہاد علمبردار اور منصفانہ انتخابات کے مطالبے کرنے والے جرنیلوں کی قائم کردہ حکومت میں "تھرڈ ریٹ" کے حصہ دار کی حیثیت سے شامل بھی ہوئے۔ بھٹو جیل میں اس شبہ کا اظہار کرتا رہا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاالحق اور قومی اتحاد والے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور آپس میں ملے ہوئے بھی ہیں۔ بھٹو کا یہ بھی کہنا تھا کہ ان متضاد انتہاؤں کا اتحاد اور اشتراک ایک خاص منصوبہ (بلکہ سازش) کے تحت عمل میں آیا تھا اور وہ سازش بھٹو حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے تھی لیکن بالآخر اس کے تحت بھٹو کو بھی پھانسی چڑھا دیا گیا۔

فوجی حکومت، قومی اتحاد کا اس طریق سے یوں تحفظ کرتی رہی گویا دونوں ایک ہی ہیں؛ بھٹو کا دعویٰ

تھا کہ فروری ۱۹۷۷ء سے جنرل ضیاء اور قومی اتحاد ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔ قومی اتحاد کا ایجی ٹیشن بھی ان دونوں کا "مشترکہ معاملہ" تھا۔ فوجی جوان، سول کپڑوں میں مظاہرے کرنے کے لئے بھیجے گئے اور عوام کو مشتعل کیا گیا۔

لاہور میں 'فورتھ کارپس' کے تین بریگیڈیروں نے ایجی ٹیشن کے دوران حکومت کے احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت نے اس کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا چنانچہ احکامات ماننے سے انکار پر بریگیڈیروں کا کورٹ مارشل نہیں کیا گیا۔ انہیں سروس سے بھی برطرف نہیں کیا گیا صرف راولپنڈی تبدیل کر دیا گیا اور اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ وہ اس سیاسی کھیل میں ایسا کردار انجام دے چکے تھے۔ ان سے کہہ دیا گیا کہ اب وہ نظروں سے اوجھل رہیں۔ جنرل اقبال کے استعفیٰ کی کہانی بھی محض ایک فریب تھا۔

خود جنرل ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۷۷ء کی تقریر میں اعتراف کیا کہ بھٹو حکومت کے تحت انہوں نے تین شہروں میں جو مارشل لاء لگایا تھا وہ "لنگڑا لولا" (یعنی ناکارہ، نکما) مارشل لاء تھا۔ اسی لئے قومی اتحاد کا تحفظ دراصل خود اس فوجی حکومت کا تحفظ تھا۔ ان کے درمیان مشترکہ مفاد کیا تھا؟ اور اس مفاد نے "بستر عروسی" کی شکل کیسے اختیار کی؟ اس ضمن میں بھٹو کا دعویٰ ہے کہ جنرل ضیاء الحق ایک طویل عرصہ سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ایک مداح اور پیروکار ہیں وہ اس وقت کے امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کے قریبی رشتہ دار، ایک ہی ارائیں برادری کے افراد اور ضلع جالندھر سے تعلق رکھتے ہیں اپنے نظریہ کے لحاظ سے دونوں ہی رجعت پسند ہیں۔

یہ مشترک امور تو سب کی جانی بوجھی باتیں ہیں لیکن صرف ان امور کی وجہ سے ایک خود غرض انسان کسی دوہری سازش میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے جنرل ضیاء الحق کو اچھا عہدہ مل گیا تھا۔ انہیں غیر معمولی ترقی سے نوازا گیا تھا۔ چھ جرنیلوں کو نظر انداز کر کے ان سب کے جونیئر کو کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تھا۔ چنانچہ حکومت سے شکایت کی کوئی بات کم سے کم ضیاء کے پاس نہیں تھی۔ بھٹو حکومت کے خلاف سرگرم ہونے اور ایک خاص منصوبہ کو بروئے عمل لانے کا سبب زیادہ گہرا تھا۔ صرف میاں طفیل محمد سے رشتہ داری یا مودودی کی مداحی اس کا سبب نہیں تھی اور اس اصل گہرے سبب کی تلاش، ہی وہ مرحلہ ہے جہاں آ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ ان سب متضاد عناصر کو ایک کرنے والا، انہیں ایک ہی کشتی میں سوار کرنے والا ــــ ایک پس پردہ ہاتھ ہے، اسی لئے فوجی حکومت کے وائٹ پیپر پر بڑی شدت سے "غیر ملکی ہاتھ" سے انکار کرتے ہیں اور فوجی حکومت خود قومی اتحاد کی وکالت پر اتر آتی ہے۔

لیکن وہ غیر ملکی ہاتھ کس کا تھا ؟

بھٹو " سفید ہاتھی " کا ذکر کرتا رہا۔ امریکی وزیر خارجہ کے خط کو ہوا میں لہراتا رہا مگر یہودی نژاد دانش ور اور اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ مسٹر ہنری کسنجر کے وہ الفاظ کم لوگوں کو یاد ہے کہ

" مسٹر پرائم منسٹر — ہم تمہارا حشر کر دیں گے "

یہودی کسنجر کو صرف امریکی پالیسی کی وجہ سے ہی پاکستان کے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ سے عناد نہ تھا بلکہ اس کی بڑی وجہ اسرائیل تھا۔ بھٹو بار بار کہہ رہا تھا کہ ہندو تہذیب، یہودی تہذیب، عیسائی تہذیب اور کمیونسٹ تہذیب کے پاس ایٹمی صلاحیت موجود ہے تو اسلامی تہذیب اس سے محروم کیوں رہے — ؟ یہ دلیل جہاں انتہائی جائز اور معقول تھی وہیں اسرائیل کے لئے بڑی خوفناک تشویش کا باعث بھی، کیونکہ وہ ننھا سا جعلی ملک ایک ایٹم بم کی مار کھا کر ہی ڈھیر ہو سکتا ہے اس لئے اسرائیل کو ہمیشہ یہ تشویش رہی ہے کہ کوئی مسلمان ملک ایٹمی صلاحیت کا حامل نہ ہو تاکہ عربوں کو کسی مرحلہ پر ایٹم بم ہاتھ نہ لگے۔ اسی لئے اسرائیل نے عراق کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کیا اور اسی لئے وہ آج بھی کہوٹہ کے ایٹمی مرکز کو برباد کرنے کے لئے تخریب کاری کی راہیں ڈھونڈ رہا ہے۔

بھٹو جیسا زیرک انسان، بڑی سادگی سے " اسلامی تہذیب کی ایٹمی صلاحیت " پر زور دیتا رہا اور یہ بھول گیا کہ اس سے اسرائیل کو کتنی شدید وحشت ہوتی ہے اور کون نہیں جانتا کہ امریکی پالیسیوں پر یہودیوں کی مکمل گرفت ہے۔ چنانچہ امریکہ بھی سختی سے پاکستان کے لئے پلانٹ کا مخالف ہو گیا اور پھر ۱۹۷۶ء میں کسنجر (یہودی نژاد امریکی وزیر خارجہ) بھٹو سے ملنے پاکستان آیا۔ اس ملاقات میں ہنری کسنجر نے تمام ڈپلومیٹک آداب کو بالائے طاق رکھ کر ایک خالص یہودی کے انداز میں بھٹو کو دھمکایا اور وہ مشہور فقرہ کہا :

" مسٹر پرائم منسٹر — ہم تمہارا حشر کر دیں گے "

اس طرح سازش کی اس مثلث کے تین زاویے دریافت ہو جاتے ہیں جو

۱۔ امریکہ (معہ اسرائیل)

۲۔ فوجی حکومت اور

۳۔ قومی اتحاد میں

بھٹو کا دعویٰ تھا کہ اگر چیف آف آرمی سٹاف اس معاملہ میں ملوث نہ ہوتا تو وہ " قومی اتحاد کے غیر ملکی گٹھ جوڑ " میں اتنی جانبداری اختیار نہ کرتا اور اپنی طرف سے، حکومت کی طرف سے قومی اتحاد

کے وکیل صفائی کی پوزیشن اختیار نہ کرتا۔ قومی اتحاد کی یہ صفائی پیش کرتے ہوئے دراصل وہ خود اپنی صفائی پیش کرتا ہے اور قومی اتحاد کی "معصومیت" ثابت کرنے کے لئے اپنی حد سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

انتخابات، لازمی طور پر، قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کا مقابلہ تھے۔ انتخابات میں یہ دونوں ہی فریق تھے۔ الیکشن کمشن صرف ریفری تھا یا غیر جانبدار مبصر۔ ان حالات میں سوال یہ ہے کہ قومی اتحاد کی سرگرمیوں پر تو کہیں بھی کوئی اعتراض نظر نہیں آتا جبکہ بھٹو اور اس کی پارٹی پر تمام الزامات لگائے جاتے ہیں، تو یہ دوسرا فریق فوجی حکومت کو نظر کیوں نہیں آتا۔۔۔؟

قومی اتحاد، انتخابات میں محض تماشائی تو نہیں تھا۔ بھٹو نے جب قومی اسمبل میں پاکستانی روپے کے نرخوں میں اچانک اضافے کا ذکر کیا تھا اور ایک "غیر ملکی طاقت" کی دلچسپی کا حوالہ دیا تھا تو اس کے آخری الفاظ یہ تھے کہ:

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام ممالک سے ہمارے تعلقات شاندار ہیں"

یہ آخری الفاظ محض ڈپلومیسی تھی۔ بھٹو کسی طاقت کا نام لینا نہیں چاہتا تھا حالانکہ وہ اس سے خوب آگاہ تھا، کون نہیں جانتا کہ دنیا کے تمام ممالک سے ہمارے تعلقات "شاندار" نہیں ہیں۔ بھارت، افغانستان، روس۔ کیا یہ "شاندار تعلقات" کے زمرہ میں آتے ہیں؟

بھٹو اپنی تقریر میں بیک وقت سانپ کو مارتے ہوئے لاٹھی کو بچانے کی کوشش میں تھا۔ طاقتور غیر ملکی قوت پر کھلا حملہ اور وہ بھی قومی اسمبل میں۔۔۔ یہ کسی بھی ذمہ دار وزیر اعظم کے لئے ممکن نہیں تھا۔ البتہ اس طریق سے بھٹو نے یہ انکشاف ضرور کر دیا کہ وہ ایک غیر ملکی طاقت کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔

قومی اتحاد کو ملکی و غیر ملکی دونوں ذرائع سے سرمایہ مل رہا تھا اور اس اتحاد میں شامل سیاستدان ایسے لوگ نہیں تھے جو ایک پائی بھی کہیں سے آتی ہوئی چھوڑ دیں۔ انہوں نے صنعت کاروں، تاجروں اور نیشنلائزڈ کارخانوں کے سابق مالکان سے رقمیں بٹوریں تاہم ملکی سرمایہ اس زبردست سرمایہ کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو اس اتحاد کو باہر سے ملا۔

ری پراسیسنگ پلانٹ

مارچ ۱۹۷۶ء میں پاکستان اور فرانس کے درمیان ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کے لئے

تین سال کے طویل مذاکرات کے بعد ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے فرانس ان "تحفظات" پر قطعی مطمئن تھا جو پاکستان نے فراہم کرنے کا یقین دلایا تھا۔ معاہدہ پر پاکستان کی طرف سے بھٹو حکومت اور فرانس کی طرف سے صدر گسکارڈ ڈی اسٹنگ کی حکومت نے دستخط کئے۔ واٹا میں بین الاقوامی ایٹمی کمشن نے معاہدہ کی توثیق کی اس کمشن میں امریکہ کے نمائندہ نے (اس وقت) پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ بین الاقوامی ایٹمی کمشن اس معاہدہ کی توثیق ہرگز نہ کرتا اگر اسے پاکستان کی طرف سے پیش کردہ "تحفظات" پر اطمینان نہ ہوتا بعدازاں اگست ۱۹۷۶ء میں امریکی حکومت نے اس معاہدہ کے سلسلہ میں اپنی کچھ جوابی تجاویز پیش کیں جنہیں بھٹو حکومت نے مسترد کر دیا۔ اس وقت تک فرانس بھی یہ پلانٹ فراہم کرنے کا عزم کئے ہوئے تھا' چنانچہ فرانس کی حکومت نے اس معاملہ میں امریکی مداخلت پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء یعنی بھٹو حکومت کا تختہ الٹے جانے تک فرانس نے اس معاہدہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کی پالیسی اختیار کی۔ بعدازاں جنرل ضیاء نے پاکستان کے عوام کو ۱۴ ماہ تک اس پلانٹ کے بارے میں امید و بیم میں رکھنے کے بعد ۱۲ اگست ۱۹۷۸ء کو ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ انہیں فرانس کے صدر کی طرف سے ایک بڑا "نرم خط" موصول ہوا ہے لیکن اس سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ فرانس بات چیت کے ذریعے اس معاہدہ میں کچھ تبدیلیاں کرنے کا خواہاں ہے جو اس طرز کی ہیں کہ فرانس نے ایک ایسا پلانٹ فراہم کرنے کی پیشکش کی ہے جس میں پلوٹونیم کو الگ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوگی۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ کہانی ختم ہوئی۔ فرانس کی حکومت نے اپنی پوزیشن بدلنے کے حق میں "ری بس مسک سٹنٹی بس" نامی دستاویز کا حوالہ دیا۔

فرانس کی حکومت نے یہ معاہدہ ایک سول اور آئینی حکومت کے ساتھ کیا تھا، فوجی اور آمرانہ حکومت کے ساتھ نہیں ــــ یہ معاہدہ پاکستان کے ایک منتخب وزیراعظم سے ہوا تھا جو فرانس کے تین صدر صاحبان یعنی ڈیگال، پومپیڈو اور گسکارڈ اسٹنگ کے اعتماد پر پورا اترتا تھا۔ معاہدہ کسی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے نہیں ہوا تھا۔

یہ اہم امور بھٹو حکومت کا تختہ الٹتے وقت نہیں سوچے گئے یا پھر بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے میں انہی امور نے اہم کردار ادا کیا۔ بھارت امریکہ سے یورانیم حاصل کر رہا ہے۔ حالانکہ اسے ڈانٹ بھی پڑتی ہے لیکن یہ ڈانٹ اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک کہ بھارت کو امریکہ سے یورانیم حاصل ہو رہا ہے۔

اس کے برعکس جنرل ضیاء صدر فرانس کے ایک "نرم خط" سے پھولے نہ سمائے حالانکہ اس میں

معاہدہ پر نظر ثانی کی بات کی گئی تھی ۔ فرانسیسی بڑے مہذب لوگ ہیں انہوں نے اپنے سیاسی رہنماؤں کو پھانسیاں دینے کا سلسلہ ۱۳ سال سے بند کر رکھا ہے ۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ صدر فرانس "الفاظ سے مالا مال فرانسیسی زبان سے نرم ترین الفاظ منتخب کرتے اور ان کے ذریعہ جنرل ضیا کو "پلانٹ" کی "المناک وفات" سے مطلع کرتے ، جو انہوں نے کر دیا ۔ لیکن نرم ترین الفاظ بھی دکھ درد کا مداوا نہیں ہوتے بلکہ مزید پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں ۔ یہ "نرم خط" نہیں بلکہ ملک کی توہین تھی کہ اسے پلانٹ دینے سے انکار کر دیا گیا ۔ پاکستان کے ایک دیرینہ خواب پر آخری ضرب تھی ۔

بھٹو نے اکتوبر ۱۹۵۸ء سے جولائی ۱۹۷۷ء تک پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لئے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا : بحیثیت وزیر خارجہ ، بحیثیت وزیر ایندھن ، بجلی و قدرتی وسائل اور بحیثیت وزیر انچارج ایٹمی توانائی کمشن اس معاملے سے بھٹو کا ۱۹ سال کی مدت تک گہرا تعلق رہا ۔ ایٹمی توانائی کمشن کے انچارج کا عہدہ محض سائن بورڈ نہیں تھا بلکہ بھٹو نے پورے عزم کے ساتھ اپنے ملک کے لئے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کو ہر دوسرے معاملہ پر فوقیت دی تھی ۔ بھٹو نے سینکڑوں نوجوانوں کو ایٹمی سائنس کی تربیت حاصل کرنے کے لئے یورپ و امریکہ بھیجا تھا ۔ اس نے ایڈورڈ سٹون کو PINS - TECH تعمیر کرنے پر مامور کیا اور ان دنوں کے اسلام آباد کے ویرانہ میں اس کا سنگ بنیاد رکھا ۔ بھٹو نے ۵ میگاواٹ ریسرچ ایٹمی ری ایکٹر کے لئے بھی مذاکرات کئے ۔ وزیر خزانہ شعیب اور پلاننگ کمشن کے ڈپٹی چیرمین سعید حسن کی شدید مخالفت کے باوجود بھٹو نے کینیڈا سے کراچی ایٹمی بجلی گھر کے لئے پلانٹ کے حصول کے کامیاب مذاکرات کئے اور اس کا افتتاح بھی کیا ۔ ۱۹۷۰ء کے وسط تک چشمہ کے ایٹمی پاور پلانٹ کی منظوری دی اور اسی سال فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے مذاکرات مکمل کئے ۔

بھٹو کی تنہا لیکن مردانہ وار کوششوں سے پاکستان کو ایٹمی پلانٹوں کا انفراسٹرکچر (INFRA - STRU - CTURE) اور ایٹمی صلاحیت حاصل ہوئی ۔ پاکستان جیسے غریب و پسماندہ ملک کے لئے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کہ وہ بھارت کے مقابلہ میں اپنے اس ضائع شدہ وقت کو جا پکڑے جو قبل ازیں غفلت کی نذر ہو گیا تھا ۔

بھٹو نے جب ایٹمی توانائی کا کام سنبھالا تھا تو وہ بھارت کے پروگرام سے ۲۰ سال پیچھے تھا لیکن بھٹو حکومت کے خاتمہ تک پاکستان بھارت سے صرف پانچ چھ سال پیچھے رہ گیا تھا ۔ بھٹو کا دعویٰ ہے کہ اگر بعض طاقت ور وفاقی وزراء اور بیوروکریٹوں کی طرف سے مخالفت نہ ہوتی تو بھارت کے ساتھ خلاء کو اور کم کر دیا جاتا ۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کوئی ملک صرف اس لئے دولت مند نہیں ہو جاتا کہ اس کے پاس ایٹمی صلاحیت ہے۔ اگر یہی ایک شرط ہوتی تو تیل پیدا کرنے والا ہر ملک ایٹمی صلاحیت کا مالک ہوتا۔ ایٹمی صلاحیت و قوت کے لئے ایک لازمی شرط "انفراسٹرکچر" ہے۔ اسی مقصد کے لئے بھٹو نے ہزاروں نوجوانوں کو غیر ممالک میں ایٹمی تربیت کے حصول کے کام کو دوسرے تمام امور پر ترجیح دی اس طرح پاکستان کو "ذہنی قوت" حاصل ہو گئی۔ کراچی میں ایٹمی پاور پلانٹ بھی لگ گیا اور اب جو ضرورت تھی وہ ری پراسیسنگ پلانٹ کی تھی۔

بھاری پانی، یورانیم اور نیوکلیر فیبریکیٹنگ پلانٹ کے حصول کے تمام انتظامات کئے جا چکے تھے اس طرح پاکستان ایٹمی توانائی و صلاحیت کے دہانے پر پہنچ گیا تھا اور عین اسی وقت بھٹو کو ایوان اقتدار سے نکل کر موت کی کال کوٹھری میں منتقل ہونا پڑا کیونکہ اس کا عزم تھا کہ اگر عیسائی، ہندو اور یہودی تہذیبیں ایٹمی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں اگر کمیونسٹ طاقتوں کے پاس بھی یہ صلاحیت موجود ہے، اگر اسرائیل اور جنوبی افریقہ اس صلاحیت سے لیس ہیں تو صرف اسلامی تہذیب اس کے بغیر کیوں رہے؟ چنانچہ بھٹو کی شدید جدوجہد سے پاکستان اس صلاحیت کے انتہائی قریب پہنچ گیا تھا۔

یہودی نژاد، سابق امریکی وزیر خارجہ مسٹر ہنری کسنجر بڑے "روشن دماغ" سیاستدان سمجھے جاتے ہیں وہ اس مسئلہ پر بھٹو سے بات چیت کے لئے پاکستان آئے بلکہ یوں کہیے کہ پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ کے حصول سے منع کرنے آئے مگر بھٹو ان کے کسی دباؤ میں نہیں آئے، اس پر "روشن دماغ" کسنجر نے چڑ کر کہا:

"مسٹر پرائم منسٹر۔ ہم آپ کا حشر کر دیں گے"

"بیشک، جو چاہے کیجئے" بھٹو نے اطمینان سے جواب دیا۔ "لیکن پاکستان یہ صلاحیت حاصل کر کے رہے گا"

مسٹر کسنجر نے بھٹو سے یہ بھی کہا کہ امریکی انٹیلی جنس کی رپورٹوں کی یہ کہہ کر توہین نہ کیجئے کہ پاکستان کو اپنی بجلی و توانائی کی ضرورتوں کے لئے ری پراسیسنگ پلانٹ کی ضرورت ہے (مطلب یہ تھا کہ امریکی انٹیلی جنس کے مطابق پاکستان کو بم بنانے کے لئے پلانٹ کی ضرورت ہے) اس پر بھٹو نے کہا:

"میں پاکستان کی بجلی اور توانائی کی ضرورتوں پر بحث کر کے امریکی انٹیلی جنس کی توہین نہیں کروں گا بشرطیکہ آپ بھی پلانٹ کے مسئلہ پر کوئی بات نہ کریں"

لیکن کسنجر تو آیا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔ بھٹو کو اس معاملہ میں بے لچک دیکھ کر امریکہ نے پینترا بدلا اور یہ طے ہو گیا کہ اب بھٹو نہیں رہے گا۔ حتیٰ کہ پیپلز پارٹی اگر الیکشن جیت بھی جائے تو بھی بھٹو نہیں رہ سکتا تھا گویا الیکشن نتائج تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا اسی لئے اصغر خاں نے کہا تھا۔ "ہم الیکشن جیت

چکے ہیں اب تو صرف ایک رسم پورا کرنی ہے" اور اسی لئے دوسری بار الیکشن کی نوبت نہیں آنے دی گئی۔ امریکی انٹیلی جنس خوب جانتی تھی کہ بھٹو پھر الیکشن جیت جائیگا۔ اسی لئے قومی اتحاد سے سمجھوتہ ہونے کے باوجود الیکشن نہیں ہونے دیئے اس کے برعکس فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

جیل میں بھٹو ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے طنزیہ کہا کرتا تھا کہ جنرل صاحب کو فرانس سے "لیموں" مل گیا اور قومی اتحاد کو "حلوہ" مل گیا، پاکستان کو "لڈو" ملا اور مجھے سزائے موت ــــ لیکن میری زندگی سے کیا فرق پڑتا ہے جبکہ میں اپنے کروڑوں ہموطنوں کو ایٹمی دھوئیں کی یلغار میں بے بسی سے کھڑا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ بھٹو چاہتا تھا کہ ایک ایسا وائٹ پیپر بھی شائع کیا جائے جس کی تین جلدیں ہوں۔ جلد نمبر ایک میں ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے لئے پاکستان کی کوششوں کا ذکر ہو۔ جلد دوم میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی کوششوں کے خلاف سازش کا ذکر ہو اور جلد سوم میں اس سازش کی کامیابی، اس کے نتائج کا ذکر ہو۔ ان تینوں جلدوں میں تمام متعلقہ سرکاری دستاویزات، نوٹ اور یادداشتیں بڑے طمطراق سے دی جاسکتی ہیں۔ جلد نمبر ایک کی تاریخ اجراء ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء اور جلد دوم کی ۲۸ اگست ۱۹۷۸ء رکھی جائے اور تیسری جلد.....

قومی مفادات ذاتی قسم کی عاشقانہ لگن کے بغیر انجام نہیں پاتے۔ بھٹو نے قومی مفاد کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے جیل میں بھی غیر انسانی سلوک اور اشتعال انگیزی کے باوجود حمود الرحمٰن کمشن رپورٹ پر کسی تبصرہ سے گریز کیا کہ اس سے مسلح افواج کے نام پر بٹہ لگے گا۔

○

تیرھواں باب

بیٹوں
ضیاء کو کمانڈر انچیف
کیوں بنایا؟

پاکستان کے انٹیلی جنس اداروں
کے "کارنامے"

جنرل غلام جیلانی

○

پاکستان میں سرکاری جاسوسی ادارے (سول اور ملٹری انٹیلی جنس سروسز جو عرف عام میں سی آئی ڈی کہلاتی ہیں) کیسے انوکھے کمالات دکھاتے اور اپنے فرائض کے علاوہ کتنے حیرت انگیز معاملات انجام دیتے رہے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ زیادہ تر تو یہی خیال کیا جاتا ہے کہ مخبری کے یہ ادارے گھر بیٹھے جھوٹی سچی رپورٹیں حکمرانوں کو پہنچاتے اور انہیں گمراہ کرنے کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے پورا کرتے ہیں، یہ خیال بڑی حد تک درست بھی ہے۔ تاہم عوام کو یہ خبر نہیں کہ اس ملک کے بعض بڑے بڑے معاملات میں ان اداروں کا بڑا گہرا ہاتھ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ معاملات ان کے فرائض میں شامل نہیں ہوتے۔ یوں کیسے کہ انٹیلی جنس سروسز اکثر و بیشتر اپنے فرائض کے سوا باقی سارے کام کرتے ہیں۔

کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ پاکستان کے موجودہ سربراہِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کو فوج کا کمانڈر انچیف بنانے میں بھی ایک انٹیلی جنس ادارے کے سربراہ کا ہاتھ تھا۔ جنرل ضیاء اس وقت کئی فوجی جرنیلوں سے جونیئر تھے اور بھٹو اس وقت ملک کا مختار کل بنا ہوا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کو نصف درجن کے لگ بھگ دوسرے فوجی جرنیلوں پر ترجیح و فوقیت دی اور انہیں دوسرے سارے جرنیلوں کے اوپر لے آئے۔؟

مجھے پھر کہنے دیجئے کہ سرکاری جاسوسی ادارے حیرت انگیز کمالات دکھاتے رہے ہیں اور یہ بھی

ان کا ایک "کمال" تھا کہ جنرل ضیاء پانچ چھ جرنیلوں کو کراس کر کے سب سے اوپر کی نشست پر جا بیٹھے۔ ضیاء حکومت نے بھٹو کے خلاف جو وائٹ پیپر جاری کیا اس میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے ملک کے خفیہ اداروں کو اپنا "سیاسی بازو" بنا لیا تھا اور جب سیاست ایسے حساس اداروں، جیسا کہ انٹیلی جنس بیورو یا انٹر سروسز انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ میں، تک پہنچ جائے تو یہ (سیاست) ان اداروں کو ان کے بنیادی مقصد یعنی مملکت کی خارجی و داخلی سلامتی سے ہٹا دیتی ہے۔ بھٹو نے انٹیلی جنس بیورو کو ایک ایسے آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جس کا مقصد صرف بھٹو کا ذاتی اور سیاسی کام کرنا رہ گیا تھا۔ جب بھٹو کو یہ اطلاع ملی کہ انتخابات میں حزب مخالف کی مختلف پارٹیاں ان کے خلاف متحد ہونے کی کوشش کر رہی ہیں تو انہوں نے انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر کو حکم دیا کہ:

"مہربانی سے ان پارٹیوں کی مکمل نگرانی کریں۔ انہیں متحد ہونے کی اجازت نہ دیں، یہ اصول کا معاملہ ہے، خوف کا نہیں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ انہیں الگ الگ (منتشر) رکھیں۔"

انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی بھی اسی طرح بھٹو کے ہاتھ میں کھلونا بنے رہے ہوں گے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور اصل بات یہ ہے کہ خود بھٹو ان لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا اور ایک قطعی مقصد کے لئے تو ان لوگوں نے بھٹو کو محض اپنا آلۂ کار بنایا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو غلام جیلانی صاحب انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ وہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ فوجی انقلاب کے چند ماہ بعد انہیں ڈیفنس سیکرٹری بنا دیا گیا، اس کے بعد وہ پنجاب کے "مضبوط گورنر" رہے۔ اگر جیلانی صاحب بھٹو کے آلۂ کار ہوتے تو وہ بھی بڑی آسانی سے اسی طرح منظر عام سے غائب ہو جاتے جیسا کہ بھٹو کے دوسرے حامی یا آلۂ کار ہوئے۔ ان میں سے کچھ تو برطرف کر دیئے گئے اور کچھ گرفتار کر لئے گئے۔ صرف جنرل جیلانی واحد مثال ہیں جن کے خلاف کوئی کاروائی تو کجا انہیں پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کی گورنری حاصل ہوئی ۔۔۔ مگر کیوں؟

بھٹو کے ایک سپیشل سیکرٹری اور سابق انسپکٹر جنرل راؤ عبدالرشید ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ہی گرفتار کر لئے گئے تھے۔ فیڈرل سیکورٹی فورسز کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود اور انٹیلی جنس بیورو کے سابق ڈائریکٹر شیخ اکرم بھی گرفتار ہوئے۔ بھٹو کے چیف سیکورٹی آفیسر سعید احمد جولائی کے وسط اور اگست کی ابتداء میں گرفتار کر لئے گئے۔ بھٹو کے سیکرٹری افضل سعید بھی اسی دوران گرفتار ہوئے۔ سابق سیکرٹری داخلہ فضل حق کو فوری طور پر ان کے عہدے سے برطرف کیا گیا۔ اس وقت کے سیکرٹری داخلہ مسٹر ایم کے چوہدری صرف اس لئے بچ سکے کہ وہ اس وقت کے پاکستان

کے چیف جسٹس کے بھائی تھے، لیکن فوجی انٹیلی جنس کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ پانچ سال تک بھٹو حکومت کے سب سے بڑے انٹیلی جنس افسر ہونے کے باعث وہ سب سے زیادہ بھٹو کو جانتے تھے۔ بعض انتہائی حساس موضوعات پر بھٹو بڑی بے تکلفی کے ساتھ جنرل جیلانی سے بحث و تمحیص کر لیتے تھے۔

حد یہ ہے کہ بھٹو، بیوروکریسی کے حصار کو توڑنے کے لئے جو نیا سیاسی ڈھانچہ لانے کا منصوبہ بنا رہے تھے اُس پر بھی انہوں نے جیلانی سے بات چیت کی۔ بعض اصلاحات اور بعض محکموں کی تنظیم نو کے معاملات پر بھی جیلانی سے بات چیت ہوئی۔ جنرل جیلانی بھٹو کے مستقبل کے ان منصوبوں پر بحث میں بڑے جوش و جذبہ سے حصہ لیتے تھے۔

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے نزدیک بھٹو ایک جدید میکیاولی اور قاتل تھا۔ اسے ثابت کرنے کے لئے انہوں نے مسلم ممالک اور چین کا دورہ کر کے وہاں کے حکمرانوں کو قائل کرنے کے لئے مختلف ٹائپیں اور دستاویزات بھی دکھائیں تو پھر انہوں نے اس شخص پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا جس نے فوجی انقلاب سے صرف چند ماہ پہلے بھٹو کے بارے میں لکھا:

"بھٹو کے درجہ و مقام کی کوئی متبادل قیادت پاکستان میں موجود نہیں بلکہ اس درجہ و مقام کے قریب بھی نہیں، بھٹو واحد پاکستانی رہنما ہیں جنہیں بین الاقوامی طور پر سنا جاتا ہے۔ جن کا عالمی امیج موجود ہے۔ انہیں بین الاقوامی اقتدار کی سیاسیات کے کھیل کا گہرا علم اور تجربہ حاصل ہے۔ انہوں نے پاکستان کی بہترین خدمات انجام دی ہیں اور وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کی علامت بن گئے ہیں۔"

ایک ایسے ماحول میں جہاں "جئے بھٹو" کا نعرہ لگانے والے قابل رحم شہریوں کو کوڑے لگائے جاتے اور قید سخت کی سزائیں دی جاتی تھیں، جہاں پیروں فقیروں کے مزاروں پر بھٹو کے لئے دعائیں مانگنے والے سادہ دل عورتوں پر لاٹھی چارج ہوتا اور آنسو گیس کے گولے پھینکے جاتے تھے، اس ماحول میں مذکورہ بالا "عظیم خراج تحسین" ادا کرنے والا فوجی انٹیلی جنس کا سابق سربراہ کیسے محفوظ رہا؟ اور یہی نہیں بلکہ مزید اہم عہدوں پر ترقی کر گیا؟

اس سوال کا جواب ماضی کے ماہ و سال میں ملتا ہے۔ ان دنوں لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی نے بھٹو پر اثر انداز ہونے، بھٹو کو آلۂ کار بنانے اور ایک فرد کا ذاتی مقصد حاصل کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی انہوں نے بھٹو سے ملاقات کر کے یہ سفارش کی کہ اس وقت کے میجر جنرل ضیاء الحق کو تقریباً چھ سینئر جرنیلوں سے آگے نکال کر چیف آف آرمی سٹاف کے عہدہ پر متعین کر دیا جائے کیونکہ "ضیاء الحق بہت اچھے

انسان ہیں، وفادار ہیں، نیک اور سادہ دل ہیں"۔

جنرل جیلانی پر ہاتھ نہ ڈالنے اور ان پر اقتدار کے دروازے کھولنے کی پُراسرار کہانی کا سب سے اہم باب یہی ہے اور اس کے ساتھ اب اگر یہ دریافت کیا جائے کہ کس نے کس کا استعمال کیا؟ تو بے جا نہ ہوگا۔ کیا اس طریق سے جنرل ضیاء الحق کو چھ سینئر جرنیلوں پر فوقیت دلا کر فوجی انٹیلی جنس کے سربراہ نے بھٹو کا استعمال نہیں کیا؟ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے خود کو ترقی دلانے والے جنرل جیلانی کا احسان تو یاد رکھا اور اس کے صلہ میں انہیں اعلیٰ تر، مقتدر عہدوں سے نوازا لیکن ترقی دینے والے بھٹو کا احسان کیوں فراموش کر دیا گیا؟

یہ بڑا پیچیدہ سوال ہے لیکن اس کا جواب بالکل سادہ ہے، یہ کہ پھندا تو ایک تھا اور گردنیں دو۔ ایک گردن قیدی بھٹو کی تھی جو قتل کے الزام میں ماخوذ تھا اور دوسری گردن خود اپنی تھی۔ ظاہر ہے کہ پھندا اگر ایک ہی گردن میں پڑنا ہے تو پھر وہ اپنی گردن کیوں ہو؟

بھٹو نے انٹیلی جنس اداروں کو اپنے ذاتی سیاسی مقاصد کے لئے کیا استعمال کرنا تھا وہ تو خود ان کے ہاتھوں استعمال ہو رہا تھا۔ حد یہ ہے کہ بھٹو اقتدار کے انتہائی نازک دور میں "اندر کی تمام خبریں" ایک خفیہ ہاتھ کے ذریعہ ایک اردو اخبار کو فراہم ہو رہی تھیں، جس کا علم بھٹو کو بہت بعد میں، قید میں ہوا۔ تاہم ایوب خان اور یحییٰ خان بلاشک و شبہ انٹیلی جنس اداروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے۔ یحییٰ خان نے ان خفیہ اداروں کو ۱۹۷۰ء کے انتخابات پر اثر انداز اور سیاستدانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے استعمال کیا لیکن اوّل الذکر مقصد (انتخابات پر اثر انداز ہونے) میں یہ ادارے قطعی ناکام رہے۔ شاید اس لئے کہ اس کا انہیں سرے سے تجربہ نہ تھا۔ البتہ سیاستدانوں میں پھوٹ ڈالنے میں وہ خاصے کامیاب رہے کہ یہ ان کا "خاص شعبہ" تھا۔ انتخابات کے دنوں میں اور ان کے بعد خود پیپلز پارٹی کو ان خفیہ اداروں کے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ جنوری ۱۹۷۲ء میں لندن روانگی سے قبل مجیب الرحمٰن اور بھٹو کی جو ملاقات ہوئی اس میں مجیب الرحمٰن نے کہا:

"مغربی پاکستان کے پانچ افراد کو پلٹن میدان میں پھانسی لگا دینے کو جی چاہتا ہے اور ان پانچ افراد میں سے دو، سول اور فوجی انٹیلی جنس سے تعلق رکھتے ہیں"۔

مجیب الرحمٰن نے بھٹو کو ان لوگوں (خفیہ اداروں) کی شرانگیزیوں سے تفصیلاً آگاہ کیا۔ بھٹو نے مجیب کو بتایا کہ ہمارا تجربہ بھی آپ سے مختلف نہیں ہے۔ ہمارے بھی ایسے ہی احساسات تو ہیں لیکن ہم پھانسیوں تک

نہیں پہنچتے۔ ایوب خان بھی سیاسی مقاصد کے لئے انٹیل جنس ایجنسیوں کو استعمال کرتا رہا۔ اس نے سول اور فوجی انٹیل جنس کے ذریعہ سے "جمہوری مجلس عمل" (ڈیک) کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس نے پیپلز پارٹی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے بھی ان اداروں کو استعمال کیا۔ ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۶۷ء کو جب پارٹی کی بنیاد رکھنے کے لئے اجلاس ہو رہے تھے تو ایوب خان نے انہیں سبوتاژ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہی اداروں کے ذریعہ سے ایوب خان نے بھٹو کی نقل و حرکت میں دشواریاں پیدا کیں۔

ایسے حالات میں اگر انٹیل جنس ادارے اپنے اصل فرائض سے غافل رہ جاتے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ۱۹۶۵ء میں جب پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو پاکستان کی فوجی انٹیل جنس یہ بھی معلوم نہ کر سکی کہ بھارت کا "آرمرڈ ڈویژن" کس مقام پر ہے؟ انٹیل جنس کی اس ناکامی پر ایوب خان سخت مشتعل ہوئے۔ انہوں نے انٹر سروسز انٹیل جنس کے اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل بریگیڈیئر ریاض حسین کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھٹو بھی اس موقع پر موجود تھے ریاض حسین آئے تو ایوب خان نے انہیں انتہائی سخت الفاظ میں برا بھلا کہا اور یہاں تک کہہ گذرے کہ فوجی انٹیل جنس اس ملک کو گرا دینے پر تلی ہوئی ہے۔

بھٹو نے بریگیڈیئر ریاض حسین سے کہا:

"بھارت کا آرمرڈ ڈویژن، گھاس کے ڈھیر میں کوئی سوئی تو نہیں کہ اس کا سراغ نہ لگایا جا سکے"

اس پر صدر ایوب نے زخم خوردہ لہجے میں کہا:

"سوئی کہاں ــــ وہ تو ایک درندہ ہے!"

کانپتی لرزتی آواز میں بریگیڈیئر ریاض حسین نے جواب دیا

"سر ــ جون ۱۹۶۴ء سے ملٹری انٹیل جنس کو تو انتخابات اور بعد از انتخابات کی سیاسی ڈیوٹیوں سے ہی فرصت نہیں ملی تو وہ اپنا کام کیا کریں؟"

یہ محض خوش قسمتی تھی کہ چند دن بعد بھارت کے اس "آرمرڈ ڈویژن" کے قیام کا اتفاقاً پتہ چل گیا اور وہ بھی انٹیل جنس اداروں کے ذریعہ سے نہیں، ہوا یوں کہ جموں کے قریب ایک مجاہد نے ایک بھارتی قاصد کو گولی سے اڑایا۔ اس قاصد سے "آرمرڈ ڈویژن" کے مقام کا انکشاف ہوا۔ پاکستان کی سیاست میں انٹیل جنس اداروں کے مؤثر کردار کا ایک اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ ان حضرات نے ایوب خان کے مقابلہ کے لئے صدارتی انتخابات میں جنرل اعظم خان کو امیدوار بننے سے روکا۔

ایک اور واقعہ بے حد حیرت انگیز ہے۔ نومبر ۱۹۶۴ء میں مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے

ایک نہایت معروف سیاستدان کراچی میں ، کلفٹن پر ذوالفقار علی بھٹو سے ملے ۔ دونوں آپس میں دوست تھے ۔ وہ سیاستدان سی او پی (کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز یا متحدہ مخالف جماعتیں) میں ایک اہم مقام رکھتے تھے ۔ ڈنر کے بعد، جانے سے کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو کچھ اور سکیڑتے ہوئے بھٹو سے کہا:

"پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم ایک مہینہ کے اندر اندر ایک ایسا خوفناک دھماکہ کریں گے جس سے ایوب خان اور ہم سب کے پرخچے ہواؤں میں اُڑ جائیں گے ۔"

بھٹو نے ان ریمارکس کو مذاق گردانا مگر اس سیاستدان نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"دیکھو میرے دوست، مجھے تفصیلات کا تو علم نہیں مگر یہ "دھماکہ" واشنگٹن سے ایوب خان کے ایک ٹیلی گرام سے وابستہ ہے ۔ یہ ٹیلی گرام ایوب خاں نے اس وقت کے وزیراعظم پاکستان کو صدر ناصر کے بارے میں بھیجا تھا (خیال رہے کہ اس وقت ایوب خان فوج کے کمانڈر انچیف تھے)

بھٹو نے راولپنڈی پہنچ کر ایوب خان سے اس بات کا ذکر کیا ۔ ایوب خان نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا ، ان کے چہرے پر کچھ تاثرات اُبھرے پھر چند لمحے وہ چھت کی طرف نگاہیں جمائے رہے بعد ازاں ڈیسک سے ٹیلی فون اٹھائی اور بھٹو سے کہا:

"لیکن اس بات کو مدت گذر گئی ہے اور مجھے پوری طرح یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے ٹیلی گرام میں کیا لکھا تھا ؟"

کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے مزید کہا:

"یہ تار کانفیڈنشل تھا ، دوسروں کو بتانے کے لئے نہیں تھا ۔"

بھٹو نے بدستور خاموش اختیار کئے رکھی جس پر ایوب خان نے مزید بتایا کہ انہوں نے واشنگٹن کے پاکستانی سفارتخانہ میں اس ٹیلی گرام کی کاپی کو جلا دیا تھا اور پاکستان واپس آکر یہ تسلی کر لی تھی کہ دفتر خارجہ کی کاپی اور دوسری دو کاپیاں بھی ضائع کر دی گئی ہیں ۔

بھٹو نے ان سے کہا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوڑھا اپنے ساتھ اس کی ایک کاپی اس وقت لے گیا جب وہ وزیراعظم کی حیثیت سے ختم ہوا ۔"

انہوں نے ایوب خان سے دریافت کیا کہ اگر انہیں یاد ہو تو بتائیں کہ انہوں نے اس خفیہ پیغام کی کاپیوں کا کیا کیا تھا ؟ اُس میں جو کچھ لکھا تھا اُسے یاد کرنے کی کوشش کریں ۔

اس پر ایوب خان نے کہا "سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ٹیلی گرام حاصل کیا جائے"
اس کے ساتھ ہی ایوب خان نے گھنٹی بجا کر اپنے ملٹری سیکرٹری کو طلب کیا اور اس سے کہا،
"نوازش ــــ ڈائریکٹر انٹیلی جنس بورڈ اور ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز انٹیلی جنس کو فوراً یہاں بلاؤ"
آدھ گھنٹہ کے اندر اندر یہ دونوں صاحبان ایوب خان کے دفتر میں ان کے سامنے موجود تھے۔ ایوب خان نے انہیں وہ سب کچھ بتایا جو بھٹو نے ایوب خان سے کہا تھا اور وہ بھی جو ایوب خان نے بھٹو سے کہا تھا۔ اس کے بعد وہ کرسی پر آگے کی طرف جھک کر ان افسروں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے،
"جنٹلمین ــــ میں ہر قیمت پر وہ ٹیلی گرام چاہتا ہوں خواہ اس کی قیمت میں قلعہ ناکس کا تمام سونا خرچ ہو جائے"
اس ہدایت کے تقریباً ۲۰ دن بعد صدر ایوب خان کے اے ڈی سی نے بھٹو سے کہا کہ آپ فوراً ایوب خان سے ملیں۔ بھٹو ایوب خان کے دفتر میں داخل ہوئے تو ایوب خان نے اس خفیہ پیغام کے ٹیلی گرام کو ہوا میں لہرایا اور کہا ــــ "مسٹر ــــ کام بن گیا ہے۔ ٹیلی گرام کی کاپی مل گئی ہے"
پھر انہوں نے ٹیلی گرام بھٹو کے ہاتھ میں تھما دیا اسے پڑھ کر بھٹو نے کہا ــــ "مسٹر پریذیڈنٹ، میری انگلیاں جل اٹھی ہیں، جناب عالی اس ٹیلی گرام کو فوراً آگ لگا دیجئے"
ایوب خان ان دنوں تمباکو نوش ترک کر چکے تھے۔ بھٹو کو سگار پینے کی عادت تھی مگر ماچس یا لائٹر ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ ڈیسک پر چاندی کا ایک سگریٹ باکس پڑا تھا۔ بھٹو نے اس میں ہاتھ ڈالا اور ماچس نکال کر ایوب خان کو دے دی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے ٹیلی گرام کو اسی وقت آگ لگا دیں۔
ٹیلیگرام کی اس کاپی کی برآمدگی واقعی ایک شاندار سیاسی کارنامہ تھا جو ایک انٹیلی جنس ایجنس نے انجام دیا تھا۔ یہ کارنامہ پاکستان کے صدر کی ذات کے تحفظ کے لئے انجام دیا گیا۔ اس ضمن میں اور بہت سی باتیں بیان کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انٹیلی جنس کے ادارے اپنے فرائض کے بجائے مارشل لاء کے ڈکٹیٹروں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ موضوع بہت طویل ہے اور بڑا اچھوتا بھی ــــ ہمارے یہاں امریکی سی آئی اے، روس کے جی بی، بھارت را، اور افغان خاد کے کارناموں یا سیاہ کاریوں پر تو کتابیں اور مقالے ڈھیروں کی تعداد میں موجود ہیں مگر خود اپنے ملک کی انٹیلی جنس ایجنسیوں پر کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ شاید وقت گذرنے کے ساتھ اور بہت سے امور کا انکشاف ہو سکے۔ فی الحال تو اس پر اکتفا کیجئے کہ جنرل ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف بنانے میں انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل غلام جیلانی کا مشورہ کارفرما تھا۔!

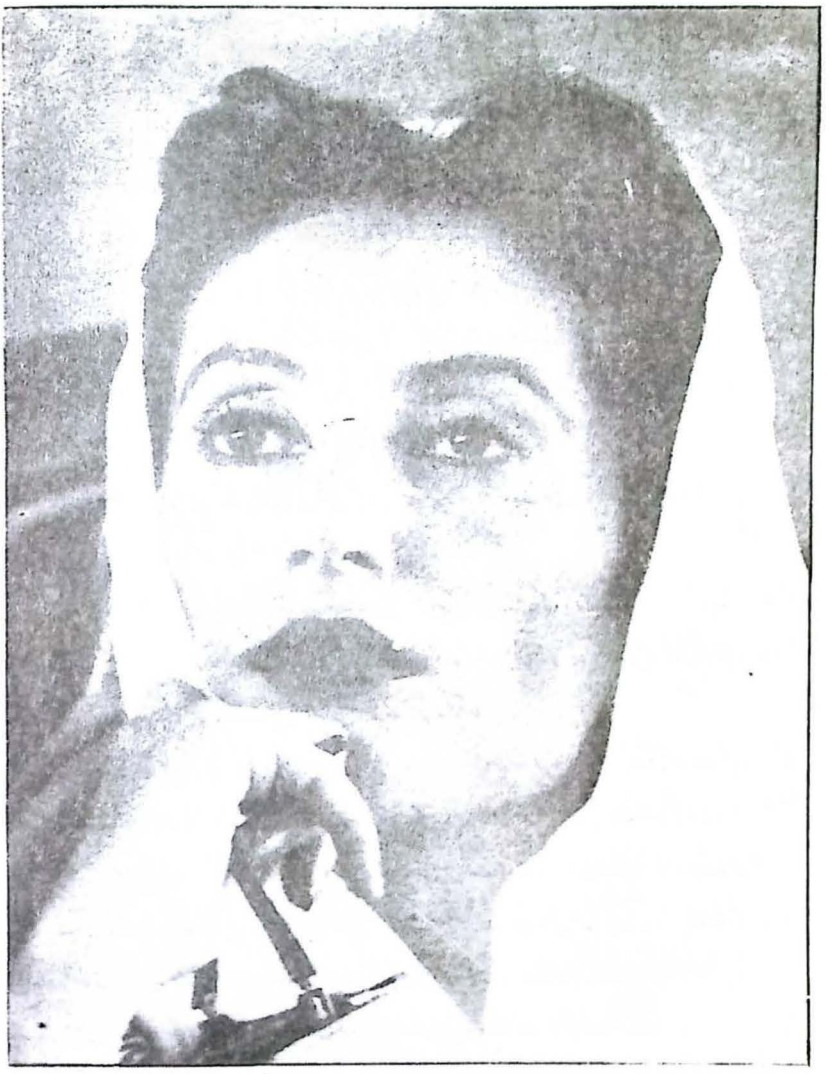

بینظیر بھٹو ـــــ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد

چودھواں باب

بھٹو اور فوجی ٹولہ میں مفاہمت کیوں نہ ہو سکی؟

فوجی حکمرانوں کو بھٹو سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہا

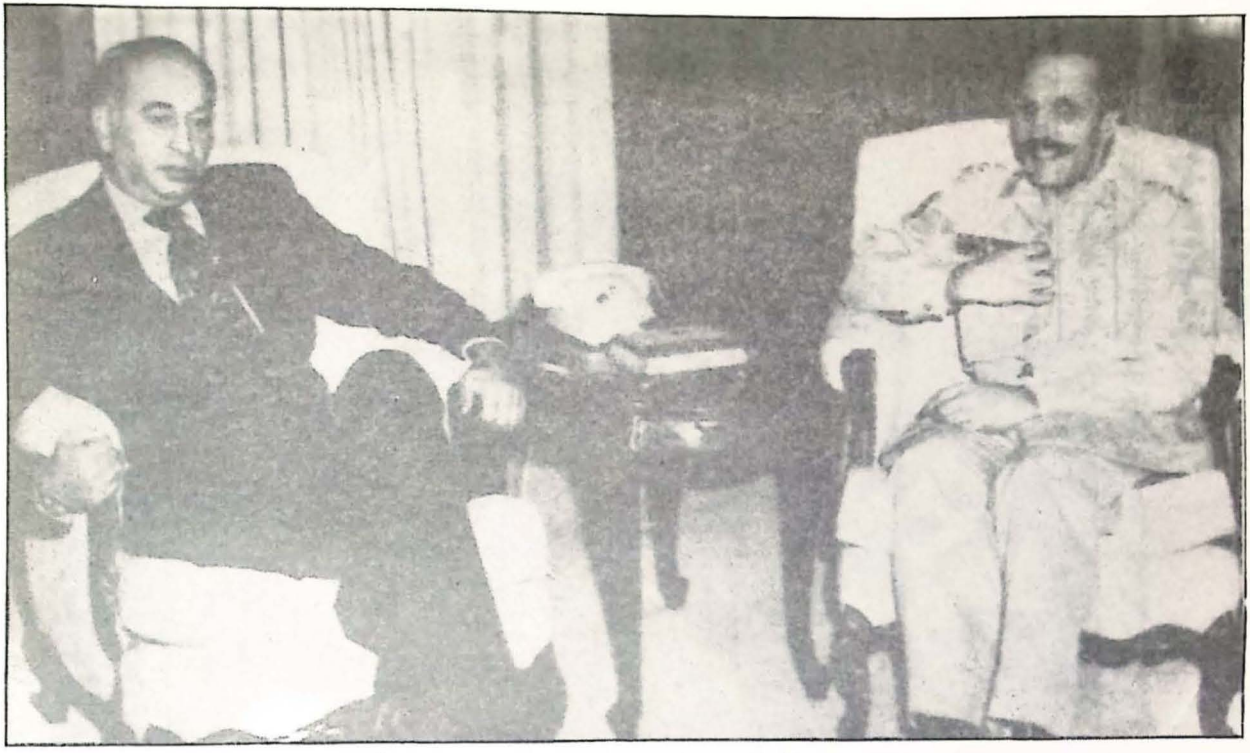

جنرل ضیاالحق مری میں حفاظتی نظر بندی کے دوران ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کر رہے ہیں

مری کی ملاقات

مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ، دوسرے لیڈروں سمیت وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی حراست میں لے لیے گئے۔ جولائی کے آخر تک وہ دوسرے رہنماؤں کے ساتھ ہی نظر بند رہے۔

پھر کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے انہی دنوں بھٹو صاحب کی تقدیر کا فیصلہ کر ڈالا۔ اس ضمن میں بھٹو کو فرار ہو جانے کی پیش کش اور مری میں بھٹو سے جنرل ضیاء کی ملاقات قابل ذکر ہیں۔ جن کا تذکرہ قبل ازیں "مون ڈائجسٹ" کے ان انٹرویوز میں ہو چکا ہے جو میر علی احمد تالپور اور میجر جنرل (ریٹائرڈ) راؤ فرمان علی سے لیے گئے۔ اس کے مطابق ضیاء کابینہ کے وزیر دفاع میر علی احمد تالپور نے "مون ڈائجسٹ" کے لیے ایک انٹرویو میں راقم الحروف کو بتایا تھا کہ جس رات بھٹو حکومت کو "ٹیک اوور" کیا گیا اس رات میری اطلاع کے مطابق بھٹو سے فوجی افسروں کے باقاعدہ مذاکرات ہوئے تھے اُن مذاکرات میں بھٹو صاحب کو یہ پیش کش کی گئی تھی کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ لیکن بھٹو صاحب کا موقف یہ تھا (اور وہ اس پر سختی سے قائم تھے) کہ میں آئینی وزیر اعظم ہوں اگر میں ملک چھوڑ کر چلا گیا تو اس آئینی پوزیشن سے گر کر محض ایک مجرم بن جاؤں گا۔ پھر انہیں جب مری میں نظر بند کیا گیا تو جنرل ضیاء الحق نے ان سے ملاقات کی اس ملاقات میں بھٹو نے جنرل صاحب سے بڑا درشت رویّہ اختیار کیا اور جنرل صاحب سے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ نے آئین کی شق نمبر ۶ پڑھی ہے؟ یاد رہے کہ آئین کی شق نمبر ۶ کے تحت آئین کو معطل کرنے کی سزا موت ہے۔ جنرل صاحب کو بھٹو سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ ایسا رویّہ اختیار کریں گے۔

اس ملاقات سے جنرل صاحب کو اندازہ ہوا کہ انہیں دوبارہ کمانڈر انچیف کے عہدہ سے بھی الگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گئے۔ اس کی تائید خود جنرل صاحب نے ایک انٹرویو میں کی تھی۔ مری کی اس ملاقات کے بعد بھٹو صاحب سے وہ تمام مراعات واپس لے لی گئیں جو قبل ازیں انہیں دی گئی تھیں (اس کی تصدیق جنرل چشتی نے ایک ملاقات کے دوران مجھ سے کی تھی کہ اس ملاقات کے بعد، بھٹو کا تمام پرائیویٹ سٹاف واپس لے لیا گیا تھا۔

میر علی احمد تالپور نے یہ انکشاف بھی کیا کہ جنرل ضیاؑ الحق نے بھٹو کے تیور دیکھتے ہوئے الیکشن ملتوی کرنے کا پروگرام بنایا۔ افسوس تو یہ ہے کہ بھٹو جیسا زیرک سیاستدان جو قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات میں بھی یہ کہتا رہا کہ قومی اتحاد نے کوئی سمجھوتہ نہ کیا تو "فرشتے" آکر اقتدار پر قبضہ کر لیں گے اور ۱۹۷۳ کا آئین معطل کر دیا جائے گا۔ اس کے باوجود وہ رونما ہونے والے حالات کو نہ سمجھ سکا۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) راؤ فرمان علی نے بھی ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد، مارشل لاء حکام نے بھٹو کو بیرونِ ملک چلے جانے کی پیش کش کی تھی لیکن بھٹو نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا کیونکہ بھٹو کا خیال تھا کہ ملک سے بھاگ نکلنے سے ان کا تمام سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ اور وہ صرف ایک مجرم کی حیثیت اختیار کر جائیں گے ایسا مجرم جو سزا سے بچنے کے لیے مفرور ہو گیا۔

جن دنوں لاہور ہائی کورٹ میں بھٹو کے خلاف مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی ذوالفقار علی بھٹو کو بیرونِ ملک چلے جانے کی پیش کش کی گئی۔ اور یہ تجویز کیا گیا کہ اگر وہ ملک سے نکل جائیں تو حکام یہ مشہور کر دیں گے کہ بھٹو صاحب کوٹ لکھپت جیل سے فرار ہو گئے۔ لیکن بھٹو نے یہ تجویز بھی نہیں مانی اس ضمن میں جب راؤ فرمان علی سے دریافت کیا گیا۔

"آپ کس بنیاد پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بھٹو کو فرار ہو جانے کی پیش کش کی گئی؟ آپ کو اس کا علم کہاں سے ہوا؟"

راؤ فرمان علی نے جواب دیا "جنرل چشتی نے مجھے ایک ملاقات میں ان امور سے آگاہ کیا اور بتایا تھا کہ بھٹو کو یہ پیش کشیں ہوتی رہیں مگر وہ نہیں مانا"۔

اقتدار سے معزولی کے بعد بھٹو کی مقبولیت کا گراف گرنے کی بجائے اور بلند ہو گیا۔ چنانچہ جب بھٹو نے کراچی سے لاہور تک بذریعہ ٹرین سفر کرنے کا فیصلہ کیا تو مارشل لاء حکام کو خطرہ لاحق ہوا۔ کہ جس ریلوے سٹیشن پر بھی گاڑی رُکے گی وہاں لوگ جوق در جوق بھٹو کو دیکھنے اور تقریر سننے آئیں گے۔ بلاشک وشبہ جنرل ضیاؑ الحق اور ان کے ساتھی جرنیلوں نے بھٹو کی مقناطیسی شخصیت کی بے پناہ کشش کا انتہائی درست اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ وہ سمجھ گئے تھے کہ بھٹو کے عوامی استقبال سے ایک جوابی تحریک شروع ہو جائے گی۔ جو قومی اتحاد کے اس غبارہ سے ہوا نکال دے گی جسے ان لوگوں نے امریکہ کی شہ اور اعانت سے اور ملکی سرمایہ داروں کی مدد سے اڑایا تھا۔ عجیب بات ہے کہ جمہوریت کے چیمپئن اور نظامِ مصطفیٰؐ کے شیدائی فوجی آمریت کے آنے کے بعد نہ جمہوریت کا نام لے رہے تھے اور نہ ہی نظامِ مصطفیٰؐ کا — دونوں ہی نعرے انہیں سو فیصد بھول گئے تھے اور اس حقیقت سے یہ امر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس ایجی ٹیشن کا اصل مقصد نہ تو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات تھے اور نہ ہی نظامِ مصطفیٰؐ کا قیام اس کا مطمع نظر تھا۔ اس کا مقصد صرف اور صرف بھٹو حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ چنانچہ جب فوج نے تختہ اُلٹ دیا تو وہ تمام سیاسی عناصر جنہوں نے اپنے نعروں سے آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا، یوں خاموش اور پرسکون ہو گئے جیسے ان کے کلیجوں میں اندر تک ٹھنڈک پڑ گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ سہ فریقی معاہدہ، سودا یا سازش کامیاب رہے تھے تو اب کہاں کے انتخابات اور کیسا نظامِ مصطفیٰؐ۔ سب کی چھٹی کر دی گئی۔ اب "خالصہ" راج کر رہا تھا، امریکہ کا مقصد حاصل ہو گیا تھا اور قومی اتحاد — اس کی ایک ٹوٹی

انہیں وزارتیں دے کر رد کی گئی۔

لیکن مارشل لاء حکام اپنی رپورٹوں اور امریکی رپورٹوں کی بنیاد پر جانتے تھے۔ کہ بھٹو کی شخصیت کی بے پناہ کشش بدستور قائم ہے چنانچہ بھٹو اگر کراچی سے لاہور تک ٹرین میں سفر کرتا ہے تو اس کی جادو بیانی لوگوں کو سڑکوں پر لے آئے گی۔ اور قومی اتحاد کے جلسوں اور جلوسوں سے کہیں بڑے عوام کے ہجوم غفیر سنبھالنا مشکل بھی ہوں گے اور ساتھ ہی سازش کا بھانڈا بھی پھوٹ جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بھٹو کو ٹرین کے سفر سے جبراً روک دیا گیا اور صرف ہوائی جہاز سے سفر کی اجازت دی گئی۔

۸ راگست ۱۹۷۷ء کو یعنی مارشل لاء کے نفاذ کے ایک ماہ تین دن بعد ذوالفقار علی بھٹو طیارہ سے لاہور کے ہوائی اڈہ پر اترے تو ایک بہت بڑا ہجوم ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس ہجوم نے بھٹو اور جمہوریت کے حق میں نعرے لگائے لیکن بھٹو نے کوئی تقریر نہیں کی انہوں نے لوگوں کو صرف یہ ہدایت کی کہ وہ پر امن طور پر منتشر ہو جائیں۔ اور اچھے دنوں کا انتظار کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارشل لاء حکام نے بھٹو کو کوئی ایسی پٹی پڑھائی تھی جس کے تحت وہ لوگوں سے براہِ راست خطاب سے کترا گئے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے ۹۰ دن کے "حلفیہ جھوٹ" پر یقین کر کے انتخابات کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ بہر حال لوگ ان کی ہدایت پر منتشر تو ہو گئے لیکن واپسی میں عوام کے ایک گروہ کا قومی اتحاد کے رہنماؤں سے اچانک آمنا سامنا ہو گیا یہ رہنما کسی اجلاس سے اٹھ کر آ رہے تھے۔ ہجوم نے انہیں دیکھ لیا۔ انہیں دیکھ کر عوام سخت مشتعل ہوئے۔ ان میں سے ایک دو کے ساتھ لوگوں نے سخت بدسلوکی کی اور انہیں مارشل لاء کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا اس وقوعہ سے فوجی ٹولے کو خود بھی یہ اندازہ ہو گیا کہ اس ملک میں کون کتنے پانی میں ہے۔؟

کہا جاتا ہے کہ ان دنوں کچھ عرصہ تک مارشل لاء حکام اس تجویز پر بھی غور کرتے رہے کہ بھٹو سے کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ یا تو بھٹو نے ایسے کسی سمجھوتہ سے انکار کیا یا پھر مارشل لاء حکام اس تجویز پر عمل کی جرأت نہ کر سکے، جو کچھ بھی ہوا ہو، بہر حال فوجی آمریت اور بھٹو میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

کام اور کام

انہی دنوں میں فوجی حکمرانوں نے تین جرنیلوں پر مشتمل ایک کمیٹی یا سیل قائم کیا لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ جبکہ میجر جنرل راؤ فرمان علی اور احسان الحق اس کے رکن تھے۔ اس کا نام تو "الیکشن سیل" رکھا گیا لیکن اس کا کام بھٹو کے خلاف ایسا مواد جمع کرنا تھا۔ جس سے عوام میں بھٹو کا امیج مجروح ہو اور بھٹو کی شخصیت کے سحر کو توڑا جا سکے۔ یہ سیل مسلسل کوشش کے باوجود کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکا اس تحقیقات کے دوران میں مسعود محمود نے انوکھا رد یہ

اختیار کیا اور کسی بھی "جرم" کا اعتراف کرنے کی بجائے تحقیقاتی ٹیم کے ہر سوال کو کسی دوسری سمت اچھال دیا مثال کے طور پر ان سے پوچھا گیا کہ حیات محمد شیر پاؤ کو کس نے قتل کیا؟ مسعود محمود نے جواب دیا "میاں بشیر اس وقت کے صوبہ سرحد کے انسپکٹر جنرل پولیس) سے دریافت کر لیجئے" پھر یہ دریافت کیا گیا۔

"خان عبدالولی خان پر قاتلانہ حملہ کس نے کروایا۔؟

"اسے بھی میاں بشیر خوب جانتے ہیں" مسعود محمود نے کہا۔

ان سے سوال کیا گیا کہ بلوچستان کے رہنما عبدالصمد اچک زئی کو کس نے قتل کروایا؟

مسعود محمود نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"سعید خان سے پوچھو"

یوں مسعود محمود نے ہر سوال کو ٹرخا دیا، یا پھر اسے کسی ذمہ دار فرد کی طرف لوٹا دیا۔ بہر حال تحقیقاتی ٹیم اس سے نہ تو کوئی اعتراف کرا سکی اور نہ ہی کسی سوال کے جواب میں کسی مخصوص ملزم کا نام حاصل کر سکی۔

اس سیل نے ایک سابق وفاقی سیکرٹری داخلہ (ایم اے کے چوہدری) کو تین بار طلب کیا اور اِدھر اُدھر کی بے معنی باتیں کی جاتی رہیں۔ چوہدری صاحب ان بے مصرف طلبیوں اور ملاقاتوں کا کوئی مطلب سمجھ نہ پائے تیسری پیشی پر ایک جرنیل نے چپکے سے ان سے کہا۔

"ہمیں بھٹو صاحب کے خلاف کچھ بتاؤ"

تب ان کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ انہیں کس مقصد کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ چوہدری صاحب کو تین سال تک وزیرِ اعظم بھٹو کے قریب رہ کر کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن ان تین برسوں میں بھٹو نے انہیں نہ تو کوئی غلط کام کرنے کو کہا اور نہ کوئی جھوٹا مقدمہ بنانے کی ہدایت کی اور نہ ہی کسی زیرِ تفتیش مقدمہ کو کوئی دوسرا خاص رخ دینے کا اشارہ کیا۔ چوہدری صاحب کو جب ایف آئی اے کا ڈائریکٹر جنرل تعینات کیا گیا تھا۔ تو دو اہم انکوائریاں ان کے سپرد کی گئی تھیں۔ ایک انکوائری ایئر مارشل اصغر خان کے خلاف تھی اور دوسری خورشید حسن میر کے خلاف ——

اُن دنوں وزیرِ اعظم بھٹو، قومی اسمبلی میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ میں ان دونوں کی انکوائری کراؤں گا۔ اور سپریم کورٹ بقایا کارروائی کرے گی۔ چنانچہ چوہدری صاحب نے پوری ذمہ داری سے ہر پہلو کی تفتیش کی مگر ان دونوں لیڈروں کے خلاف کوئی خاص انکشاف سامنے نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے دونوں کے بارے میں اپنی دیانتدارانہ انکوائری کی رپورٹ تیار کی یہ رپورٹ وزیرِ اعظم تک جانے سے پہلے ایک سکیورٹی آفیسر جو ایک تجربہ کار پولیس افسر تھا کے پاس گئی۔ رپورٹ پڑھ کر اس نے چوہدری صاحب کو سمجھایا کہ یہ رپورٹ وزیرِ اعظم کو پسند نہیں آئے گی کیونکہ انہوں نے تو قومی اسمبلی میں ان دونوں کے خلاف بیان دے رکھا ہے جب کہ آپ ان دونوں کو بے گناہ ثابت کر رہے ہیں۔ اب اسمبلی میں بھٹو صاحب یہ کیسے تسلیم کریں گے کہ دونوں تو بیگناہ

ہیں اور مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔

چوہدری صاحب نے اس مشورہ پر سیکرٹری افسر سے کہا کہ یہ رپورٹ بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے اور سچ پر مبنی ہے سیکرٹری افسر نے اشارتاً کہا کہ اس میں کوئی تو ایسی بات ڈالو۔ جس سے کم از کم تم خود وزیراعظم کی ناراضگی سے بچ سکو۔

چوہدری صاحب نے جواب دیا "میں کسی سیاسی مقصد کے لیے کوئی غلط رپورٹ دینے کو تیار نہیں" اس جواب سے سیکرٹری افسر کو مایوسی ہوئی اس نے کہا "پھر تو آپ کا اللہ ہی حافظ ہے!"

ایک دوسرے ماتحت افسر نے کہا "بہتر ہے کہ اب اپنا بستر بھی باندھ رکھو"

چوہدری صاحب مسکرائے اور کہا کہ بستر تو پہلے ہی بندھا ہے۔

بہرحال رپورٹ جوں کی توں، ان دونوں رہنماؤں کے حق میں رہی اور بھٹو صاحب کے پاس گئی۔ دو ہفتے بعد بھٹو صاحب نے چوہدری کو بلایا ڈرے سہمے وہ پیش ہوئے، بھٹو کے جلال سے چھوٹے بڑے سبھی افسران واقف اور خائف تھے۔ سیکرٹریوں کو بھری محفل میں ڈانٹ دینا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ چوہدری صاحب کو دیکھ کر بھٹو نے کہا۔

"میں تمہارے کام کا بغور جائزہ لیتا رہا ہوں اور خوش ہوں کہ تم محتاط طریق سے کام کرتے ہو اور محنت سے جی نہیں چراتے، تمہیں صرف یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ ایسی دیانتدارانہ سروس میں تمہیں میری مکمل حمایت حاصل رہے گی۔

چوہدری صاحب یہ الفاظ سن کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔ سوچا کہ شاید یہ تمہید ہے اور حاصل غزل مقطع اس کے بعد وارد ہوگا لیکن یہی حرفِ آخر تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام پر آ گئے۔

یہی ایک قصہ تھا جو چوہدری صاحب نے "الیکشن سیل" کے جرنیلوں کو بھی سنایا ظاہر ہے کہ اس میں نہ تو کوئی لطیفہ تھا اور نہ تعاون کی کوئی توقع ــــ چنانچہ "الیکشن سیل" نے ان کا انٹرویو ختم کر دیا۔

بھٹو ــ فوج کے لیے ناقابلِ برداشت تھا

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں مبینہ دھاندلیوں کی تحقیقات کے لیے چار افراد پر مشتمل ایک عدد انکوائری کمیٹی بھی مقرر کی۔ اس کے ارکان میں بریگیڈیئر میر عبدالنعیم کا اسمِ گرامی سرِفہرست آتا ہے جن کے بارے میں راؤ عبدالرشید نے سپریم کورٹ میں اپنے حلفیہ بیان میں کہا تھا کہ بریگیڈیئر صاحب نے راؤ عبدالرشید سے کہا۔

"کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ فوج، بھٹو کا دوبارہ برسرِاقتدار آنا برداشت کر لے گی؟"

راؤ صاحب نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی تھی شاید یہ خاموشی مصلحت کا تقاضا تھی یا پھر خوف کا نتیجہ ــ تاہم راؤ رشید کو خاموش دیکھ کر بریگیڈیئر نعیم نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ "ظاہر ہے کہ بھٹو کا دوبارہ برسرِاقتدار آنا برداشت نہیں کیا جا سکتا"ــــ

اس کے بعد راؤ صاحب رخصت ہونے لگے تو بریگیڈیئر نعیم نے انہیں "مشفقانہ مشورہ" دیا "مہربانی سے فوج کے ساتھ تعاون کیجئے"۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کی انکوائری کرنے والی کمیٹی کے سربراہ بریگیڈیئر نعیم تھے جبکہ اس کے تین دوسرے ارکان میں پولیس فاؤنڈیشن کے سیکرٹری مسٹر عبدالعزیز خان، الیکشن کمیٹی کے آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی مسٹر این ہمایوں خان اور لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم راجہ تھے ــــ

اس کمیٹی نے بڑی تیزی سے اپنا سارا کام سمیٹا جس پر مارشل لاء حکام نے مختصر عرصہ میں "یہ کارنامہ" انجام دینے پر کمیٹی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

بظاہر تو اس انکوائری کمیٹی کے تقرر اور اس کی رپورٹ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے انتخابات میں مبینہ دھاندلیوں کی چھان بین بھٹو کا تختہ الٹنے کے بعد شروع کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحقیقات کا آغاز، انتخابات کے مکمل ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا، ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اس کا علم ہو گیا تھا کہ بری فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے فوجی حکام کی ایسی ٹیمیں ہر صوبہ میں مقرر کی ہیں جو انتخابات میں دھاندلیوں کی تحقیقات کر رہی ہیں۔ ایک صوبے کے وزیرِ اعلیٰ نے بھٹو کو صاف لفظوں میں فوجی کمیٹیوں کی اس تحقیقات سے آگاہ کیا اور بعض دوسرے ذرائع سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔ مثال کے طور پر وفاقی سیکرٹریٹ کے ایک ایڈیشنل سیکرٹری نے بھٹو کو مطلع کیا کہ ایک صحافی مسٹر آئی ایچ برنی کی خدمات فوجی حکام نے اس غرض سے حاصل کی ہیں کہ وہ انتخابی دھاندلیوں کا جائزہ لے کر رپورٹ دیں۔ برنی صاحب کسی زمانہ میں ہفت روزہ "آؤٹ لک" کے ایڈیٹر تھے۔

قومی اسمبلی کے بعض ارکان نے بھی بھٹو سے شکایت کی کہ فوجی حکام ان سے انتخابات کے بارے میں ہر نوع کے سوالات دریافت کر رہے ہیں اُن کے انداز و اطوار ایسے ہیں جیسے وہ کسی انکوائری پر مامور ہیں۔

ان اطلاعات و شکایات پر بھٹو نے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں، جس میں وفاقی وزراء کے ساتھ چیف آف آرمی سٹاف اور کور کمانڈرز بھی شامل تھے، یہ سوال اٹھایا کہ یہ کس قسم کی انکوائریاں ہیں جو فوجی حکام کر رہے ہیں، اس پر کور کمانڈرز تو خاموش رہے (جب کہ ان کی بے چینی قابلِ دید تھی) تاہم چیف آف آرمی سٹاف نے چند مبہم سے الفاظ اتنے مدہم لہجہ میں کہے کہ ان کے الفاظ بھٹو کو سنائی بھی نہ دے سکے۔ تاہم انہوں نے بھٹو کو ملنے والی اطلاعات کی تردید کی تھی۔

پندرھواں باب

"بادشاہ گر"

چشتی کے انٹرویو سے "مون ڈائجسٹ"

پر عتاب

"کوئی کور کمانڈر، مارشل لاء کو طول دینے کے

حق میں نہیں تھا" — چشتی

"ادیب صاحب! کوئی غلط بات لکھی تو

میں مقدمہ نہیں کروں گا لاہور پہنچ کر گولی مار

دوں گا" — جنرل چشتی

ادیب جاودانی لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی کے ساتھ محو گفتگو

جنرل فیض علی چشتی کا نام قومی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ۵ جولائی ۷۷ء کو انہیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کے دستِ راست کی حیثیت حاصل تھی۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عوامی و سیاسی حلقوں کی طرف سے انہیں "مردِ آہن" کا خطاب دیا گیا۔ وہ ۸۰-۱۹۷۷ء میں الیکشن سیل کے چیئرمین اور وفاقی وزیر بھی رہے وہ پاکستان آرمی کے ملٹری سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ پاک آرمی کی وہ ہائی کمان جس نے ۵ جولائی ۷۷ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس ہائی کمان میں افواجِ پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ضیاء الحق اور پاکستان آرمی کے پانچوں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال، لیفٹیننٹ جنرل سوار خاں، لیفٹیننٹ جنرل جہاں زیب ارباب، لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی اور لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن شامل تھے۔ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء نافذ کرانے والی ملٹری ہائی کمان میں شامل ان پانچوں کور کمانڈرز میں سے جنرل فیض علی چشتی اور جنرل غلام حسن سب سے پہلے ریٹائر ہوئے۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال اور لیفٹیننٹ جنرل سوار خاں نے جنرل کے عہدہ پر ترقی پائی اور ریٹائر ہونے سے پہلے علی الترتیب چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی اور وائس چیف آف آرمی سٹاف تعینات رہے۔

چونکہ مارشل لاء کے نفاذ میں جنرل فیض علی چشتی نے سب سے اہم اور مرکزی کردار ادا کیا تھا اس لئے ان کی ریٹائرمنٹ پر عوامی اور سیاسی حلقوں میں بہت سی قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ عام خیال یہی ہے کہ چونکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے جنرل فیض علی چشتی کے بعض اختلافات ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے جنرل چشتی کو

اقتدار میں شمولیت کا مزید موقع نہیں دیا اور لیفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے ان کی مدت ملازمت پوری ہوتے ہی انہیں ریٹائرمنٹ دے دی۔ جنرل چشتی کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ انہوں نے وزیراعظم بھٹو کے آخری لمحات میں ان پر جیل میں تشدد کیا تھا۔ بہرحال جنرل فیض علی چشتی پاکستان کے قومی حلقوں کی ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۴ء میں راولپنڈی کے پشاور روڈ پر واقع جنرل چشتی کے خوبصورت بنگلہ میں ہوئی تھی۔ یہ ملاقات، اقتدار سے جنرل چشتی کی علیحدگی کے کچھ عرصہ بعد ہوئی۔ اُن دنوں جنرل چشتی کے مزاج میں خاصی درشتگی اور چڑچڑا پن آیا تھا۔ گفتگو میں تلخی شاید اقتدار سے یک لخت (اور غیر متوقع) علیحدگی کا شاخسانہ تھی۔ چنانچہ وہ اکثر میرے کسی سوال کے جواب میں خود اپنا سوال داغ دیتے اور پوچھتے تھے کہ آپ بتائیں ــــ وغیرہ۔ یہ انداز گفتگو برہمی کا آئینہ دار تھا۔ گفتگو کے دوران ایک موقع تو ایسا بھی آیا جب میں کوئی سخت سوال کر بیٹھا تھا تو جنرل چشتی نے کہا

"مسٹر، مجھے کیا سمجھتے ہو ــ میں "بادشاہ گر" تھا"۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ ضیاء کو ملک کا حکمران میں نے بنایا، اس پر میں نے سوال کر ڈالا

"کیا آپ نے خود اپنے بادشاہ بننے کے بارے میں بھی سوچا تھا؟"

اس سوال پر جنرل چشتی کا پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے بڑے تلخ لہجہ میں کہا: "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کس پس منظر میں یہ سوال کر رہے ہیں"

میں نے عرض کیا "ٹھیک ہے کہ آپ پس منظر سمجھتے ہیں لیکن یہ بتایئے کہ کیا آپ جنرل ضیاء کی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے تھے؟"

جنرل چشتی غصہ میں آگئے انہوں نے اپنے قمیص کی آستین چڑھالیں اور مجھے گھورتے ہوئے کہا ــــ "دیکھئے، میرے بارے میں کوئی غلط سلط بات نہ لکھیں ورنہ یاد رکھیں کہ میں ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے کے لئے کسی عدالت میں نہیں جاؤں گا بلکہ لاہور پہنچ کر تمہیں گولی مار دوں گا"۔

گولی مار دینے کے اس انتباہ سے مجھے کیا مرعوب ہونا تھا اس لئے کہ اُن دنوں بات بات پر "گولی مار دینے" کی دھمکیاں خاصی عام ہو گئی تھیں۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) مظفرالدین جو مشرقی پاکستان کے گورنر بھی رہے تھے ان کے بارے میں میجر جنرل (ریٹائرڈ) راؤ فرمان علی کا ایک انٹرویو ایک مقامی ماہنامہ میں شائع ہوا تھا۔ میں اس انٹرویو کے حوالہ سے میجر جنرل مظفر کا انٹرویو کرنے گیا تو انہوں نے بھی مجھے گولی مار دینے کی ایسی ہی "دلچسپ دھمکی" دی تھی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر میجر جنرل مظفرالدین نے تو یہ "نسخہ" کیمیا" بھی بیان کیا تھا کہ "میرا بس چلے تو تمام اخبار نویس

کو ایک قطار میں کھڑا کر کے سب کو گولی مار دوں "

اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ فوجیوں کو تربیت ہی گولی مارنے کی دی جاتی ہے اس لیے اگر وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی بات بات میں "گولی مارنے" کو آمادہ و تیار نظر آتے ہیں تو اس میں ان کا قطعاً کوئی قصور نہیں ہوتا بلکہ یہ سالہا سال کی تربیت کا نفسیاتی نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں جنرل چشتی کی "دھمکی" سے مرعوب نہیں ہوا اس کے عین برعکس میں نے انٹرویو کے دوران ہی یہ محسوس کر لیا کہ جنرل چشتی اچھے آدمی ہیں کھردری گفتگو ضرور کرتے ہیں لیکن ہر کھرا آدمی اسی طرح کھردری گفتگو کرتا ہے۔ چرب زبانی اور شیریں بیانی منافقوں کا شیوہ ہے اور یہ منافقت جنرل چشتی کے قریب سے بھی نہیں گذری۔ وہ ایک سچے، کھرے انسان کی حیثیت میں دل کی بات زبان پر لاتے اور اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس پہلی کھری اور کھردری بات چیت کے بعد جنرل چشتی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ یوں سمجھئے کہ اس انٹرویو نے دوستانہ مراسم کی بنیاد رکھ دی اور "گولی" کے بجائے "دوستی" نمودار ہو گئی اس کے بعد ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء تک میں نے جنرل صاحب کے آٹھ دس انٹرویو کئے۔

اکتوبر ۱۹۸۴ء میں جب ان کا پہلا انٹرویو شائع ہوا تو انہوں نے مجھے لاہور سے فون کیا اور کہا "ادیب صاحب، آپ کے ساتھ چائے پینا چاہتا ہوں لہٰذا آپ چھاؤنی تشریف لے آئیں، یہاں میں اپنے ایک عزیز کے پاس ٹھہرا ہوں "

شام کو جب میں ان کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچا تو انہوں نے دریافت کیا کہ آئندہ میں کس کا انٹرویو کر رہا ہوں ۔؟

میں نے جواب دیا کہ خان عبدالولی خان کا انٹرویو آ رہا ہے۔

اس پر جنرل چشتی نے کہا

"اب آپ سے دوستی ہے تو آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ خان عبدالولی خان کے انٹرویو پر آپ کیخلاف کارروائی ہوگی لیکن کارروائی کی اصل وجہ میرا انٹرویو ہوگا۔ خان عبدالولی خان کے انٹرویو کو صرف بہانہ بنایا جائے گا۔ یہ پنجابی زبان کے اس محاورہ کے مطابق ہوگا کہ " روندی یاراں نوں نے ناں بھراواں دا " (بھائیوں کے نام لے کر یاروں کو روتی ہے) آپ نے جس بے باکانہ انداز سے میرا انٹرویو شائع کر دیا ہے وہ انہیں بہت چبھا ہے لیکن وہ اس پر کارروائی کر کے اپنا بھانڈا نہیں پھوڑنا چاہتے۔ تاہم آپ کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا، مجھے آپ سے ہمدردی ہے "

اور پھر جنرل چشتی کے یہ الفاظ حرف بحرف سچ ثابت ہوئے۔ خان عبدالولی خان کا انٹرویو شائع ہوا تو جنرل ضیاء الحق صاحب نے میرے خلاف مارشل لاء کے تحت کارروائی کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن (جنہوں نے مجھے "مون ڈائجسٹ" کا ڈیکلریشن بھی دیا تھا) نے مجھے اسلام آباد بُلا کر کہا "ادیب صاحب

GOVERNMENT OF THE PUNJAB
HOME DEPARTMENT.

To.

Mr. Adeeb Jawadani,
Publisher of Urdu monthly 'Moon Digest',
Office Moon Digest,
63-C, Sharah-e-Quaid-e-Azam,
Lahore.

Memo: No:3-1/H-SPL-III/85.

Dated Lahore, the March, 1985.

SUBJECT: SHOW CAUSE NOTICE.

The Urdu monthly 'Moon Digest', Lahore, which is published by you contains material in its issue for the month of November, 1984, an interview of Khan Abdul Wali Khan, the contents whereof -

i) tend to condemn the creation of Pakistan within the meaning of clause (h);

ii) bring into hatred and contempt the Government and to excite disaffection towards it within the meaning of clause (i);

iii) are likely to prejudice maintenance of friendly relations between Government of Pakistan and the Government of USA within the meaning of clause (l); and

iv) under-mine the morale or prejudice the discipline of the Armed forces of Pakistan within the meaning of clause (m)

of Section 24(1) of the West Pakistan Press and Publications Ordinance, 1963.

You are hereby required to appear before the Home Secretary Punjab in his office within seven days of the receipt of this notice to show cause why you should not be required to deposit a sum of Rs:10,000/- as security with the District Magistrate, Lahore, under Section 27 of the aforesaid Ordinance.

(ABDUR REHMAN KHAN)
Under Secretary Spl-III,
for Home Secretary Punjab.

یہ آپ نے کیا کیا؛ جنرل چشتی کا انٹرویو چھاپ دیا جبکہ انہوں نے سبھی جرنیلوں کے خلاف باتیں کی ہیں۔ آپ کو یہ انٹرویو سوچ سمجھ کر شائع کرنا چاہیئے تھا۔ آپ نے تو جنرل ضیاالحق کے سامنے میری بھی جواب طلبی کرا دی ہے کہ یہ کون بے باک صحافی ادیب جادوانی پیدا ہوا ہے جو اس طرز کے انٹرویو شائع کر رہا ہے۔"

بعدازاں، چشتی صاحب کو تو مارشل لا حکام کیا کہتے اور کیسے کہتے؛ مگر اپنی شامت آگئی ابتلا و آزمائش کا سخت دور شروع ہو گیا۔ مارشل لا کے تحت کارروائی کا آغاز ہوا۔ ہم نے اسے بھی بھگتا، پھر ول خان کے انٹرویو والا شمارہ بھی ضبط کر لیا گیا، اسے بھی برداشت کیا۔ اس کے ساتھ ہی بھاری زرِضمانت بھی طلب کر لیا گیا اور یہی نہیں بلکہ کاغذ کے کوٹے اور سرکاری اشتہارات کو بھی "مون ڈائجسٹ" کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا — خیر "مون ڈائجسٹ" سخت جان تھا جو اس بھٹی سے گذر کر کندن بن گیا تاہم مجھے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ جنرل ضیاء اور جنرل چشتی کے اختلافات کتنے شدید تھے کہ ان کے باعث خود مجھے بھی عتاب کی چکی میں پسنا پڑا۔ بہرحال اس انٹرویو کے بعد بھی جنرل چشتی کے انٹرویوز مسلسل شائع ہوتے رہے جو آج بھی ہمارے ریکارڈ پر موجود ہیں اور اس امر کا ثبوت ہیں کہ ہمارا سر کسی آمر کے رُوبرو جُھک نہیں سکتا اور ہمارا قلم کسی مارشل لا کارروائی کے خوف سے رُک نہیں سکتا۔

جنرل چشتی سے اِن ملاقاتوں میں یہ امر بھی واضح ہوا کہ قومی اتحاد کے کئی لیڈر درپردہ جنرل ضیاالحق سے ساز باز کئے ہوئے تھے۔ وہ جنرل ضیاالحق سے ملتے رہتے تھے اور اگر ان سیاسی لیڈروں کی آشیرباد، جنرل ضیاء کو حاصل نہ ہوتی تو مارشل لا نہ لگتا۔ مزید برآں جنرل ضیاالحق نے یہ تجزیہ کر لیا تھا کہ ملک میں کوئی ایسا سیاسی رہنما موجود نہیں جس کی قیادت میں قوم چل سکے۔ ملک گیر لیڈر ایک تھا — ذوالفقار علی بھٹو — اسے ختم کرنے کے بعد جنرل ضیاالحق کا راستہ صاف تھا اس لئے اسے اپنا دورِ حکومت طویل کرتے چلے جانے میں سہولت رہی۔

فوج کے پانچوں کور کمانڈروں نے جنرل ضیاالحق کی حمایت اس بنیاد پر کی تھی کہ وہ ۹۰ دن کے اندر الیکشن کرا دیں گے اور فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی لیکن کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ جنرل ضیاء اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے مارشل لا کو کھینچتے چلے جائیں گے اور جمہوریت کے روپ میں بھی اپنی "فوجی آمریت" کو برقرار رکھیں گے۔ آخر میں ایک وقت وہ بھی آیا جب مارشل لا نافذ کرنے والے کور کمانڈروں میں سے ایک بھی فوج میں نہ رہا، سب کے سب ریٹائر ہو گئے لیکن جنرل ضیاالحق بدستور براجمان رہے اور اپنی مدتِ ملازمت میں خود ہی "توسیع" فرماتے رہے۔

جنرل چشتی سے اپنے انٹرویو میں ایک مرحلہ پر میں نے ان سے یہ سوال بھی دریافت کیا تھا:

"آپ پر عام طور سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ نے جیل میں بھٹو پر تشدد کیا جبکہ آپ نے اس کے

جواب میں یہ کہا ہے کہ بھٹو سے اگر مجھے کوئی دشمنی ہوتی تو میں ۴ جولائی کی اس رات بھٹو کو ختم کر سکتا تھا جبکہ انہیں شوٹ کر دینے کا "اوپن چیک" میرے پاس موجود تھا۔ آپ فوج کے کلیدی عہدہ پر اور ضیاء اقتدار میں شریک رہے ہیں۔ جنرل ضیاء کا قرب بھی آپ کو حاصل رہا ہے، بھٹو کی پھانسی کے دنوں میں بھی آپ ضیاء کابینہ میں شامل تھے، اِن حالات میں آپ کو علم تو ہوگا کہ کیا واقعی جیل میں بھٹو پر تشدد ہوا تھا؟

جنرل چشتی: میں اس مسئلہ کو اور طرح سمجھتا ہوں، آپ نے بھٹو کو پھانسی دینے والے جیل حکام سے بھی انٹرویو کئے ہیں، آپ بتائیں کہ کیا آپ کے نزدیک جیل میں بھٹو پر تشدد ہوا تھا؟

ادیب جاودانی: جی ہاں ۔ میں نے پھانسی دینے والے کئی حکام سے انٹرویوز کئے ہیں۔ تشدد کے اس سوال پر وہ اکثر پریشان ہو جاتے یا چُپ سادھ لیتے تھے۔ چند ایک نے اپنے حوالہ کے بغیر اور دبے دبے لفظوں میں اس تشدد کا اظہار بھی کیا مگر وہ اپنے نام سے یہ بات کہنے سے گریزاں ہے۔ البتہ ان کی باتوں سے اندازہ ضرور ہو گیا کہ جیل میں بھٹو پر تشدد ہوا تھا۔

اب آپ نے مجھ سے میرا جواب تو حاصل کر لیا ہے، آپ بتائیے کہ آپ کے نزدیک تشدد ہوا تھا؟

جنرل چشتی: بھٹو پر تشدد کی بات مجھ تک بھی پہنچی تھی، جب کہیں سے دھواں اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہاں چنگاری ضرور ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس افواہ میں کچھ حقیقت ضرور ہے۔

ادیب جاودانی: اس میں اگر کچھ حقیقت ہے تو آپ کے نزدیک بھٹو کو کس نے تشدد کا نشانہ بنایا؟

جنرل چشتی: اس کے لئے آپ سنٹرل جیل راولپنڈی کے حکام خصوصاً اُس وقت کے راولپنڈی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے رجوع کر سکتے ہیں وہ جیل کے نگران تھے انہیں علم ہوگا کہ کیا کچھ ہوا۔ میں تو اُن دنوں گلگت میں تھا اور جنرل ضیاء کی کوشش کے باوجود میں راولپنڈی نہیں آیا تھا۔ بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کی اطلاع مجھے طیارہ میں ملی تھی پنڈی جیل کے حکام اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس سوال پر روشنی ڈال تو سکتے ہیں مگر میرے خیال میں وہ کچھ بتائیں گے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تشدد کی بات چھُپ نہیں سکتی۔ وقت آنے پر یہ بات منظرِ عام پر آ کر رہے گی کہ جیل میں کن فوجی افسروں نے بھٹو پر تشدد کیا تھا۔

ادیب جاودانی: کیا اُس وقت کے راولپنڈی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیئر راحت لطیف تھے؟

جنرل چشتی: جی ہاں وہی تھے۔

سولہواں باب

جنرل چشتی کا انٹرویو

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق
کو اقتدار کی لت لگ چکی تھی
"قومی مفاد پس منظر میں چلا گیا،
اقتدار کی ہوس غالب آ گئی"
"ضیاء نے جمہوریت کو اپاہج کر کے
اپنے گھر میں ڈال لیا"

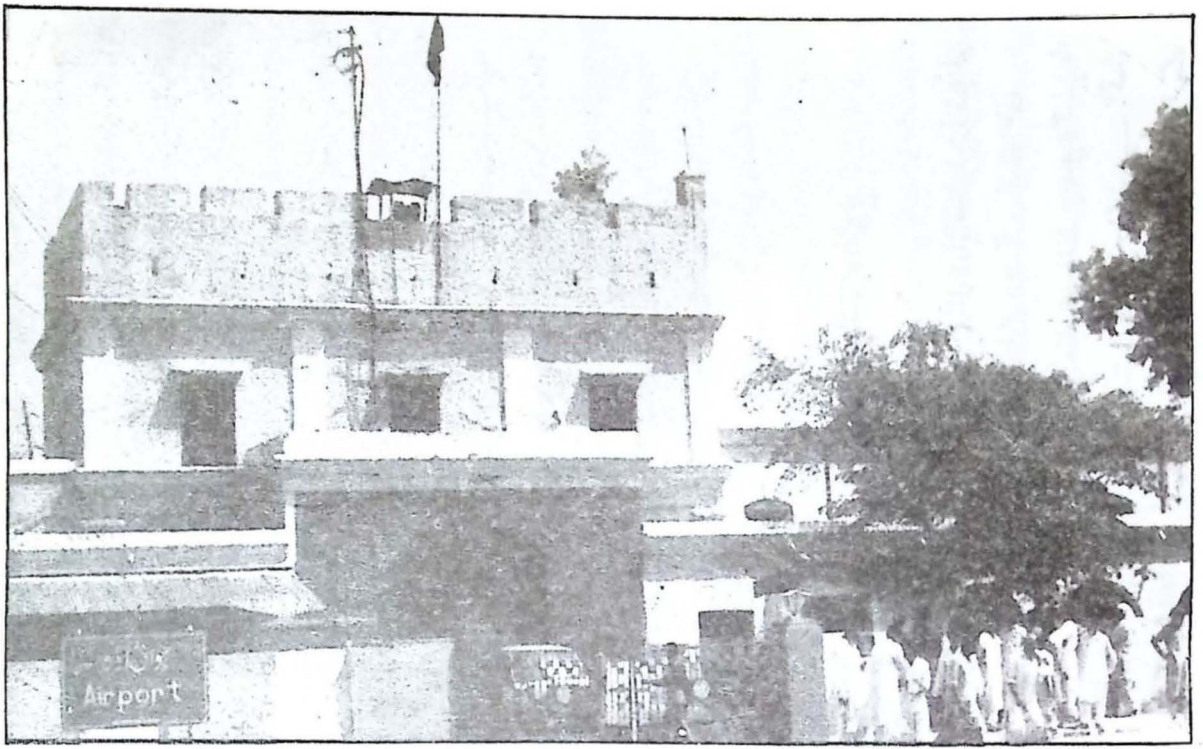

راولپنڈی کی پرانی سنٹرل جیل جہاں بھٹو کو پھانسی دی گئی

○

سوال : جنرل صاحب ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو اس ملک میں جو فوجی انقلاب آیا تھا اس میں آپ نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ جس وقت یہ مارشل لاء نافذ ہوا۔ اس وقت مارشل لاء کی ہائی کمان نے قوم کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ فوج کے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں اور وہ ۹۰ دن کے اندر انتخابات کروا دینے کے بعد واپس بیرکوں میں چلی جائے گی۔ ازاں بعد پہلے احتساب اور بعد میں انتخاب کا پروگرام بنا اور اس طرح انتخابات دوسری مرتبہ بھی ملتوی ہو گئے۔ فروری ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہو جانے کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا گیا تھا، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء نافذ کرتے وقت ملٹری ہائی کمان کے پیش نظر جو مقاصد تھے آپ کے خیال میں کیا وہ پورے ہو گئے۔ اگر یہ مقاصد پورے نہیں ہوئے تو آپ فوج کے ساڑھے آٹھ سالہ اقتدار اور پارلیمنٹ کے اشتراک سے جنرل محمد ضیاء الحق کے سیاسی کردار پر کیا تبصرہ کریں گے ؟

جواب : ادیب صاحب، آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے، کالعدم پاکستان پیپلز پارٹی اس وقت ملک میں برسر اقتدار تھی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں اس پارٹی کے امیدوار بھاری اکثریت سے جیت کر قومی اسمبلی میں پہنچے۔ حزب اختلاف میں شامل نو سیاسی جماعتوں کے انتخابی اتحاد پاکستان قومی اتحاد نے برسر اقتدار پارٹی پر انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کا الزام لگایا اور اس کے خلاف احتجاجی تحریک شروع ہو گئی۔ ملک میں خانہ جنگی کے آثار رونما ہونے لگے اس وقت کے وزیر اعظم کو بعض شہروں میں مارشل لاء تک

نافذ کرنا پڑا۔ افواج پاکستان کا اس ملک کے عوام کی نظروں میں بے پناہ احترام ہے مگر جب اس وقت کے وزیراعظم نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے فوج کو استعمال کرنے کی کوشش کی تو اس سے فوج کا وقار مجروح ہونے کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ اس وقت کی ملٹری ہائی کمان نے ملک کے وزیراعظم اور اس کی کابینہ کو واشگاف الفاظ میں یہ وارننگ دی کہ وہ پاکستان قومی اتحاد سے کوئی سمجھوتہ کریں، ملک سے خانہ جنگی کو ختم کرائیں اور اگر ملک میں امن و امان کی بحالی کے لئے پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے قومی اسمبلی کے انتخابات دوبارہ کرائے جانے کا مطالبہ واپس نہیں لیا جاتا تو انتخابات دوبارہ کرانے کا اعلان کیا جائے۔ فریقین کو مذاکرات کی میز تک بھی لایا گیا مگر جب سمجھوتے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو فوج نے اپنا وقار مجروح کرانے کی بجائے ملک کے اقتدار کو عارضی طور پر اپنے ہاتھوں میں لے کر خود اپنی نگرانی میں انتخابات کرانے کا فیصلہ کر لیا۔

جب مارشل لاء کے نفاذ کا فیصلہ کیا گیا تو یہ طے پایا تھا کہ فوج تین ماہ کے اندر اندر انتخابات کرانے کے بعد واپس بیرکوں میں چلی جائے گی۔ انتخابات کو ابتداء میں مؤخر کیا گیا اور ازاں بعد انہیں نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

میرا خیال ہے کہ اب یہ بات کوئی راز نہیں رہی کہ انتخابات کو بار بار کیوں مؤخر کیا گیا تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو اقتدار کی لت لگ چکی تھی وہ جیسے تیسے انتخابات کو ٹالتے رہے۔ فوج کی جس ہائی کمان نے مارشل لاء نافذ کیا تھا اس میں سے سب سے پہلے ملک کے اندر جمہوریت کی بحالی کے لئے میں نے آواز اٹھائی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے ریٹائر ہونا پڑا جبکہ کچھ لوگ دس گیارہ سال سے ایک ہی منصب پر قائم رہے۔ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء جن مقاصد کے لئے لگا تھا اگر فی الواقع ان مقاصد کو پورا کرنا مقصود تھا تو میں کہتا ہوں کہ یہ کام کئی سال پہلے بھی ہو سکتا تھا ۱۹۷۷ء میں فوج کے ٹیک اوور کا مقصد قوم کو خانہ جنگی سے بچانا اور مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں برسر اقتدار پارٹی کی طرف سے دھاندلی کے باعث قوم جمہوریت کی جس راہ سے بھٹکی تھی اسے جمہوریت کی اس راہ پر گامزن کرنا تھا مگر بعد میں قومی معاہدہ پس منظر میں چلا گیا اور اقتدار پر قابض رہنے کی ہوس غالب آگئی۔ آپ نے اپنے سوال میں کہا ہے کہ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا گیا تھا میں آپ کی غلط فہمی دور کر دوں کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء نہیں اٹھایا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی رُو سے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ وزیراعظم کے ماتحت رکھا گیا تھا بعد میں پارلیمنٹ اور وزیراعظم چیف آف آرمی سٹاف کے ماتحت ہو گئے تھے کیا ہم نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو اسی جمہوریت کے نفاذ کے لئے مارشل لاء نافذ کیا تھا۔ ہم نے ایک ٹانگ سے لنگڑی جمہوریت کا علاج کرنے کے لئے قوم کو "آپریشن فیئر پلے" دیا تھا مگر بڑے سرجن نے لنگڑی لولی جمہوریت کی دوسری ٹانگ کاٹ کر اسے اپاہج کر کے اپنے گھر میں ڈال لیا تھا، ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء جن مقاصد کے لئے لگا تھا، میں کہتا ہوں ان مقاصد کو پورا کرنے سے عملاً صرف نظر

برتا گیا۔ یہ مقاصد ہرگز پورے نہیں ہوئے تھے۔

سوال : تو کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ کی نظر میں مارشل لاء کا ساڑھے آٹھ سالہ دور جائز اور قانونی تھا اور مارشل لاء لگاتے وقت آپ کے ذہن میں بحالیٔ جمہوریت کا نقشہ یہی تھا ؟

جواب : میں نے کب کہا ہے ؟ مارشل لاء کا نفاذ کرتے وقت ملٹری ہائی کمان کے پیش نظر جو مقاصد تھے سپریم کورٹ نے ان مقاصد کی تکمیل تک اسے جائز اور قانونی قرار دیا تھا اور انتخابات کرانے کے لئے کم سے کم مدت کا حکم صادر کیا تھا نہ کہ فوج کو "لامحدود مدت" تک کے لئے اقتدار سنبھالے رکھنے کا جواز مہیا کیا تھا۔ مارشل لاء نافذ کر کے ہم نے ۱۹۷۲ء کے آئین کے مطابق انتخابات کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وقت ملٹری ہائی کمان کے ذہن میں یہ بات ہرگز نہیں تھی کہ پارلیمنٹ اور وزیر اعظم چیف آف آرمی سٹاف کے انڈر کام کریں گے۔

مارشل لاء نافذ کرنے والی فوج کی ہائی کمان میں خود میں بھی شامل تھا۔ ہائی کمان نے مارشل لاء محض دوبارہ انتخابات کرانے کے لئے نافذ کیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا اندازہ تو خود ہائی کمان کو بھی نہیں تھا کہ مارشل لاء اتنا طویل ہو جائے گا۔ کم از کم میرا اس بات پر قطعی یقین تھا کہ ہم ضرورت سے ایک دن بھی زیادہ فوج کو بیرکوں سے باہر نہیں رکھیں گے۔ مارشل لاء کے نفاذ کا فیصلہ فوج کی جس ہائی کمان نے کیا تھا اس میں جنرل محمد ضیاء الحق کے علاوہ فوج کے اس وقت کے پانچوں کمانڈر شامل تھے بعد میں وہ سب اپنے عہدوں سے ریٹائر ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی حکومت میں شامل نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مارشل لاء کے نفاذ کے وقت اس کو کئی سال تک طول دینے کا کوئی خیال اگر کسی ذہن میں تھا تو صرف جنرل محمد ضیاء الحق کے ذہن میں تھا۔ میرا خیال ہے کہ بھٹو نے بھی ہماری طرح یہی سوچا ہو گا کہ فوج ٹیک اوور کرے گی، انتخابات کرائے گی اور واپس بیرکوں میں چلی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ بھٹو نے مارشل لاء کو آنے دیا۔

سوال : جنرل صاحب ! ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ آپ جنرل ضیاء الحق کے دست راست تھے مگر مارشل لاء نافذ کرنے والے جرنیلوں میں سے جو دو جرنیل سب سے پہلے اقتدار سے الگ ہوئے ان میں سے ایک آپ تھے، آپ کو دوسروں سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا، کیا ایسا جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ آپ کے بعض اختلافات کے باعث تو نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ "کاؤنٹر کوپ" کے ذریعہ خود اقتدار میں آنا چاہتے تھے ؟

جواب : یہ غلط ہے، میں جتنا عرصہ فوج میں رہا ملک اور قوم کا وفادار رہا۔ میرا یہ عقیدہ تھا کہ اگر کوئی جرنیل جنرل ضیاء الحق کو اس طرح اقتدار سے ہٹاتا ہے تو اس صورت میں وہ جرنیل غداری کا مرتکب ہو گا۔ جو لوگ یہ کہتے تھے کہ میں جنرل ضیاء الحق سے اقتدار چھین کر خود اقتدار میں آنا چاہتا تھا۔ وہ نہ میرے بہی خواہ تھے نہ جنرل ضیاء الحق کے اور نہ ہی اس ملک اور قوم کے، اس قسم کی باتیں ہوئی تھیں بعض لوگوں نے جنرل محمد ضیاء الحق کو جنرل نجیب اور

مجھے کرنل جمال ناصر بنا کر پیش کیا۔ بی بی سی سے اس قسم کی خبر بھی نشر ہوگئی تھی۔ ان دنوں میں فوج میں تھا اور میں نے خود جنرل محمد ضیاء الحق کے دفتر میں جا کر ان باتوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تھی اور ان سے سوال کیا تھا کہ وہ ان باتوں سے کیا تاثر لے رہے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے مجھے کہا کہ انہیں میری وفاداری پر کوئی شبہ نہیں۔ میری ریٹائرمنٹ آئی تو میں نے مدت ملازمت میں توسیع نہیں مانگی۔ انہوں نے از خود مجھے ایکسٹینشن یا ترقی نہیں دی اور جب میری ریٹائرمنٹ کا وقت آیا مجھے ریٹائر کر دیا، مجھے جنرل محمد ضیاء الحق سے کبھی بھی کوئی ذاتی پرخاش نہیں رہی۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ میں نے لگی لپٹی سے کبھی کام نہیں لیا۔ خوشامد کبھی نہیں کی اور ان کے ساتھی کی حیثیت سے انہیں یہ ضرور جتلاتا رہا کہ فوج کو اپنا کام نپٹا کر بیرکوں میں جانا چاہیئے۔ فوج نے ملک کا نظم و نسق عارضی طور پر اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ انتخابات کرانے کے بعد فوج کو اقتدار ملک کے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دینا تھا اور میں جب تک فوج میں رہا جنرل ضیاء الحق کو یہی مشورہ دیتا رہا کہ وہ انتخابات کرائیں۔ انہوں نے میرے اس اصول اختلاف سے متعلق کوئی دوسری رائے قائم کر لی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کم از کم میرا دل صاف ہے، میرا ضمیر مطمئن ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں جنرل ضیاء الحق کو اقتدار سے الگ کرنا چاہتا تھا وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر مجھے یہی کام کرنا تھا تو یہ کام تو میں اس رات بھی کر سکتا تھا جب میں نے "آپریشن فیئر پلے" کی نگرانی کی تھی۔ میں فوج کے "ٹیک اوور" کرنے کی کارروائی کا انچارج تھا مجھے جنرل ضیاء الحق کی طرف سے ۴ جولائی کی شام دس بجے "ٹیک اوور" کرنے کا حکم مل گیا تھا۔ بھٹو کا گھر مجھ سے تین منٹ کے فاصلہ پر تھا اور یہ صرف میں تھا جو پرائم منسٹر ہاؤس میں داخل ہو سکتا تھا۔ کیا میں ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل محمد ضیاء الحق کے حکم سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا اگر میں بھٹو کو جنرل محمد ضیاء الحق اور ہائی کمان کے فیصلے سے آگاہ کر کے یہ پیشکش کرتا کہ میں ان کے اقتدار کو بچا سکتا ہوں تو کیا خیال ہے وہ مجھے جنرل محمد ضیاء الحق کی جگہ افواج پاکستان کا کمانڈر انچیف مقرر کر کے جنرل ضیاء الحق کی معزولی اور انہیں حراست میں لے لینے کا حکم نہ دیتا؟ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔؟ میں نے ایسا اس لئے نہیں کیا کہ اس وقت مارشل لاء ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد میں لگایا جا رہا تھا۔ میں فوج کی ہائی کمان کے فیصلے سے انحراف کر کے بھٹو سے اپنی ترقی کا سودا کرتا تو یہ فوج سے وفاداری نہ ہوتی، ایسا ملک اور قوم سے غداری کے مترادف ہوتا۔ مجھے اپنے خون پر ناز ہے۔ میرا خمیر لائلپور کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ میں نے وہی کیا ہے جو قوم کے مفاد میں تھا۔ میں نے ایک پتا بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیا اور "ٹیک اوور" کی کارروائی مکمل کر لی۔ جن لوگوں نے مجھے جنرل نجیب کے ساتھ کرنل ناصر کا خطاب دے کر اور اس قسم کا پراپیگنڈہ کر کے کہ میں جنرل ضیاء الحق کو ہٹا کر خود ان کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ میرے اور جنرل ضیاء الحق کے درمیان وفاداری اور اعتماد کی دیوار گرانے کی کوشش کی، ان کو میرا جواب یہ ہے کہ یہ کام ۴ جولائی کی شب اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ میں بھٹو سے سودا کر کے افواج پاکستان

کا کمانڈر انچیف مقرر کئے جانے کا تقرر نامہ لیتا اور یہ خبر گیارہ بجے کے ریڈیو بلیٹن میں نشر ہو جاتی اور اس کے بعد ۵ جولائی کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے بھٹو کو راستے سے ہٹا دیتا۔ میرے لئے یہ صرف چند منٹ کا کام تھا مگر خدا گواہ ہے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔

سوال: بعض حلقوں کا خیال ہے کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد چوہدری فضل الٰہی مرحوم نے ملک کا صدر رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ فوج کے "ٹیک اوور" کے بعد ملک کے سربراہ نہیں رہنا چاہتے مگر آپ نے انہیں اپنے خسر کے ساتھ دوستی کے باعث سربراہ مملکت رہنے پر مجبور کر دیا تھا؟

جواب: اصل بات اس طرح نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ چوہدری فضل الٰہی سربراہ مملکت رہنے کو تیار نہیں تھے انہوں نے جنرل ضیاء الحق سے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ وہ چونکہ پیپلز پارٹی کے آدمی ہیں، پارٹی کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد ان کا عہدۂ صدارت سے چمٹے رہنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔ میں نے ان کے پاس جا کر انہیں صرف اتنی بات سمجھائی تھی کہ وہ پیپلز پارٹی کے رکن ضرور رہے ہوں گے مگر اب وہ ملک کے آئینی سربراہ ہیں، ملک کا آئین منسوخ نہیں کیا گیا محض وقتی طور پر معطل ہوا ہے۔ ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات ہو جائیں گے اور آئین کے مطابق پارلیمنٹ معرض وجود میں آجائے گی اور اس طرح آئین دوبارہ لاگو ہو جائے گا لہٰذا انہیں سربراہ مملکت کے طور پر اپنے منصب پر فائز رہ کر وفاق کی علامت کے طور پر مارشل لاء کے اس عبوری دور میں ملک کے آئینی تسلسل میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے۔ یہ ان کی کمال شفقت تھی کہ انہوں نے میری بات کو توجہ سے سنا اور اسے مان لیا۔

سوال: چشتی صاحب! اگر چوہدری فضل الٰہی صدر رہتے تو کیا اس صورت میں وہ بھٹو کی رحم کی اپیل منظور نہ کر لیتے؟

جواب: وہ ایسا کر سکتے تھے تو پھر انہوں نے صدارت کا منصب کیوں چھوڑا؟

سوال: انہوں نے اپنی مرضی سے تو نہیں چھوڑا؟

جواب: تو پھر ان میں یہ بات کہنے کا حوصلہ ہونا چاہیئے تھا کہ انہوں نے یہ منصب کیوں چھوڑا تھا۔ ایک زمانے میں بھٹو خود ان کا بھی لیڈر رہا تھا۔ بھٹو نے انہیں ملک کا صدر بنا کر عزت دی تھی، انہیں بھٹو کے لئے سٹینڈ لینا چاہیئے تھا۔

سوال: آپ جانتے ہیں وہ کمزور آدمی تھے؟

جواب: اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں۔

سوال: آپ نے بھٹو کے عزت دینے کی بات کی ہے، عزت تو بھٹو نے جنرل ضیاء کو بھی دی تھی؟

جواب: ہاں! یہ بھی ہے۔

سوال: جنرل ٹکا خاں کہتے ہیں کہ میں نے بھٹو کو چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر جنرل ضیاءالحق کا نام تجویز نہیں کیا تھا؟

جواب: جنرل ٹکا خاں نے ٹھیک کہا ہوگا مگر سوال یہ نہیں ہے کہ جنرل ضیاءالحق کا نام چیف آف آرمی سٹاف کے لئے کس طرف سے آیا تھا۔ جنرل ٹکا کے بعد وہ چیف آف آرمی سٹاف بنے اور انہیں خود بھٹو نے چیف آف دی آرمی سٹاف بنایا تھا۔

سوال: اگر جولائی ۱۹۷۷ء میں کور کمانڈروں میں سے کوئی دوسرا شخص چیف آف دی آرمی سٹاف ہوتا تو کیا اس صورت میں بھی ۵ جولائی کا مارشل لاء قوم کا مقدر ہوتا؟

جواب: مارشل لاء ہمیشہ دو طرح سے لگتا ہے' یا تو ارادتاً لگایا جاتا ہے یا نتیجتاً لگتا ہے۔ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء نتیجتاً آ رہا تھا تو ضرور آ کر ہی رہتا۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس صورت میں مارشل لاء کو غیر معمول طوالت دی جاتی۔

سوال: بعض حلقوں کا خیال ہے کہ کور کمانڈروں میں سے ملک میں مارشل لاء لگانے کے سب سے زیادہ آپ آرزو مند تھے' آپ جنرل محمد ضیاءالحق کے سب سے زیادہ قریب آدمی تھے اور انہی حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ دراصل آپ جنرل نجیب کے ساتھ جنرل ناصر کا کردار ادا کر کے خود برسراقتدار آنا چاہتے تھے؟

جواب: آپ کے سوال کے پہلے حصے کا جواب یہ ہے کہ ملک میں مارشل لاء لگنے سے میری ذاتی دلچسپی کوئی نہیں تھی۔ فوج کی ہائی کمان نے ملک کے اس وقت کے حالات کے پیش نظر ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد میں ایک فیصلہ کیا تھا اور میں اس فیصلے میں دوسروں کے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب میں پہلے ہی آپ کے ایک سوال کے جواب میں دے چکا ہوں، میرا جواب پھر وہی ہے کہ میرے اپنے کوئی عزائم نہیں تھے اس قسم کی افواہیں جس مقصد کے لئے پھیلائی گئی تھیں اس وقت میں اسے نہیں سمجھ سکا تھا۔ البتہ بعد کے حالات میں میرے خلاف جس جس طرح سے افواہیں پھیلائی گئیں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مجھے جس طرح پیش کیا گیا اور جس طریقے سے مجھے ترقی کی بجائے ریٹائرمنٹ دی گئی اس کے بعد یہ تاریخ اب میرے لئے کوئی لاینحل سوال نہیں رہ گئی کہ مجھ کو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے انقلاب میں جنرل نجیب کیا تھے جنرل ناصر کہنے والے کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا۔ اگر کچھ لوگ یہ الزام لگاتے ہیں تو وہ یہ بھی یقیناً جانتے ہوں گے کہ نجیب اور ناصر میں سے صرف ایک ہی آگے آتا ہے۔ جس کے عزائم ہوں وہ آگے آ جاتا ہے، عزائم کس کے تھے۔ کیا تھے؟ یہ بات اب اظہر من الشمس ہے۔

سوال: راؤ رشید نے اپنے انٹرویوز پر مشتمل کتاب میں لکھا ہے کہ راولپنڈی میں فوج اکٹھی کرنے کا مشورہ وزیراعظم بھٹو کو جنرل ضیاءالحق اور اس کے کور کمانڈروں نے دیا تھا؟

جواب : راؤ رشید نے تو اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ سنٹرل گورنمنٹ کی ایک میٹنگ ہو رہی تھی اور جنرل چشتی زبردستی وہاں میٹنگ میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ کیا آپ کی عقل اسے مانتی ہے کہ سنٹرل گورنمنٹ کی میٹنگ ہو رہی ہو اور ایک ماتحت افسر خود بخود جاکر وہاں بیٹھ جائے۔ میں اس میٹنگ میں گیا ضرور تھا مگر خود بخود وہاں بات ممکن نہیں تھی۔ میں فوج کا ملازم تھا، کسی کے حکم کے بغیر وہاں کیسے جا سکتا تھا۔ فوج کے افسر اتنے بے لگام تو نہیں ہوتے کہ منہ اٹھا کر کسی بھی جگہ جا پہنچیں۔ کوئی نظم و ضبط اور کوئی قاعدہ قانون ہوتا ہے۔

سوال : گویا آپ کو وہاں جانے کا آرڈر تھا ؟

جواب : وہ تو تھا مگر میرا خیال ہے آپ اس سلسلہ میں تھوڑی سی معلومات حاصل کر لیں۔ سنٹرل گورنمنٹ کا سیکرٹری اور فوج کا لیفٹیننٹ جنرل دونوں ۲۲ گریڈ کے ملازم ہوتے ہیں مگر ORDER OF PRECEDENT میں سیکرٹری کا مقام لیفٹیننٹ جنرل سے پہلے آتا ہے، اب بات کو یوں سمجھ لیجئے کہ سنٹرل گورنمنٹ کی میٹنگ ہو رہی ہے اور سیکرٹری میٹنگ کی صدارت کر رہا ہے۔ کیا اس میٹنگ میں کوئی لیفٹیننٹ جنرل خود بخود جا کر بیٹھ سکتا ہے۔ یہ احمقانہ بات ہے۔ میں لیفٹیننٹ جنرل تھا، ہیڈ کوارٹر میں کور کمانڈر تھا۔ مجھے میرا چیف آف دی آرمی سٹاف حکم دیتا ہے کہ وزارت داخلہ میں سنٹرل گورنمنٹ کے نمائندوں کی لا اینڈ آرڈر کے ایشو پر میٹنگ ہو رہی ہے، آپ ان کو جا کر اٹنڈ کریں اگر ان کو سول کی مدد کے لئے فوج کی ضرورت ہو تو آپ انہیں بتائیں کہ ہم اس کے لئے تیار ہیں۔

سوال : چشتی صاحب ! اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ مارشل لاء محض اس لئے لگا کہ سابق وزیراعظم بھٹو نے جنرل ضیاالحق اور بعض دوسرے جرنیلوں کو فوج سے الگ کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اقدام اٹھاتے آپ لوگوں نے آپریشن فیئر پلے کی کارروائی مکمل کر لی ؟

جواب : اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔

سوال : جنرل ضیاالحق نے ایک ڈائجسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ بھٹو نے انہیں تین مرتبہ اقتدار سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی ؟

جواب : ممکن ہے جنرل ضیاالحق کو اس سلسلہ میں کوئی اطلاع ہو۔ انہوں نے ہم سے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کیا (طویل خاموشی کے بعد) بھٹو وزیراعظم کی حیثیت سے بااختیار تھے انہیں کوشش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی وہ جب چاہتے جنرل ضیاالحق کی جگہ نیا آدمی لا سکتے تھے۔

سوال : اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ فوج نے آپریشن فیئر پلے کی باقاعدہ ریہرسل کی تھی ؟

جواب : اگر ریہرسل کہتے تو آپ کا کیا خیال ہے بھٹو کو اس کی اطلاع نہ مل جاتی اور کیا وہ آپریشن فیئر پلے

کی نوبت آنے دیتا۔

سوال: بعض حلقوں کا خیال ہے کہ پی این اے کے لانگ مارچ کو ناکام بنانے کے بہانے راولپنڈی اسلام آباد میں فوج جمع کر لی گئی تھی۔ دراصل اس وقت فوج کی ہائی کمان مارشل لاء نافذ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی؟

جواب: لانگ مارچ کو روکنے کے لئے راولپنڈی میں فوج کس کے حکم پر جمع کی گئی تھی؟

سوال: ظاہر ہے جنرل ضیاالحق کے اشارے پر؟

جواب: نہیں! بلکہ یہ سب وزیراعظم کی ہدایت پر ہوا تھا۔ فوج کو راولپنڈی میں جمع کرنے کا بہانہ خود وزیراعظم نے کیا تھا۔ وزیراعظم نے آرمی چیف کو ہدایت کی تھی کہ لانگ مارچ کے دوران کوئی ایک آدمی بھی پرائم منسٹر ہاؤس تک نہیں پہنچنا چاہیئے۔

سوال: غلام مصطفےٰ جتوئی صاحب کہتے ہیں کہ بھٹو کو مارشل لاء کے نفاذ کا گمان تک نہیں تھا۔ انہیں آخری وقت تک جنرل ضیاالحق پر مکمل اعتماد رہا تھا؟

جواب: بھٹو کو جنرل ضیاالحق پر یقیناً آخری وقت تک مکمل اعتماد رہا۔ اگر انہیں ضیاالحق پر مکمل اعتماد نہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنے عہدے پر قائم نہ رہ سکتے۔

سوال: چشتی صاحب! بھٹو صاحب ایک زیرک انسان تھے اور ایک باخبر وزیراعظم بھی مگر حیرت ہے کہ آپریشن فیئر پلے سے پہلے انہیں آخری لمحے تک جنرل ضیاالحق پر اس قدر اعتماد رہا۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ ملٹری ہائی کمان نے انٹر سروسز انٹیلی جنس اور ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جنس بیورو دونوں کو اعتماد میں لے لیا ہو؟

جواب: میں اس سلسلہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

سوال: آپ اس وقت ملٹری ہائی کمان میں شامل تھے اور یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ اس وقت کے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی کو بعد میں جنرل ضیاالحق کی حکومت میں بہت زیادہ عمل دخل بھی رہا۔ وہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کے ایک طویل عرصہ تک گورنر رہے؟

جواب: اگر آپ ایسا سوچتے ہیں کہ مارشل لاء کے نفاذ کے وقت آئی ایس آئی کے اس وقت کے سربراہ نے بھٹو کو مارشل لاء کے نفاذ سے بے خبر رکھا تو میں اس سلسلہ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے آئی ایس آئی کو کوئی اشارہ مل گیا ہو اور اس نے بھٹو کو اطلاع دینے کے بجائے چیف آف دی آرمی سٹاف کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اُن کی پیشگی خوشنودی حاصل کر لی ہو۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ لیفٹیننٹ جنرل جیلانی نے کبھی کسی جنگ میں کمان نہیں کی تھی، پھر ان کی لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک ترقی کا راز کیا تھا؟

جواب : انہیں اس عہدے تک کس نے پہنچایا، یہ گناہ بھی تو بھٹو سے سرزد ہوا تھا۔ ایک ایسا شخص جو کسی عہدے کے لئے نااہل سمجھا جاتا ہے، اسے جب سفارش پر ترقی دی جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے۔ یقیناً جیلانی کو ترقی دینے میں بھٹو کا مقصد پوشیدہ ہوگا؟

سوال : شاید وہ جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر انہیں جنرل ضیاالحق کی جگہ چیف آف آرمی سٹاف بنانا چاہتے ہوں؟

جواب : (قہقہہ لگاتے ہوئے) خیر بھٹو اتنے بھی مردم ناشناس نہیں تھے۔ پھر کہا — سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب ایک بااختیار شخص کسی نااہل آدمی کو بڑے رتبے تک لے جاتا ہے تو کیا یہ منصبی بددیانتی نہیں۔ جیلانی کا شمار آرمی کے گڈ کیٹیگریز میں کبھی نہیں کیا گیا مگر اس کے باوجود وہ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچے تو میرے بھائی، انہیں اس منصب پر پہنچانے والوں کو اپنے اس شاہکار کے ہاتھوں کچھ سزا تو ملنی ہی چاہیئے تھی ناں — ! بھٹو صاحب بادشاہ آدمی تھے وہ کسی کو کچھ بھی بنا سکتے تھے مگر شاید انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ جرنیل ایک دن میں نہیں بنائے جاتے آپ کسی بھی شخص کو حلف دے کر ایک دن میں، ایک گھنٹے میں وزیر تو بنا سکتے ہیں، کسی شخص کو لیفٹیننٹ جنرل یا جنرل کی وردی پہنا کر جرنیل نہیں بنا سکتے۔

سوال : چشتی صاحب! آپ کہتے ہیں کہ میں نے جنرل ضیاالحق کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی نہ دیں۔ یہ بات آپ نے کب کہی تھی، کس حیثیت میں کہی تھی؟

جواب : جب بھٹو کی پھانسی کا معاملہ کیبنٹ کے بعد فوجی کونسل میں زیر بحث آیا تو ظاہر ہے کہ میں فوجی کونسل کا رکن تھا۔ میں نے وہاں یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ مارشل لاء حکومت کو بھٹو کی پھانسی کے فیصلے پر رحم کی اپیل آئندہ سول حکومت پر چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس پر عملدرآمد نہیں کرنا چاہیئے۔ فوجی کونسل کے بعد یہ معاملہ کور کمانڈرز کی میٹنگ میں بھی زیر بحث آیا تھا۔ کور کمانڈرز نے اس سلسلہ میں باہم صلاح مشورہ کیا تھا۔ میرا مؤقف وہاں بھی یہی تھا کہ مارشل لاء حکام کو بھٹو کی پھانسی پر عملدرآمد نہیں کروانا چاہیئے۔

سوال : راولپنڈی جیل میں بھٹو پر تشدد کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس سلسلہ میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب : میرا خیال ہے اس طرح کی گری ہوئی حرکت کوئی نہیں کر سکتا، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگر ہوئی تھی تو یقین کیجئے مجھے اس کا آج تک تو علم نہیں ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ جو شخص آپریشن فیئر پلے کا انچارج تھا آپریشن فیئر پلے کا کامیاب انجام دینے کے بعد اس پر کم از کم بھٹو پر تشدد کا یا بھٹو کے قتل کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔

سوال : بعض حلقوں کی طرف سے یہ الزام براہ راست آپ پر لگایا جاتا ہے؟

جواب : سوال یہ ہے کہ مجھ پر اس قسم کا الزام کس حلقے کی طرف سے لگایا جاتا ہے، کیا یہ الزام پیپلز پارٹی

والے لگاتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر کون ہو سکتا ہے؟ کیا حکومتی حلقے ___؟ شاید حکومت میں کچھ لوگ یہ چاہتے ہوں، آپ سوال کریں گے کہ پیپلز پارٹی والے مجھ پر یہ الزام کیوں نہیں لگا سکتے، میرا جواب یہ ہے کہ پیپلز پارٹی ایک بہت بڑی سیاسی جماعت ہے۔ اس پارٹی کے یقیناً اپنے ذرائع ابلاغ ہوں گے انہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ بھٹو پر تشدد ہوا تھا یا نہیں۔ اگر ہوا تھا تو تشدد کرنے والے ہاتھ کس کے تھے وہ میرے ہاتھ یقیناً نہیں تھے میں بھٹو کی پھانسی سے چند روز پہلے گلگت میں تھا اور بھٹو کی پھانسی کی اطلاع مجھے واپسی کے سفر میں طیارے کے اندر میرے پائلٹ نے سنائی تھی۔

سوال: چشتی صاحب، کیا آپ کو پیپلز پارٹی کی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کا تو اندیشہ نہیں ہے؟

جواب: میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا تو میرے خلاف انتقامی کارروائی کیوں کریں گے۔ اگر میں پیپلز پارٹی کی ہٹ لسٹ پر ہوتا تو کیا خیال ہے وہ آج سے چھ سال پہلے ہی مجھے اس کی بھینٹ نہ چڑھا چکے ہوتے کیا پیپلز پارٹی کی قیادت کو آپ اتنا ہی نااہل سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے ٹارگٹ کا بھی علم نہ ہو۔ بھٹو کے ساتھ کس نے کیا کیا وہ یہ سب جانتے ہیں اور وہ یہ بھی یقیناً جانتے ہوں گے کہ ملٹری کونسل میں بھٹو کی پھانسی پر میں نے اپنے ساتھیوں سے اختلاف کیا تھا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ۱۹۷۷ء میں مارشل لا کا نفاذ میرے خیال میں ناگزیر ہو چکا تھا اور ملٹری ہائی کمان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں تھا۔ میں چیف آف آرمی سٹاف کے حکم کا پابند تھا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

سوال: چشتی صاحب! بعض حلقوں کی طرف سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ جیل میں پھانسی کی رات سابق وزیراعظم پر تشدد ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ افواہ پھیلی تھی کہ تشدد آپ نے کیا، آپ نے اس قسم کے واقعہ میں ملوث ہونے کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ تشدد کی یہ افواہ کیوں پھیلی، کس نے پھیلائی اور اس کا کیا مقصد تھا؟

جواب: بھٹو کو ۳ اور ۴ اپریل کی درمیانی رات پھانسی دی گئی۔ پھانسی دینے سے ایک رات پہلے تک پوری قوم بھٹو کی پھانسی کے متعلق بے یقینی کا شکار تھی۔ ۴ اپریل کو پھانسی دی گئی اور اس روز بھٹو پر تشدد کی افواہ پھیلا دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ یہ افواہ کس نے پھیلائی۔ کیا پیپلز پارٹی نے؟ مگر نہیں ___ پیپلز پارٹی کو ۴ اپریل سے پہلے یہ علم نہیں تھا کہ بھٹو کو ۴ اپریل کو پھانسی دی جائے گی۔ اگر انہیں بھٹو کی پھانسی کا یقین نہیں تھا تو انہیں یہ افواہ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر یہ خبر کس نے پھیلائی کہ جنرل چشتی نے پنڈی جیل میں جا کر بھٹو پر تشدد کیا۔ بھٹو کو ۴ اپریل کو پھانسی ہوگی یا نہیں اس بات کا کس کو یقین ہو سکتا تھا۔ عوامی حلقوں کو تو

ہرگز یہ معلوم نہ تھا، صرف حکومت کے کرتا دھرتا افراد کو ہی اس کا علم ہو سکتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ بھٹو پر تشدد کی خبر باقاعدہ پلاننگ کے تحت پھیلائی گئی تھی اور پلاننگ کا وقت صرف انہی لوگوں کے پاس تھا جن کو معلوم تھا کہ بھٹو کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ یہ خبر پھیلانے کے کیا مقاصد تھے۔ اگر ایک خبر پھیلائی جاتی ہے تو یقیناً اس کے کچھ مقاصد بھی ہوں گے اور وہ مقاصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتے تھے کہ یہ خبر پھیلانے والا جنرل چشتی کو بدنام کرانا چاہتا تھا۔ کچھ لوگ یقیناً یہ چاہتے تھے کہ بھٹو کی پھانسی کے بعد عوام کے غم و غصے کا رُخ جنرل چشتی کی طرف موڑ دیا جائے۔ شاید وہ لوگ کسی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے تھے۔ اگر جنرل چشتی اس روز راولپنڈی میں ہوتا تو اس کا مکو تو ٹھپ دیا گیا تھا ناں۔ اور یہ جنرل چشتی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بھٹو کی پھانسی سے چند روز پہلے سے راولپنڈی سے باہر تھا۔ جس روز بھٹو کو پھانسی دی گئی میں گلگت میں تھا۔ مجھے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی طرف سے بار بار یہ پیغام ملا کہ میں گلگت سے فی الفور راولپنڈی واپس پہنچوں۔ مجھے ہر حال میں ۲ اپریل کو راولپنڈی واپس پہنچنے کیلئے کہا گیا پھر ۳ اپریل کو پہنچنے کیلئے کہا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ لوگ بھٹو کی پھانسی کے وقت میری راولپنڈی میں موجودگی چاہتے تھے اور یہ وہی لوگ ہو سکتے تھے جنہوں نے جیل میں بھٹو پر تشدد کی خبر پھیلانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں نے گلگت سے ۲ اپریل کو راولپنڈی پہنچنے سے معذوری ظاہر کی تھی البتہ ۲ اپریل کو پہنچ جانے کی یقین دہانی کرائی تھی مگر میں عمداً ۳ اپریل کو بھی راولپنڈی واپس نہیں آیا۔ میں ۴ اپریل کو راولپنڈی واپس آیا تھا اور بھٹو کی پھانسی کی خبر مجھے ہوائی جہاز میں، جہاز کے پائلٹ نے دی تھی آج جب میں اپنے خلاف بنائی گئی اس سازش کی کڑیاں ملاتا ہوں تو مجھے بعض حلقوں کی طرف سے کی گئی اس تیاری آرائی میں صداقت دکھائی دیتی ہے کہ بھٹو کو پھانسی دینے کا پروگرام پہلے ۲ اپریل کی رات کا تھا مگر بوجوہ اُسے ۲۴ گھنٹے کے لئے مؤخر کر دیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں ۲ اپریل کو راولپنڈی میں ہوتا تو بھٹو کو ۲ اپریل کی رات پھانسی دے دی جاتی۔ انہوں نے راولپنڈی میں میری موجودگی ثابت کرنے کے لیے بھٹو کی پھانسی کو ۲۴ گھنٹے مؤخر کر دیا مگر میں پھر بھی راولپنڈی نہیں پہنچا تو مجبوراً انہیں اپنے پروگرام کے مطابق بھٹو کو پھانسی دینا پڑی اور اس طرح میرے خلاف بنی ہوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکی۔

سوال: اگر آپ کے خلاف پھیلائی گئی یہ افواہ کسی سازش کا حصہ تھی تو سوال یہ ہے کہ آپ نے اس سازش کو کس طرح ناکام بنایا؟

جواب: مجھے میرے اللہ نے بچایا۔ میرے خدا نے میرے بعض کرمفرماؤں کے ذریعہ مجھ تک اس سازش کا خاکہ پہنچا دیا تھا اور میرے ان ہی خواہوں نے مجھے یہ تلقین کر دی تھی کہ بھٹو کی پھانسی کے دن مجھے راولپنڈی میں نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے گلگت میں اپنے پروگرام کو بلا جواز طویل کر کے خود کو راولپنڈی سے باہر رکھا اور

اپنے خلاف بنائی گئی سازش کو ناکام بنا دیا۔

سوال: کیا آپ نے آج تک بیگم نصرت بھٹو یا محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملاقات کی کوئی کوشش نہیں کی؟

جواب: نہیں، میں نے آج تک ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ ملاقات کی کوشش نہیں کی۔

سوال: اگر آپ کو پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی جائے تو؟

جواب: اگر مجھے مستقبل میں سیاست کرنی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ سیاست کرنے کے لئے کسی بھی پلیٹ فارم کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ نئی سیاسی پارٹی بھی بنائی جا سکتی ہے جو لوگ سیاست کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں وہ حالات کے مطابق بہتر فیصلے کرنے کے اہل ہوتے ہیں اور ایسے لوگ اپنے سیاسی رویوں میں لچک رکھتے ہیں۔

سوال: کیا آپ موجودہ حالات میں از خود محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے؟

جواب: سیاست میں کیا نہیں ہوتا۔ بھٹو نیپ پر پابندی لگا کر اس کے لیڈروں کو حیدر آباد سازش کیس میں ملوث کرتے ہیں اور کالعدم نیپ کے یہی لیڈر این ڈی پی اور پی این پی کے نئے ناموں سے ایم آر ڈی میں ہراول دستے کا کردار ادا کر کے محترمہ بے نظیر کی سیاست کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں تو ضرورت محسوس ہونے پر میں محترمہ بے نظیر کے قافلۂ جمہوریت کو لبیک کیوں نہیں کہہ سکتا۔ میں نے پی این اے کی تحریک کے دوران اپنی حیثیت میں رہ کر ملٹری ہائی کمان میں سے سب سے زیادہ بھٹو صاحب کو نئے انتخابات میں چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ بات راؤ رشید نے اپنے انٹرویو میں ایک دوسرے انداز میں تسلیم کی ہے۔ مارشل لا کے نفاذ کا فیصلہ کرنے والی ملٹری ہائی کمان میں سے، میں نے سب سے پہلے جنرل ضیاء الحق کو انتخابات میں جانے کے لئے کہا۔ ان پر بھرپور دباؤ ڈالا کہ وہ قوم سے کئے گئے وعدے کے مطابق انتخابات کروائیں اور فوج کو واپس بیرکوں میں جانے دیں۔ اگر آپ بھٹو کے زوال کے اسباب تک پہنچنے کی مخلصانہ کوشش کریں گے تو آپ جان لیں گے کہ بھٹو کے دشمن صرف وہ لوگ تھے جنہوں نے انہیں ری الیکشن میں جانے سے روکا۔ جو لوگ ان کو ری الیکشن میں جانے کا مشورہ دیتے رہے تھے وہ ان کے دوست تھے۔ بھٹو کی پوری کابینہ میں صرف مولانا کوثر نیازی نے بھٹو کو یہ صحیح مشورہ دیا تھا اور جب ایک مرحلے پر بھٹو نے میری رائے معلوم کرنا چاہی تھی تو ان کو یہی جواب میرا بھی تھا۔ اگر قومی مفاد میں مجھے محترمہ بے نظیر سے ملنا پڑا یا انہوں نے کبھی مجھ سے ملاقات کی ضرورت محسوس کی تو کم از کم میری طرف سے اسے انا کا مسئلہ نہیں سمجھا جائے گا۔

سترھواں باب

سلسلہ ہائے دُور دراز

مولوی مشتاق حسین کا قصہ

ولی خان اور عبدالغفار خان کے عزائم

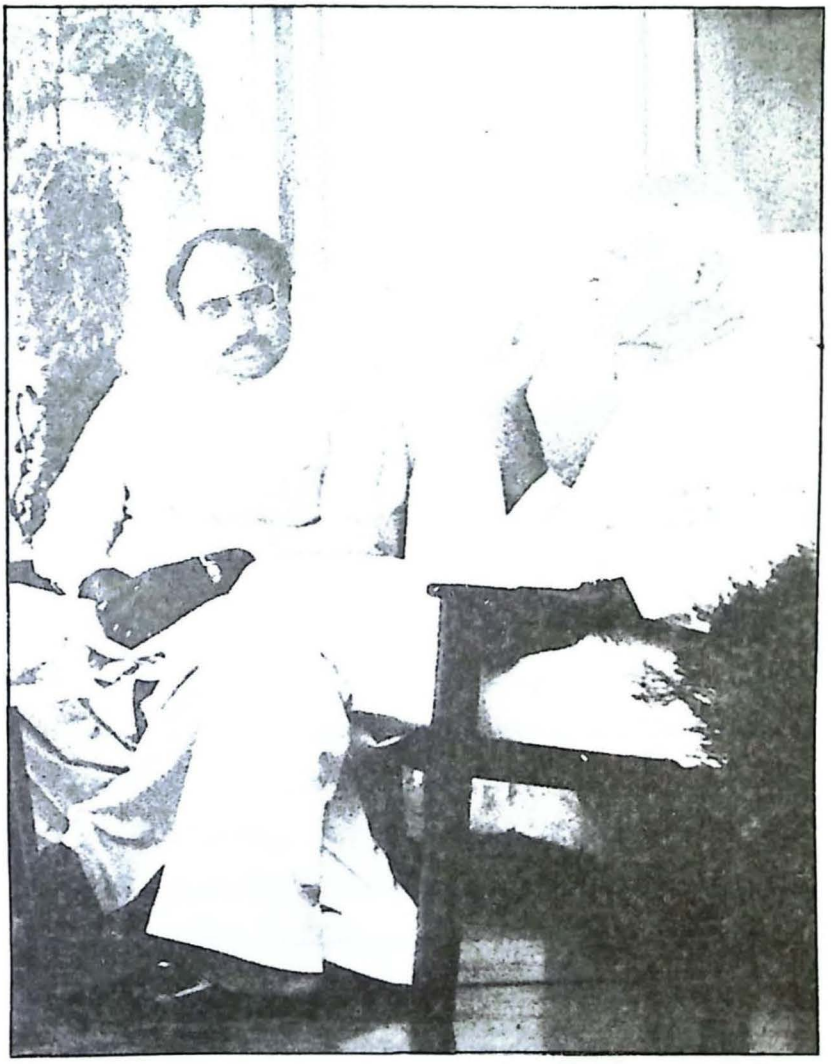

ادیب جاودانی چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کے ساتھ

انتخابی دھاندلیوں کے سلسلے میں فوجی حکومت نے بھٹو کے خلاف جو وائٹ پیپر شائع کیا اس میں جابجا الیکشن کمشن کے سیکرٹری مسٹر اے زیڈ فاروقی کے بیانات یا ان کے اقتباسات دیئے گئے جبکہ کمشن کے سربراہ مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) سجاد احمد جان کا کوئی براہ راست بیان بھی حاصل نہ کیا گیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ الیکشن کمشن کے سیکرٹری مسٹر اے زیڈ فاروقی، مسٹر این اے فاروقی کے بھتیجے ہیں اور مسز این اے فاروقی، وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی بیوی کی بہن ہیں۔

بھٹو کا خیال تھا کہ مسٹر این اے فاروقی نے مسعود محمود کو وعدہ معاف گواہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور وہ اپنی خصوصی رشتہ داری کے باعث مسعود محمود اور مارشل لا حکام کے درمیان "ایجنٹ" کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مسٹر اے زیڈ فاروقی، احمدیوں کے لاہوری گروپ سے تھے، چونکہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار بھٹو حکومت کے تحت قومی اسمبلی نے ستمبر ۱۹۷۴ء میں احمدیوں کو اقلیت قرار دیا تھا اس لئے مسٹر اے زیڈ فاروقی کو بھٹو حکومت کے خلاف مذہبی غم و غصہ بھی تھا جس کا اظہار انہوں نے بھٹو کی انتخابی دھاندلیاں بیان کرکے کیا۔

سوال یہ ہے کہ بھٹو اگر انتخابی دھاندلیوں کے لئے "عیارانہ منصوبے" چلا رہے تھے تو پھر انہیں جسٹس سجاد احمد جان کی ضرورت تھی ان سے کام نکلوانا تھا۔ مزید برآں قومی اتحاد کے عظیم الشان ایجی ٹیشن کے باوجود جسٹس سجاد احمد جان نے اپوزیشن کا ہیرو بننے کی خاطر بھی چیف الیکشن کمشنر کے عہدہ سے استعفیٰ نہیں دیا اس کے برعکس انہوں نے ۲۱ رمارچ ۱۹۷۷ء کو اپنے استعفیٰ کے لئے حزب مخالف کے مطالبات کو "سیاسی بلیک میل" قرار دیا اور کہا کہ سیاسی دباؤ کے تحت ان کا استعفیٰ عدالتی غلط کاری سے تعبیر کیا جائے گا اس لئے وہ مستعفی نہیں ہوں گے۔

بھٹو کو بخوبی علم تھا کہ چیف الیکشن کمشنر کے حزب مخالف کے بعض افراد سے قریبی روابط ہیں۔ گجرات کے ایک سیاستدان کے تو وہ بہت قریب تھے۔ مخالف جماعتوں کو انہوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ اگر حکومت نے انتخابات میں رتی بھر مداخلت کی تو وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ ان تمام حالات کو جانتے ہوئے بھٹو نے چیف الیکشن کمشنر کے عہدہ میں مزید تین سال کی توسیع کی۔ بھٹو کا ارادہ دھاندلی کا ہوتا تو حزب مخالف کے آدمی کو چیف الیکشن کمشنر کے عہدہ پر توسیع نہ ملتی بلکہ لاڑکانہ کے کسی پٹھو کو یہ عہدہ دیا جاتا۔ مگر یہ نہیں ہوا۔ مخالف جماعتوں نے اس توسیع کا خیر مقدم کیا جبکہ بھٹو کے بعض حامیوں نے اس پر نکتہ چینی کی۔ چیف الیکشن کمشنر، بلاشبہ، حزب مخالف کے "ڈارلنگ" تھے اور اگر ان کے عہدہ میں توسیع نہ ہوتی تو احتجاج کا طوفان برپا کر دیا جاتا۔ بہرحال انتخابات میں غنڈہ گردی کے جو مظاہرے ہوئے وہ دوطرفہ تھے۔ ان غنڈوں اور بدمعاشوں سے دونوں فریقوں کو نقصان پہنچا۔ اس کے باوجود یہ "غنڈہ گردی" بقول بھٹو "ڈیموکریٹک انقلاب کے لئے دعوت ہرگز نہ تھی۔ چیف الیکشن کمشنر نے کسی مرحلہ پر بھی بھٹو پر انتخابات میں سرکاری مداخلت، دباؤ یا دھاندلی کا الزام نہیں لگایا، حالانکہ حکومت کی طرف سے بھٹو پر حملہ کرنے والے ہر شخص کو "شاباش" دی جا رہی تھی۔ اسے مختلف مراعات سے نوازا جاتا تھا۔ اس کے باوجود چیف الیکشن کمشنر فوجی حکومت کے دام میں نہیں آئے۔ چنانچہ انکوائری کمیٹی نے بھٹو کی دھاندلیوں کی ۹۰۰ شہادتیں تو قلم بند کیں، مگر چیف الیکشن کمشنر کا ایک بیان نہ لے سکے۔ حالانکہ اصل اور کلیدی اہمیت اسی بیان کو حاصل تھی۔

ایک طرف جہاں بھٹو کے مخالف، لاہور کی احمدی مسٹر اے زیڈ فاروقی کو بھٹو حکومت کا تختہ الٹ جانے کے دوسرے ہی دن ان کے عہدہ پر بحال کر دیا گیا وہیں ایک صدارتی حکم کے ذریعہ جسٹس سجاد احمد جان کو فوری طور پر ان کے عہدہ سے الگ کر دیا گیا۔ فاروقی کی بحالی اور اس کے باس کی برطرفی ۔۔۔؟ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے؟ کیا جسٹس سجاد جان موجودہ ٹولے کے مخالف ہیں؟ یا وہ بھی دھاندلی کرنے والوں کے ساتھی تھے؟؟

اور پھر یہ مسخرہ پن بھی ملاحظہ ہو کہ جسٹس جان کو عہدے سے ہٹانے کے بعد، حکومت نے چیف الیکشن کمشنر اور لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے دو الگ الگ عہدوں کو ایک تو کر دیا اور یہ دونوں عہدے مولوی مشتاق حسین کے سپرد کر دیئے، جنہیں بھٹو اپنا جانی دشمن سمجھتا تھا۔ بھٹو کے خلاف مولوی مشتاق حسین کا تعصب کوئی ڈھکی چھپی

بات نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے جب ۱۹۷۱ء میں اقتدار سنبھالا تھا تو مولوی مشتاق حسین راولپنڈی کے پنجاب ہاؤس میں بھٹو سے ملے تھے ان کی خواہش تھی کہ انہیں لاہور ہائیکورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا جائے۔ اپنی اس خواہش کا بھٹو کے سامنے اظہار انہوں نے بڑے خوبصورت الفاظ میں کیا اور کہا کہ پاکستان کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر اپنے صدر بھٹو کو، عدلیہ پر کنٹرول کے لئے اپنے ایک آدمی کی ضرورت ہوگی۔ اس ضرورت کو مولوی مشتاق حسین پوری کرنے کے خواہاں تھے مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور بھٹو حکومت نے سردار محمد اقبال کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا جس پر مولوی مشتاق حسین غصے جز بز ہوئے اور کئی طریق سے اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی کیا یہ اظہار انہوں نے سرکاری حیثیت میں بھی کیا اور غیر سرکاری طور پر بھی۔ دوسرے موقع پر بھی بھٹو حکومت نے لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس، مسٹر جسٹس اسلم ریاض حسین کو مقرر کیا۔ یہ مولوی مشتاق حسین کے لئے دوسری ناقابل برداشت توہین تھی۔ چنانچہ مقدمہ قتل کے پہلے ہی دن انہوں نے ان واقعات کا حوالہ بھی دے دیا۔ اور یہیں نہیں کہ مولوی مشتاق حسین کو خواہش کے باوجود بھٹو حکومت کے دوران چیف جسٹس کا عہدہ نہ ملا اور دو بار دوسرے افراد اس اہم عہدہ پر انہیں نظر انداز کر کے متعین کئے گئے۔ مزید برآں ۱۹۷۵ء میں وفاقی وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ سے ان کا ایک ناخوشگوار جھگڑا بھی ہوا اور پھر یہ عالم ہو گیا کہ دوسری بار نظر انداز کئے جانے کے بعد انہوں نے اپنے سرکاری فرائض میں بھی کوئی خصوصی دلچسپی لینا چھوڑ دی اور اپنا زیادہ وقت اپنے چیمبر میں گذارنے لگے۔ معمولی حیلے بہانوں سے وہ یورپ چلے جاتے تھے۔ ۵ جولائی کو بھٹو حکومت کا تختہ الٹے جانے کے موقع پر بھی مولوی مشتاق حسین یورپ میں تھے۔ فوجی انقلاب کے کلیدی رہنماؤں نے انہیں فوراً پاکستان بلایا۔ اور انہوں نے یہ "دعوت" بڑے جوش و خروش سے قبول کر لی۔ انہیں فوری طور پر لاہور ہائیکورٹ کا "قائم مقام چیف جسٹس" مقرر کر دیا گیا۔ بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل کی سماعت کے دوران ہی چیف جسٹس کے عہدہ پر ان کے تقرر کی توثیق کر دی گئی اور پھر انہی کو چیف الیکشن کمشنر بھی مقرر کر دیا گیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل خود سنبھالا اور ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس دوران ملزم بھٹو سے چیف جسٹس کا رویہ ایک "زمیہ داستان" بنا رہا۔ سپریم کورٹ میں بھٹو نے جو اپیل دائر کی اس میں ان زیادتیوں اور گالیوں کا بھی ذکر ہے جو بھٹو کو عدالت میں دی گئیں۔ بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلہ میں انہوں نے لکھا کہ ملزم بھٹو کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے اس وقت تک تختۂ دار پر لٹکایا جائے جب تک اسکی موت واقع نہ ہو جائے۔ مزید برآں یہ حکم بھی دیا گیا کہ بھٹو کو فوراً موت کی کوٹھری میں منتقل کر دیا جائے۔ اس کوٹھری میں منتقلی بھٹو کے لئے موت سے بھی بدتر تھی۔

بھٹو حکومت پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ حزب مخالف کی جماعتوں اور رہنماؤں کو رسوا کرنے کے لئے حکومت کے

اندر ایک ایسا نظام فروغ پا گیا تھا جسے خود بھٹو نے رائج کیا تھا۔ اس کے تحت حزب مخالف کی کسی جماعت اور کسی رہنما کو بخشا نہیں گیا۔ کالعدم نیشنل عوامی پارٹی مسلسل حملوں کی زد میں آتی رہی۔ ولی خان اور ان کے والد خان عبدالغفار خان کو جارحانہ پروپیگنڈے کا بڑا ہدف بنایا گیا۔

خان عبدالغفار خان کے خلاف پروپیگنڈا مہم کا آغاز بھٹو نے نہیں پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان نے کیا تھا۔ بعد میں ان کی جانشین حکومتوں نے خان عبدالغفار خان اور ولی خان کو کئی طویل سالوں تک جیل میں رکھا۔ ولی خان نے اپنے باپ کے خلاف ریمارکس دینے پر پاکستان کے پہلے وزیراعظم کو کبھی معاف نہیں کیا اور بھٹو کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے ولی خان نے کہا۔

"میں بھٹو سے کہتا ہوں کہ تمہارا سر بھی گوشت سے بنا ہے۔ گولی کی آنکھیں نہیں ہوتیں، اگر یہ گتے کے سر کو نشانہ بنا سکتی ہے تو وزیراعظم کے سر کو بھی نشانہ بنا سکتی ہے اگر صدر کینیڈی اور لیاقت علی خان قتل کئے جا سکتے ہیں تو تم کون ہو جسے زندہ چھوڑا جائے۔ ہم طورخم پر زنجیر کو توڑ دیں گے اور اسے مرگھیلا اور جیکب آباد پر لا رکھیں گے۔"

بھٹو نے عبدالولی خان کے خلاف ایک بھی ایسی اشتعال انگیز تقریر نہیں کی جبکہ ولی خان نے لندن میں "پیپلز فرنٹ" کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہا۔ "اگر میں بھٹو سے نجات حاصل کر سکتا اور کوئی شخص اس کے لئے میری مدد کرنے کو تیار ہو تو وہ خواہ شیطان ہو میں اس سے ہاتھ ملاؤں گا۔"

اس بات سے ضیاء حکومت کے ساتھ ولی خان کا تعاون قابل فہم ہو جاتا ہے۔

آکسفورڈ میگزین "راؤنڈ ٹیبل" میں ولی خان نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد" اس میں تین طریق سے پاکستان کے منتشر ہونے کی پیش گوئی کی گئی ہے اور یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کو تقسیم کر کے ایک غلطی کی کیونکہ اس طرح انہوں نے اپنے اس تمام اچھے کام پر پانی پھیر دیا جو انہوں نے سلطنت کے معماروں کی حیثیت سے گذشتہ دو صدیوں میں انجام دیا تھا۔ اس کے بعد ولی خان یہ رائے دیتے ہیں۔

"تقسیم کے خاتمہ سے پٹھانوں (پختونوں) کا از سر نو اتحاد عمل میں آئے گا اور ایک عظیم تر افغان مملکت قائم ہو جائے گی۔"

"تقسیم کا خاتمہ" اور "عظیم تر افغان مملکت" اپنی وضاحت آپ ہیں۔!

اٹھارھواں باب

دست شناسی کا علم
اور بھٹو کا ہاتھ
بین الاقوامی ماہر دست شناس میر بشیر
کی پیش گوئیاں سچ نکلیں

ادیب جاودانی میر بشیر کے ساتھ

بعض پڑھے لکھے روشن خیال افراد کے نزدیک، انسانی قسمت و تقدیر محض وہم و گمان پر مشتمل بات ہے لہٰذا اگر تقدیر ہی وہم و گمان ہے تو پھر تقدیر شناسی چہ معنی —؟

ع ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
کہ وہ خود ہے فراخیٔ افلاک میں خوار و زبوں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں جہاں ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی جیسے علوم کو سائنسی بنیادیں فراہم ہوئی ہیں وہیں نجوم و دست شناسی بھی محض قیاسات و مفروضات کی داستاں نہیں رہی —! خود حضرت انساں کے لاشعور میں پنہاں و مضمر خواہش اور قوتیں، اپنی توانائیوں سے آشنا ہو کر بڑے بڑے معجزے برپا کر سکتی ہیں تو انسانی ہاتھ کی لکیروں سے کیا کچھ مخفی نہیں ہو سکتا؛ دست شناسی کو عہدِ حاضر کے بعض نامور افراد نے علم و سائنس کا درجہ دیا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اسے اٹکل پچو طریق سے نہیں بلکہ واقعی علمی و سائنسی انداز سے بروئے کار لایا جائے۔

دست شناسی کے بین الاقوامی ماہر اور پاکستان کے مایۂ ناز فرزند میر بشیران لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے دست شناسی کو ایک ایسا فنِ لطیف بنا دیا جس کے ذریعے انسان کے اندر بھی جھانکا جا سکتا ہے اور دور دراز کے مستقبل کی پنہائیوں میں پوشیدہ واقعات کے ہیولوں کو بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے ؟

میر بشیر کو عالمی شہرت اسی لئے حاصل ہوئی تھی کہ دست شناسی کے علم و سائنس کے ذریعے ماضی کے دھندلکوں اور مستقبل کی گہرائیوں کو چیر کر اُن سے بیتے ہوئے یا آنے والے واقعات کے گوہر آبدار نکال لاتے تھے۔ انہوں نے برطانیہ عظمیٰ کے دارالسلطنت لندن کو اپنا مسکن بنا لیا تھا اور ان کا شمار دنیا کے معدودے چند عظیم دست شناسوں میں ہوتا تھا۔ پاکستانیوں کے ساتھ وہ خصوصی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ وطن کی مٹی کی تاثیر ہو کہ جس شخصیت کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے مشاہیر، مطلق العنان حکمران، جمہوری رہنمایان اور ترقی یافتہ ممالک کے سربراہان ہاتھ پھیلائے اپنی قسمت جاننے کی آرزو لے کر آتے تھے، وہ شخصیت عام سے عام پاکستانی کے لیے فراخ دل سے پیار و محبت کے پھول بکھیرتی تھی۔

کسی ماہر دست شناس کے بارے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بہت خوب کہا تھا کہ :—

"کسی اچھے دست شناس کو اپنا ہاتھ دکھانا، اپنے ہاتھوں ننگا ہونے کے مترادف ہے کیونکہ ماہر دست شناس سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا۔"

وہ دل کے بھید، دل چسپی آرزوئیں بھی جان لیتا ہے اور ماضی کے کرتوت اور مستقبل کے احوال بھی اس سے چھپے نہیں رہتے۔ جس طرح لاشعور کا مطالعہ کرنے والے ماہرین نفسیات ظاہر کے ہزار پردوں کو چاک کر کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں چھپی حقیقتیں اور بھید جان لیتے ہیں اسی طرح دست شناس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔!

بعض علوم کا المیہ ہے کہ وہ اناڑیوں کے ہتھے چڑھ کر بدنام ہو گئے۔ طبی علوم و فنون اس کی بڑی اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔ جڑی بوٹیاں جب انگریزی زبان کے بھاری بھرکم الفاظ و اصطلاحات کے روپ میں آتی ہیں تو خوفناک حد تک مرعوب کن بن جاتی ہیں لیکن جب انگریزی ادویات کے بھاری بھرکم ناموں کا پردہ ہٹا کر ان کا "جنرک" نام سامنے آتا ہے تو سارا رعب و دبدبہ دھرا رہ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ طبی علم عطائیوں کے ہاتھ میں صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ اس علم کی رسوائی کا موجب بھی بنتا ہے۔ یہی عالم دست شناسی کا ہے۔ اس سائنس کو بھی تھڑا برانڈ نجومیوں نے بہت خوار کیا ہے لیکن اس عمل سے یہ کہاں لازم ہوا کہ یہ سائنس اپنی افادیت ہی کھو بیٹھی ہے۔

ہاتھ کی لکیریں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اس لئے کہ یہ ہر فرد کے ہاتھ پہ مختلف ہوتی ہیں۔ آنکھیں سب انسانوں کی دو دو ہیں، ناک ایک اور منہ ایک — لیکن ہاتھوں کی لکیریں سب کی مختلف ہیں آخر کیوں — ؟ لکیروں کا یہ فرق و اختلاف سراسر وہی ہے جو ہر انسان کی تقدیر کا فرق و اختلاف ہے۔ ہر

فرد کی ہتھیلی پر ایک سی لکیریں کیوں نہیں ہوتیں ؟ تمام افراد کی ہتھیلیوں پر الگ الگ لکیریں کیوں ہوتی ہیں ؟ کیا یہ کوئی ایسا راز ہے جو ہر فرد کے ہاتھ پر لکھ دیا گیا ہے ؟ جسے ہر فرد اپنے ساتھ علیحدہ انداز میں لے کر دنیا میں وارد ہوتا ہے ؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہتھیلی پر لکیروں کی یہ پُراسرار تحریر حقیقتاً متعلقہ فرد کی تقدیر ہوتی ہے۔ البتہ اس تحریر کو پڑھنا ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے بس کا روگ نہیں ہوتا اس کے لئے برسوں کے مطالعہ، ریاضت، محنت اور سب سے بڑھ کر اس ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے جو سادہ سی لکیروں کو ان کے پورے سیاق و سباق میں پڑھ سکے، لکیروں کے جال میں اُتر کر تقدیر کا موتی نکال لائے۔ اس مطالعہ میں صرف لکیریں ہی پیشِ نظر نہیں ہوتیں، بلکہ ستاروں کے اُبھار (شمس و قمر، زہرہ، زحل، مشتری وغیرہ کے ابھار) کراس، جزیرے اور دائرے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نقطے اور زاویے تک پیشِ نظر رکھ کر مجموعی شخصیت کے بارے میں اور اسے پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں کوئی صحیح اور واضح رائے دی جا سکتی ہے۔

دست شناسی، بیتے دنوں کی بازگشت اور آنے والے دنوں کی چاپ سننے کے قابل ہوتی ہے۔ شرط یہی ہے کہ لکیروں کے ساتھ دوسرا تمام سیاق و سباق پیشِ نظر رہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اندر کا جہان کا مطالعہ و مشاہدہ کوئی آسان کام نہیں اور پھر اسی روشنی میں مستقبل کی پنہائیوں تک پہنچنا اور بھی دشوار ہوتا ہے۔ مغرب میں کیرو کو جو شہرت ملی وہ یوں ہی نہیں مل گئی تھی۔ یہ اس کے علم و دانش اور فن و سائنس کا نتیجہ تھی اور یہ سو فیصد سچ ہے کہ دست شناسی کے علم کے حصول کے لئے صرف ذوق و شوق کافی نہیں اس کے لئے تو ایسی لگن کی ضرورت پڑتی ہے جو جنون کی حدوں کو چھوتی ہو۔ میر بشیر میں یہ لگن پوری طرح موجود تھی۔ میر صاحب نے پشاور سے راس کماری تک جان جوکھوں کے سفر بغیر لگن کے نہیں کئے تھے۔ انہوں نے دست شناسی کی جدید ترین سائنسی کتب کے ساتھ سنسکرت و ہندی کی پرانی کرم خوردہ کتابوں کو پڑھنے کی زحمت بلاوجہ نہیں کی تھی۔ یہ ان کا جنون و عشق تھا جو انہیں اس علم کی بلندیوں تک لے گیا۔

میر صاحب بارہا پاکستان کے دورے بھی کرتے رہے، یہاں بھی وہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ شخصیتوں کے ہاتھ دیکھتے رہے بلکہ یہ شخصیتیں انہیں ڈھونڈ کر اپنے ہاتھ دکھاتی رہیں، صحافیوں پر وہ خصوصیت سے مہربان تھے۔ روزنامہ "نوائے وقت" کے مرحوم و مغفور عرفان چغتائی میر صاحب کے مداحوں اور دوستوں میں شامل تھے، آغا شورش کاشمیری مرحوم نے میر بشیر کی دست شناسی کے علم پر ایک کتاب بھی شائع کی۔

میر صاحب سے میرے مراسم، دوستی کی بے تکلفانہ حدود تک تو نہیں پہنچے تھے تاہم ان سے شناسائی

کا شرف ضرور حاصل تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں دلوں میں موجود ہیں۔ میر صاحب نے اپنی زندگی میں ہر قسم کے ہاتھ دیکھے، بین الاقوامی شخصیتوں، سیاستدانوں اور حکمرانوں سے لے کر صحافیوں، فنکاروں اور عام لوگوں کے ہاتھ تک۔ لاکھوں ہاتھوں کا مطالعہ بجائے خود ایک عظیم تجربہ ہوتا ہے جو میر صاحب کو حاصل تھا۔

تقدیر کے اسرار و رموز کو جاننے کی خواہش ہر بڑے انسان میں کمزوری کی حد تک پائی جاتی ہے ۔ کیوں ؟

بات یہ ہے کہ بڑے لوگوں کو اکثر و بیشتر بیٹھے بٹھائے سب کچھ مل جاتا ہے۔ کچھ بڑے لوگ تو سونے کا چمچہ منہ میں لئے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات جہاں ان کی خوش قسمتی کی دلیل ہوتی ہے وہیں ان کے دل کے نہاں گوشوں میں، کہیں نہ کہیں یہ خدشہ بھی چھپا رہتا ہے کہ جس طرح بیٹھے بٹھائے انہیں سب کچھ مل گیا، ہاتھ ہلائے بغیر آسمان کی ساری نعمتوں کے دروازے اُن پر وا ہو گئے کہیں اسی طرح بیٹھے بٹھائے، کسی حرکت کے بغیر، فلک کج رفتار یہ سب کچھ ان سے چھین نہ لے اس لئے بڑے لوگوں کو یہ تجسس بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آنے والے دنوں میں جھانک سکیں۔ مستقبل کے احوال جان سکیں اور ممکن ہو تو خطرات سے بچنے کی کوئی تدبیر کر سکیں ۔ اب یہ الگ بات ہے کہ دست شناسی کے ماہرین ان بڑے لوگوں کو ان کے مستقبل میں آنے والی کوئی خطرناک بات سرے سے بتاتے ہی نہیں وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ کوئی بُری یا منحوس خبر دینے سے یہ حضرت چڑ نہ جائیں، خفا نہ ہوں اور خواہ مخواہ پیٹ پر لات ہی نہ مار دیں۔

بڑے لوگوں کی یہ کمزوری، پاکستان کے بعض بڑوں میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ہمارے ہاں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو اور حد یہ کہ جنرل ضیاء الحق، سبھی وہ بڑے تھے جو اپنی تمام تر روشن خیالی، تعلیم اور مکمل اقتدار کے باوجود اپنے اپنے نہاں خانۂ دل میں خوف زدہ تھے۔ ان کے باطن سہمے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ سب اگر نجومیوں، دست شناسوں اور پُراسرار علوم کے ماہرین پر یقین رکھتے تھے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو، سری لنکا کے دورہ پر گئے، لنکا کے ماہرین نجوم و فلکیات دنیا بھر میں مشہور ہیں چنانچہ بھٹو نے بھی وزیر اعظم بندرا نائیکے سے مل کر اپنا ہاتھ دکھانے کا اہتمام کیا۔ اس مقصد کے لئے لنکا کے ایک ماہر دست شناس اور ستارہ شناس کی خصوصی خدمات حاصل کی گئیں ۔

دست شناسی اور مستقبل جاننے کے لئے بھٹو کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ سندھ کی کابینہ کے

ایک صوبائی وزیر محض اس لئے وزیراعظم بھٹو کے انتہائی قریب آگئے تھے کہ اس صوبائی وزیر کو پُراسرار علوم اور دست شناسی کا اچھا خاصہ چسکا تھا۔

پاکستان کے انتخابات کی تاریخ تک کے سعد و نحس ہونے کے بارے میں بھٹو صاحب نے سری لنکا کے ماہرین نجوم و فلکیات سے رائے طلب کی تھی۔ جنہوں نے بھٹو کو بتایا تھا کہ یہ مناسب تاریخ نہیں ہے دوسری طرف بھٹو قومی سطح پر اس تاریخ کا اعلان کر چکے تھے اور یہ کوئی ذاتی معاملہ نہیں تھا جس پر ماہرین نجوم کی رائے کے مطابق نظر ثانی کر لی جاتی چنانچہ انتخابات کی تاریخ تو بہر حال ۷ مارچ ہی رہی البتہ اس تاریخ کے بارے میں لنکا کے ماہرین نجوم کی "غیر مناسب" ہونے کی رائے بھی بالآخر ثابت ہو گئی۔

انتخابات کی تاریخ اور لنکا کے ماہرین نجوم سے رائے طلبی کے بارے میں بھٹو کابینہ کے ایک وزیر اور ہمارے دوست مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب میں چند باتیں لکھی ہیں اور وہ چند باتیں بھی ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔

ایک مثال ملاحظہ ہو:

"سری لنکا کے ایک بڑے دست شناس اور ستارہ شناس سے ان کے گہرے تعلقات تھے وزیراعظم نے جب ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو انتخابات کے انعقاد کی تاریخ قرار دیا تو یہ صاحب اس تاریخ کے سعد ہونے کی سند، سری لنکا کے ستارہ شناس سے لے کر آئے تھے۔ سری لنکا کے نجومی نے مارچ کے بابرکت ہونے کی تصدیق کر دی۔"

پھر اسی صفحہ پر آخر میں مولانا کوثر نیازی اپنی ہی تردید بھی فرماتے ہیں:

"وزیراعظم بھٹو نے (لنکا کے) نجومیوں کو ۷ مارچ کی تاریخ سے آگاہ کیا اور انہیں حساب لگانے کو کہا کہ اس تاریخ کو ہونے والے انتخابات کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ لیکن ایک نجومی نے بھی ان کی بات کا جواب نہ دیا۔ سب کے ہونٹوں پر گویا مہر لگ گئی تھی۔ مسٹر بھٹو کے بے حد اصرار پر سب سے بزرگ نجومی نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔ "اب تو آپ تاریخ کا اعلان کر چکے ہیں ہم اس میں کیا رائے دے سکتے ہیں؟"

گویا مولانا کے الفاظ میں لنکا کے نجومیوں نے اس تاریخ کو سعد بھی قرار دیا اور خاموشی بھی اختیار کی — اس میں سچ کیا ہے — ؟ یہ مولانا ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ خیال ہے کہ یہ دونوں دعوے مولانا کی تصنیف "اور لائن کٹ گئی" کے ایک ہی صفحہ (۴۸) پر موجود ہیں۔

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بہرحال ہماری اطلاعات کے مطابق لنکا کے نجومیوں نے اس تاریخ کے سعد نہ ہونے سے بھٹو صاحب کو مطلع تو کر دیا تھا مگر بھٹو صاحب اس تاریخ کو تبدیل اس لئے نہ کر سکے کہ وہ قومی سطح پر اس کا اعلان کر چکے تھے۔ بھٹو صاحب نے اپنے ہاتھ کے نشانات کا ایک خاکہ لندن میں پاکستان کے بین الاقوامی ماہر دست شناس میر بشیر کو بھی بھجوایا تھا۔ ایک ملاقات میں میر بشیر نے بھٹو صاحب کے ہاتھ کے خاکے کا تذکرہ کرتے ہوئے راقم کو بتایا کہ میں نے یہ خاکہ دیکھ کر دو باتیں کھلے طور پر اور قطعی طے شدہ انداز میں جان لی تھیں ایک یہ کہ ۱۹۷۷ء میں بھٹو کا اقتدار ختم ہو جائیگا، یہ اقتدار کیسے ختم ہوگا؟ بھٹو انتخابات ہار جائیں گے یا فوج ان کا تختہ الٹے گی؟ مجھے ان سوالوں سے غرض نہیں تھی اور پھر جب بھٹو نے انتخابات جیت لئے تو جمہوری طریقہ سے بھٹو کے اقتدار کے خاتمے کا مسئلہ پس منظر میں چلا گیا لیکن ان کے ہاتھ کی لکیروں میں ان کا اقتدار صاف طور پر ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا اور بالآخر اسی سن میں یہ اقتدار فوج کے ذریعہ ختم ہو گیا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ بھٹو صاحب کو پھانسی ہوگی۔ ان کی دماغی لکیر کے اختتام پر ایک گول دائرہ موجود تھا۔ یہ نشان ظاہر کرتا تھا کہ انجام بخیر نہیں اور موت طبعی نہیں ہوگی اور پھر یہ بھی ثابت ہو گیا لیکن یہ ظاہر ہے کہ میں نے اس دوسری بات یعنی پھانسی پانے کا ذکر بھٹو صاحب سے نہیں کیا تھا۔ ان کی ناراضگی کے خوف سے یہ بتانا ممکن نہ ہو سکا۔ بھٹو صاحب اُن دنوں جب انہوں نے میر بشیر کو ہاتھ کا خاکہ دکھایا اپنے اقتدار کے عروج پر تھے۔ اُن حالات میں ان کے اقتدار کے خاتمہ کا تصور تک محال تھا ان کی کرسی ہر لحاظ سے بہت مضبوط تھی اور اقتدار کے خاتمہ کی بات صرف کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہوائی محسوس ہوتی تھی لیکن ہوا وہی جو ان کے ہاتھ پر لکھا تھا۔ وہ بھی ہوا جس کا میں نے صاف صاف اظہار کر دیا تھا یعنی ۱۹۷۷ء میں اقتدار کا خاتمہ۔ اور وہ بھی ہو گیا جس کا اظہار کرنا مجھے غیر مناسب لگا تھا یعنی بھٹو صاحب کا پھانسی پانا۔

یہ تھا میر بشیر کا کمالِ فن اور دست شناسی میں ان کی مہارت!

میر بشیر کے علاوہ علم فلکیات اور نجوم کے ایک اور ماہر حکیم فاضل ظہیر نے بھی بھٹو کی پھانسی کے بارے میں انہیں اپنے ایک خط کے ذریعے قبل از وقت اس امر سے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے اپنے حالات و روش کو نہ بدلا تو انہیں پھانسی کے المیہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔

حکیم فاضل ظہیر کا نام ملکی سطح پر ہر چند انتہائی غیر معروف ہے مگر لاہور کے باسیوں اور ملک کی نامور شخصیات کے لیے ان کا نام انتہائی معتبر اور جانا پہچانا ہے۔ ان کی گراں قدر شخصیت تیام پاکستان سے اب تک کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی چشم دید گواہ ہے۔ حکیم فاضل ظہیر نے طالب علمی کے زمانہ میں تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور انہوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ سمیت تحریک پاکستان کے تمام نامور قائدین کو نہایت قریب سے دیکھا۔ وہ علامہ اقبالؒ مرحوم کے نیازمندوں میں بھی شامل رہے اور

ان کی زندگی میں اکثر و بیشتر ان کے پاس حاضری دیتے رہے۔ جب غازی علم دین نے رسولِ مقبولؐ کی شان میں گستاخی کرنے پر جے پال کو جہنم واصل کر دیا اور غازی علم دین کے خلاف قتل کے الزام میں مقدمہ چلا تو جن نوجوانوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو غازی علم دین شہید کے مقدمہ کی پیروی کرنے پر آمادہ کر کے لاہور آنے پر مجبور کیا ان میں حکیم فاضل ظہیر کا نام سرفہرست ہے۔ غازی علم دین شہید سے ملاقات کے بعد قائداعظمؒ نے صاف کہہ دیا تھا کہ غازی علم دین شہید کی تقریب شہادت کے مرتبہ بلند پر لگی ہوئی ہیں، میری وکالت اُسے تختۂ دار سے نہیں بچا سکتی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے یہ بات بجا طور پر کہی تھی کیونکہ وکالت سے صرف اس شخص کو بچایا جا سکتا ہے جو خود بھی بچنے کا متمنی ہو اور اپنے وکیل کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو۔

لاہور کی شاہراہِ قائداعظم پر انگریزی ادویات کی ایک معروف دکان ان کی ملکیت ہے۔ شہر کے صوفی منش اور درویش صفت حکیم فاضل ظہیر اس دکان کی ایک عقبی نشست گاہ میں سارا سارا دن اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم میں گھرے رہتے ہیں، حکیم فاضل ظہیر ایک بے مثال معالج بھی ہیں، وہ اپنے پاس علاج کے لیے آنے والوں سے کوئی فیس یا نذرانہ قبول نہیں کرتے، وہ علومِ ظاہری و باطنی دونوں پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور ان کی گفتگو میں قرآنی آیات کا ورد شامل رہتا ہے، وہ اپنے پاس آنے والے مریضوں کی پرسشِ احوال کے بعد ان کے لیے بیشتر روحانی علاج تجویز کرتے ہیں اگر ضروری سمجھیں تو جدید طریقۂ علاج کے مطابق ادویات تجویز کر دیتے ہیں، ان کی حیثیت ایک روحانی معالج کی سی ہے۔ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں علمِ نجوم کو بروئے کار لا کر کبھی کبھار مختلف شخصیات اور حالات کے بارے میں پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ وہ اشارے کنائے میں گفتگو کرنے کے خوگر ہیں مگر ان کے اشاروں میں آنے والے حالات کی سچائیاں بیان ہوتی ہیں۔

حکیم ظہیر نے ۱۹۷۵ء میں ہی ایک خط کے ذریعے مسٹر بھٹو کو انتباہ کر دیا تھا کہ ملکی حالات کو درست کرنے کے لئے اگر انہوں نے اپنا طریق نہ بدلا تو ان کا انجام عبرت ناک اور غیر فطری ہوگا جو پھانسی پر منتج ہو سکتا ہے۔

حکیم ظہیر نے صدر ضیاء سے ایک ملاقات میں خود صدر کو بھی خبردار کر دیا تھا اور یہ انتباہ ۲۵ جولائی ۱۹۸۸ء کو کیا تھا کہ ان کی غیر طبعی موت کا خطرہ ہے اور ۱۹۸۹ء کے زائچوں میں وہ کہیں نظر نہیں آتے اس لیے وہ محتاط رہیں اور خصوصاً سفر میں انتہائی احتیاط برتیں۔ چنانچہ صدر ضیاء نے واقعی احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ بلٹ پروف گاڑی کا استعمال، پنڈی و اسلام آباد کے جڑواں شہروں تک بھی ہیلی کاپٹر سے آمد و رفت، آرمی ہاؤس میں شب بسری وغیرہ کے تمام اقدامات اسی احتیاط کے مظہر ہیں۔ اس ضمن میں ایک خصوصی امر یہ تھا کہ چونکہ صدر ضیاء پر ایک دو قاتلانہ حملے ناکام ہو چکے تھے اور فوجی انقلاب برپا کرنے کی دو سازشیں بھی پکڑی گئی تھیں چنانچہ تحقیقات سے صدر ضیاء کو بخوبی علم ہو گیا تھا کہ ایک بڑی غیر ملکی طاقت ان کی جان لینے کے درپے ہے۔ طیارے کے حادثے کے بعد اخبارات میں

اب روس، افغانستان اور بھارت کی سازشوں کے بڑے چرچے ہیں لیکن حقیقت حال سے صدر ضیاء خوب آگاہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے خلاف قاتلانہ حملوں کی سازشوں میں روس، بھارت یا افغانستان نہیں بلکہ ایک اور لمبا "دور رس ہاتھ" کام کر رہا ہے چنانچہ صدر غیر معمولی طور پر محتاط ہو گئے تھے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے سابق حکمران ذوالفقار علی بھٹو کی طرح صدر ضیاء الحق کو بھی علم نجوم و فلکیات کے ماہرین سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ وہ مستقبل کے رنگ ڈھنگ جاننے کے لئے اکثر ان سے رجوع کرتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نہ صرف ماہرین نجوم سے باقاعدہ رجوع کرتے تھے بلکہ بذات خود بھی دست شناسی (پامسٹری) سے خاص حد تک آگاہ تھے ۱۹۷۸ء میں راولپنڈی جیل میں ذوالفقار علی بھٹو نے جو کتاب "اگر مجھے قتل کیا گیا" لکھی ہے، اس میں بھٹو نے واضح طور پر کہا ہے کہ "ٹھیک ہے جنرل ضیاء نے میری حکومت کا تختہ الٹ دیا اور مجھے ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا لیکن دس سال بعد جنرل ضیاء الحق بھی اس دنیا میں نہیں رہیں گے اور وہ دس سال آنے ہی والے ہیں"

یوں ۱۹۷۸ء کے دس سال ۱۹۸۸ء میں مکمل ہو گئے اور حادثہ پیش آگیا۔

انیسواں باب

علامہ عظیم جی غفوری کی کہانی
نئے دور کا ولی یا صرف ایک نجومی ؟
علامہ کو برصغیر کی عظیم شخصیتوں کے ہاتھ
دیکھنے کا شرف حاصل ہے
انہوں نے بھٹو، ضیاء، ذیل سنگھ اور
اندرا گاندھی کے
ہاتھ بھی دیکھے

بھٹو کے ہاتھ کا پرنٹ

علامہ عظیم جی غفوری، صوبہ سندھ کے ضلع سانگھڑ میں رہائش رکھتے ہیں۔ سندھ کے مختلف روزنامہ اخبارات میں انہیں کام کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان میں روزنامہ عبرت، سندھ نیوز، نیوز ٹائمز اور اعلان کراچی شامل ہیں جن کے لیے علامہ نامہ نگاری کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ تک روزنامہ مشرق لاہور میں "آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی" کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے ہیں۔ اِس دوران اخبار کے لیے وہ ہر ہفتے قسمت کے رنگ، ڈھنگ اور ستاروں کی چال پر مستقلاً کالم لکھتے رہے۔ اس لحاظ سے وہ صحافی ہیں لیکن پامسٹری (دست شناسی) اور علمِ نجوم سے انہیں بچپن سے گہری دلچسپی رہی ہے اور ان علوم میں اپنی مبتینہ مہارت کی بنیاد پر انہیں برصغیر کی بعض عظیم اور نامور شخصیتوں سے تعارف اور میل جول کے مواقع حاصل ہوتے رہے ہیں۔ تاہم بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ علامہ غفوری کسی انٹیلی جنس ادارہ سے وابستہ ہیں اور اس کی بدولت نہ صرف بڑے بڑے لوگوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں بلکہ اخبارات میں "او ایس ڈی" (آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی) جیسے غیر صحافتی مگر مالیاتی لحاظ سے مفید عہدے بھی مار لیتے ہیں، علامہ صاحب اپنے طور پر کسی انٹیلی جنس ادارہ سے اپنی وابستگی کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ ان کے بقول ۔

یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

بہرحال جن بلند و بالا شخصیتوں تک رسائی کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اُن تک یہ رسائی محض دست شناسی یا علمِ نجوم کے تحت ہونا ممکن محسوس نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑے لوگوں کے واہمے بھی بڑے ہوتے ہیں اور ان واہموں کی بدولت کئی جوگی، یوگی، رشی اور صوفی، ولی، نجومی اکثر ان بڑوں کے محبوب و

پسندیدہ افراد بن جاتے ہیں ۔

اندازہ کیجیے کہ احمد شاہ ابدالی نے صرف ایک مجذوب صابر شاہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ صابر شاہ جس کا مزار آج بھی لاہور میں موجود ہے، احمد شاہ ابدالی کی محبوب ترین شخصیت تھا اور اسی نے احمد شاہ کو افغانستان کا بادشاہ بننے کی خوشخبری اس وقت سنائی تھی جب احمد شاہ مزاروں پر مارا مارا پھرتا تھا اور ایسے ہی ایک مزار پر صابر شاہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی جس نے اسے شاہِ افغانستان بننے کی نوید دی۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ بن جانے کے بعد احمد شاہ ابدالی اس درویش کو بھولا نہیں تھا اور مستقلاً اپنے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ لاہور پر احمد شاہ ابدالی کے حملہ سے پہلے صابر شاہ نے ہی اسے حملہ سے روکا اور یہ کہا تھا کہ میں خود لاہور جاتا ہوں اور اس شہر کو بغیر فوج کے آپ کے تابع فرمان لے آؤں گا۔ چنانچہ وہ احمد شاہ ابدالی کے ایلچی کی حیثیت سے لاہور آیا اور ناظم لاہور سے ابدالی کی اطاعت قبول کرنے کو کہا۔ بھرے دربار میں اطاعت گزاری قبول کرنے کی بات پر ناظم لاہور چڑ گیا اور اس نے حکم دیا کہ اس شخص کے گلے میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے۔ اس عمل سے صابر شاہ کی موت واقع ہوگئی اور وہ جو لاہور اپنے آبائی تعلق کی وجہ سے اس شہر کو تباہی سے بچانے آیا تھا خود موت کی وادیوں میں کھو گیا۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی موت کی خبر ہوئی تو وہ طوفان کی طرح غضب ناک عالم میں اٹھا اور پنجاب کو روندتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ شہر پر قبضہ کے بعد اس نے صابر شاہ کے قتل کا بدلہ چکانے کے لئے شہریوں کے قتلِ عام کا فرمان جاری کیا۔ گلی کوچوں میں لاشیں بچھ گئیں۔ تب لاہور شہر کے معززین کے ایک وفد نے اللہ رسولؐ کا واسطہ دے کر اس کے غصہ کو ٹھنڈا کیا اور قتلِ عام بند ہوا۔

صابر شاہ مجذوب کا چھوٹا سا مزار آج بھی لیڈی ولنگڈن ہسپتال کے قریب موجود ہے۔ تو بات یہ ہے کہ بڑے لوگوں کا قرب تو مجذوبوں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے ۔ غفوری صاحب سے معذرت کے ساتھ، روس کا راسپوٹین کیا تھا؟ لیکن اندازہ کیجیے کہ زار اور زرینائیں اس پر مرتی تھیں، عین ممکن ہے کہ غفوری صاحب میں بھی کوئی ایسی ہی خوبی موجود ہو جو انہیں نامور لوگوں تک پہنچا دیتی ہو۔

علامہ عظیم جی غفوری کا دعویٰ ہے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق، مسز اندرا گاندھی، گیانی ذیل سنگھ، پیر پگاڑا، نواز شریف، سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ اور شاہ فیصل کے ہاتھ دیکھنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایران کے روحانی رہنما آقائے خمینی کے ہاتھ کے پرنٹ بھی دیکھے ہیں۔

۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو غفوری صاحب اوجڑی کیمپ میں سردار عبدالقیوم کی اس دعوت میں موجود تھے جو سردار صاحب نے اپوزیشن لیڈروں کے اعزاز میں دی تھی۔ اس موقع پر پیر پگاڑا نے

انہیں علیحدگی میں لے جا کر کہا۔

"آپ بھٹو صاحب کو اطلاع کر دیں کہ مارشل لا لگنے والا ہے اس لیے وہ فوراً ملک چھوڑ کر چلے جائیں، انہوں نے بے شک ہم سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا لیکن میں پھر بھی یہ چاہتا ہوں کہ بھٹو کی جان بچ جائے۔"

غفوری صاحب نے اسی وقت پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ کر بھٹو صاحب کو پیر صاحب کا پیغام دیا لیکن بھٹو صاحب نے پیر صاحب کی بات پر یقین نہیں کیا۔ بہرحال پیغام دے کر غفوری صاحب سندھ ہاؤس آ گئے جہاں اپوزیشن کے مختلف لیڈر مقیم تھے۔ بعدازاں جب آرمی نے سندھ ہاؤس کو محاصرہ میں لیا تو دوسرے لیڈروں کے ساتھ غفوری صاحب بھی دھر لئے گئے۔ انہیں گرفتار کر کے جب جنرل فیض علی چشتی کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا۔

"بھئی، انہیں کیوں پکڑ لائے ہو یہ تو ہمارے دوست ہیں۔" غفوری صاحب نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ جنرل چشتی کے حکم پر مجھے چھوڑ دیا گیا تو جنرل چشتی نے مجھے اگلی صبح چھ بجے ملنے کے لئے کہا چنانچہ دوسری صبح میں دوبارہ ان سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ذوالفقار علی بھٹو سے ملوں اور انہیں یہ تسلی دوں کہ آرمی کے لوگ ان سے کوئی برا سلوک نہیں کرنا چاہتے۔

اس پر میں بھٹو صاحب کے پاس گیا وہ اس وقت لان میں بیٹھے گہری سوچوں میں غرق تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"فوج والے اب میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "وہ یا تو آپ کو دوست بنالیں گے اور اگر آپ نے یہ دوستی قبول نہ کی تو وہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اس کے بعد میں اس وقت تک پرائم منسٹر ہاؤس میں رہا جب تک کہ فوج بھٹو صاحب کو پکڑ کر مری نہیں لے گئی۔

علامہ غفوری نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ مارشل لا کے نفاذ کا پیر پگاڑا کو جو علم تھا وہ ان کی کوئی پیرانہ کرامت نہیں تھی بلکہ حزب اختلاف نے پیر صاحب کو مارشل لا کے نفاذ کے منصوبہ سے مطلع کر دیا تھا۔ مزید یہ کہ پیر صاحب کے فوج کے جرنیلوں سے بہت قریبی اور دوستانہ تعلقات تھے غالباً اس لئے فوج نے پیر صاحب کو حراست میں بھی نہیں لیا حالانکہ اس وقت اپوزیشن کے سبھی لیڈر پکڑے گئے تھے۔

عظیم جی نے یہ انکشاف بھی کیا "حزب اختلاف، پیپلز پارٹی اور بھٹو سے آخری مذاکرات کے بعد

جنرل ضیاء الحق نے مجھ سے کہا:-

"آپ بھٹو صاحب کا ہاتھ دیکھتے رہے ہیں آج میرا ہاتھ دیکھ کر میرے مستقبل پر بھی کچھ روشنی ڈالیں"

اس پر میں نے ان کا ہاتھ دیکھا اور ان سے کہا — "آپ بے تاج بادشاہ بننے والے ہیں"

اس بات پر جنرل ضیاء الحق کچھ بگڑے، انہوں نے کہا "میں بھٹو صاحب کو تیسری دنیا کا عظیم لیڈر سمجھتا ہوں وہی اس ملک کے سربراہ ہیں، آپ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالیں جس سے میرے اور بھٹو صاحب کے تعلقات متاثر ہوں اور جس سے کوئی خرابی پیدا ہو"

غوری صاحب نے بتایا کہ ۵ جولائی کو جب فوج بھٹو صاحب کو مری لے گئی تو میں پرائم منسٹر ہاؤس سے نکل کر سڑک پر کھڑا تھا۔ اچانک جنرل ضیاء الحق کی گاڑی وہاں سے گذری وہ غالباً آرمی ہاؤس جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے آنے والی فوجی جیپ میں بیٹھے ہوئے بریگیڈیئر کو حکم دیا کہ غوری صاحب کو گاڑی میں بٹھاؤ اور آرمی ہاؤس لاؤ۔ بریگیڈیئر صاحب مجھے جیپ میں ساتھ بٹھا کر آرمی ہاؤس لے گئے جہاں جنرل ضیاء الحق نے مجھے ایک طرف علیحدگی میں لیجا کر کہا:

"میرا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ میں حکومت کو ٹیک اوور کروں لیکن ملک و قوم کے لیے مجھے یہ ذمہ داری اٹھانا پڑی ہے، مجھے یہ بتاؤ کہ کیا میں منصفانہ انتخابات کرا سکوں گا یا نہیں"

میں نے جنرل ضیاء سے کہا — "اس سے پیشتر بھی میں نے آپ کا ہاتھ دیکھ کر آپ کے بادشاہ بننے کی پیش گوئی کی تھی جس پر آپ کچھ بگڑے بھی تھے بہرحال یہ جان لیجئے کہ بادشاہ الیکشن نہیں کراتا صرف حکومت کرتا ہے"

جنرل ضیاء نے کہا: "میں ۹۰ روز میں انتخابات کا وعدہ کر چکا ہوں"

میں نے جواب دیا — "اگر آپ ۹۰ روز میں انتخابات کرا دیں گے تو میں ہاتھ دیکھنا چھوڑ دوں گا اور صحافت کو بھی خیرباد کہہ دوں گا"

پھر ظاہر ہے کہ ۹۰ روز کا وعدہ مہینوں اور سالوں میں بدل گیا۔

غوری صاحب کے مطابق سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کی اپیل کی سماعت کے دوران انہیں بھٹو کا ہاتھ دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت میں نے بھٹو صاحب کا ہاتھ ملک کے معروف صحافیوں مسٹر جالیں فرینڈ یوجاں اور رشید صدیقی کی موجودگی میں دیکھا۔ بھٹو صاحب کے ہاتھ میں پھانسی کی لکیر صاف نظر آتی تھی لیکن میں نے یہ بات انہیں نہیں بتائی کیونکہ وہ پہلے ہی بہت افسردہ تھے انہیں مزید افسردہ کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ بہرحال میں سپریم کورٹ سے باہر آیا تو انٹیلی جنس والوں نے مجھے پکڑ لیا اور راولپنڈی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیئر راحت لطیف کے سامنے پیش کیا۔ بریگیڈیئر صاحب نے مجھ سے کہا: "ہم بھی بھٹو کے خیرخواہ ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے ان کے ہاتھ میں کیا دیکھا"

میں نے جواب دیا۔ "میرے علم کی روشنی میں تو وہ مجھے پھانسی چڑھتے نظر آتے ہیں"

بیسواں باب

حرفِ آخر

پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

۴ رجولائی ۱۹۷۷ء کی آخرِ شب کہہ لیجئے یا ۵ رجولائی کی صبحِ کاذب۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کی آخری رات تھی۔

اُس رات بھٹو کابینہ کے ایک رکن عبدالحفیظ پیرزادہ نے بھٹو سے کہا:

"مبارک ہو جناب — بحران ختم ہوگیا!"

یہ نصف رات گذرنے کے بعد کی "مبارکباد" ہے۔ عین اس وقت (تقریباً ایک بجکر ۲۰ منٹ پر) فوج حرکت میں آچکی تھی اور ایوانِ اقتدار میں بھٹو کی وہ آخری رات تھی۔ پیرزادہ کی اچانک مبارکباد پر بھٹو نے چونک کر دریافت کیا:

"مبارکباد — کس بات کی؟ پی این اے سے سمجھوتہ کے باوجود انتخابات تو ابھی ہونا باقی ہیں پھر یہ مبارکباد؟"

پیرزادہ نے فوراً پینترا بدلا اور کہا:

"حزبِ مخالف کی ہوا نکل گئی ہے جناب، اس کی مبارکباد"!

بھٹو ہنس پڑا اور ممتاز علی بھٹو سے مخاطب ہو کر کہا

"پیرزادہ کی سدابہار رجائیت کا کوئی علاج ہونا چاہیئے"

ممتاز علی بھٹو نے مزاحاً جواب دیا:

"دریائے سندھ میں اونچے درجے کا سیلاب آئے تو اس موقع پر پیرزادہ کی سکھر بیراج پر صفائی ہونا چاہیئے"

اس پر تینوں افراد ذوالفقار علی بھٹو، حفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو ہنس پڑے ۔ ہلکا سا قہقہہ لگا لیکن اس کے صرف ۲۰ منٹ بعد ان تینوں نے ایک دوسرے اور زوردار اجنبی قہقہہ کی آواز سنی جس کے ساتھ بھاری بوٹوں کی دھمک صاف سنائی دے رہی تھی۔

یہ پرائم منسٹر ہاؤس پر قبضہ کرنے والے فوجی افسروں کا قہقہہ اور ان کے بوٹوں کی دھمک تھی۔

بھٹو اس وقت، اس فوجی کارروائی سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ سوال کیا کہ "دیکھنا یہ ہے کہ آخری قہقہہ کس کا ہوگا۔؟"

بھٹو کو غلط فہمی تھی کہ آخری قہقہہ اسی کا ہوگا، عجیب بات ہے کہ بھٹو جیسا نابغہ روزگار، ایوان اقتدار میں اپنی آخری رات تک فوجی بوٹوں کی بڑھتی چاپ نہ سن سکا اور حد یہ ہے کہ پیرزادہ نے "بحران ختم ہوگیا" کا جو اعلان صرف ۲۰ منٹ پہلے کر دیا تھا بھٹو اس کی اصل نوعیت تک نہ پہنچ سکا اور ایک سوال یہ بھی ہے کہ حفیظ پیرزادہ کو بحران ختم ہونے کی پہلے سے اطلاع کیسے ہوگئی تھی؟ اس سوال کے جواب میں بعض پارٹی لیڈروں کا پُراسرار رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہیں بحران کے خاتمہ کی نہ صرف خبر تھی بلکہ وہ اس کے روشن پر آڑ بھی رہے تھے۔

بھٹو، ان کے ہتھکنڈوں کو کیوں نہ سمجھ سکا؟ پیرزادہ نے مذاکرات میں جو مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کیں ان کا مقصد کیوں نہ جان سکا؟ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بھٹو کو خود بھی سب کچھ معلوم تھا مگر وہ بے بس تھا۔ جیسا کہ اس امر سے ظاہر ہے کہ تحریک استقلال کے ایئر مارشل اصغر خاں نے تینوں افواج کے سربراہوں کے نام سرکاری احکامات سے روگردانی کا جو خط لکھا وہ بغاوت کی کھلی ترغیب تھی لیکن اس پر کسی کارروائی کی بجائے یہ خط ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا، اس بھرپور نمائش پر آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم نے بھٹو سے دریافت کیا:

"آپ نے اس نمائش کی اجازت کیوں دی؟"

بھٹو نے بے بسی سے سردار صاحب کی طرف دیکھا اور کہا:

"میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ خط فوج کی مرضی سے دکھایا جا رہا ہے؟"

اور سیدہ عابدہ حسین کا دعویٰ ہے کہ:

"جنرل ضیاء الحق صاحب سازش کے ذریعے اقتدار میں نہیں آئے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان سازش کے ذریعے آئے تھے۔ یحییٰ خان بھی کسی حد تک سازش کے ذریعے آئے تھے لیکن جنرل ضیاء الحق

سازش کے ذریعے نہیں آئے۔ وہ مخصوص حالات کے باعث آئے تھے۔ جنرل ضیاالحق کو درحقیقت بھٹو صاحب لائے۔ بھٹو صاحب نے ہی فوج کو ملوث کیا تھا، محمد و مارشل لاء کس نے لگایا تھا؟ اگر اس وقت سیاسی بصیرت بھٹو صاحب کا ساتھ دیتی اور ان کی عقل پر پردے نہ پڑے ہوتے تو وہ پی این اے کے ساتھ سمجھوتہ کر کے کوئی حل تلاش کر لیتے۔ وہ مذاکرات میں تعطل نہ آنے دیتے۔؟

یہ دونوں آراء بھٹو صاحب کے سیاسی مخالفوں کی ہیں لیکن ان میں وزن ہے۔ البتہ یہ دوسرا پہلو بھی عین ممکن ہے کہ بھٹو صاحب کو خود پر غیر معمولی اعتماد تھا اور وہ ہر قسم کے حالات (مارشل لاء سمیت) سے نپٹ لینے کو معمولی امر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ اس بارے میں خود بھٹو، سرکاری وائٹ پیپر کے جواب میں لکھتے ہیں:

"۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا فوجی انقلاب ایک عظیم جرم تھا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی تدفین کی ایف آئی آر اس سے بھی عظیم تر جرم کی حیثیت سے تاریخ میں درج ہوگی۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ء کا دن۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کے دن سے یا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دن سے کمتر درجہ کی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلاشک و شبہ مجرم کو تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا ــــ انسانی تاریخ میں ایک چیز مکافاتِ عمل ہوتی ہے اور تاریخی مکافاتِ عمل کا یہ اصول ہے کہ اس کے ہتھیار مظلوم نہیں بلکہ خود مجرم تیار کرتا ہے؟

خیال رہے کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ء کو یہ اعلان کیا گیا تھا کہ چیف آف آرمی سٹاف پاکستان کے صدر سمجھے جائیں گے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بھٹو مزید لکھتے ہیں:

"پاکستان کو جانوروں کے باڑے میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس کے خستہ حال و خدا ترس لوگوں کو غلیظ جانور بنا دیا گیا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ آئین ہو یا نہ ہو، چیف آف آرمی سٹاف کی کرسی، پاکستان کی سب سے طاقتور کرسی ہے۔"!

ایک اور خیال یہ بھی ہے کہ بھٹو صاحب کو دانستہ، ایک منظم سازش کے تحت، تمام حالات خصوصاً فوج کے عزائم سے بے خبر رکھا گیا۔ چنانچہ بھٹو صرف یہ سمجھتے رہے کہ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی وجہ سے امریکہ ان کا دشمن ہے۔ انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت ہی نہ کی کہ امریکہ اپنی دشمنی کو پورا کرنے کے لئے کس طاقت کو آلۂ کار بنا سکتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلی جنس) نے اگر وزیراعظم کو بروقت چیف آف آرمی سٹاف کے عزائم سے مطلع کر دیا ہوتا تو فوجی انقلاب اتنی آسانی سے برپا نہ ہوتا۔

اس کے عین برعکس سول انٹیلی جنس نے مئی ۱۹۷۷ء میں ہی بھٹو کو خبردار کر دیا تھا کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ کر مارشل لاء لگانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ جون میں سول انٹیلی جنس نے یہاں تک بتا دیا تھا کہ فوجی افسروں کو ان تمام لوگوں کی کوٹھیوں کا محلِ وقوع بتایا جا رہا ہے جنہیں مارشل لاء کے نفاذ پر گرفتار کرنا مقصود تھا۔ حد یہ کہ جون کے تیسرے ہفتہ میں سول انٹیلی جنس نے یہ اطلاع بھی دی کہ واشنگٹن سے مارشل لاء کے نفاذ کی تاریخ آچکی ہے اور ۲ تا ۶ جولائی کے درمیان جنرل ضیاء کسی وقت بھی اقتدار پر قبضہ کر سکتے ہیں دوسری طرف آئی ایس آئی نے ان تمام اطلاعات کی سختی سے تردید کی اور ایسی رپورٹیں دینے والوں کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا۔ خود جنرل ضیاء الحق نے سینے پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھاتے ہوئے بھٹو کو یقین دلایا کہ وہ آئین کے وفادار اور جمہوری حکومت کے تابعدار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سول انٹیلی جنس کی تمام اطلاعات درست تھیں۔ اس کے باوجود بھٹو آئی ایس آئی کے جھانسہ میں آگئے۔ اس کی وجہ جنرل ضیاء پر غیر معمولی احسان و اکرام تھا یا اپنے آپ پر غیر معمولی خود اعتمادی ــــ؟ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو بھٹو نے بڑھتے ہوئے فوجی بوٹوں کی دھمک سن لی تھی لیکن اپنی طلسماتی شخصیت پر غیر ضروری اعتماد کے باعث وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ

"آخری قہقہہ کس کا ہوگا ــــ؟"

بلاشبہ بھٹو اگر زندہ رہتے تو "آخری قہقہہ" انہی کا ہوتا اور اس "آخری قہقہہ" سے پاکستان پر مارشل لاء کے منحوس سائے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے کیونکہ زندہ بھٹو کے ساتھ بے پناہ عوامی طاقت، فوجی آمریت کے تانوں بانوں کو ہمیشہ کے لئے ملیامیٹ کر دیتی ــــ لیکن بھٹو یہاں اندازہ میں غلطی کر گئے، یہ کہ

کیا انہیں زندہ چھوڑا جائیگا؟

کیا انہیں پاکستان کا خمینی بن جانے دیا جائے گا؟

اس وقت تک ایران میں خمینی برسر اقتدار نہیں آئے تھے اور اس وقت تک یہ ثابت بھی نہیں ہوا تھا کہ نہتے عوام، بڑی سے بڑی طاقت کو شکست دے سکتے ہیں۔ انقلاب بہت آئے تھے، روس کا، چین کا، ویت نام کا، کیوبا کا ــــ مگر کوئی بھی انقلاب "مسلح طاقت" کے بغیر نہیں آیا تھا۔ ایران میں عوام نے پہلی بار مسلح طاقت کے بغیر اور مسلح طاقت سے ٹکرا کر، انقلاب برپا کیا تھا۔ یہ دنیا بھر کی انقلابی تاریخ میں پہلا اور حیرت انگیز وقوعہ تھا اور اسی وجہ سے بھٹو کا زندہ رہنا، مقتدر حلقوں کے لیے خطرناک حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

بھٹو کے زوال میں ان کی صرف یہی ایک غلط فہمی کارفرما نہیں جو انہیں اپنے آپ اور عوامی طاقت

کے بارے میں لاحق تھی۔ بلکہ اس بڑی سطح کے نیچے کئی دوسرے عوامل یا غلطیاں بھی کارفرما نظر آتی ہیں۔

مثلاً یہ کہ بھٹو اگر عوام پر فوج کشی کے مخالف تھے تو پھر بلوچستان کے عوام پر فوج کیوں چڑھائی گئی؟ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں اس فوج کو واپس بیرکوں میں لے جانا مشکل ہو گیا۔

وہ اگر صوبائی خود مختاری کے حامی تھے تو انہوں نے بلوچستان اور سرحد میں اپنی مخالف صوبائی حکومتوں کو کیوں نہ چلنے دیا اور انہیں توڑ کر پیپلز پارٹی کی حکومتیں بنانا کیوں ضروری سمجھا؟

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے سلسلہ میں بھٹو صاحب "لارکانہ پلان" کو کسی سادہ لوح انسان کی دلجوئی کے سر منڈھتے ہیں۔ یہ جواز بذات خود اگر بڑا احمقانہ نہیں تو پھر بھٹو کی سادہ لوحی ضرور ہے کیونکہ عقلِ سلیم یہ تسلیم نہیں کر سکتی کہ کوئی بے وقوف یا احمق انسان ملک کے وزیر اعظم تک رسائی بھی حاصل کر لے اور پھر من مانے کاغذات پر دستخط بھی کروا لے۔ اگر بھٹو صاحب نے یہ "دستخط" صرف ایک "سادہ لوح کی دلجوئی" کے لئے کئے تھے تو پھر "احمق" وہ سادہ لوح نہیں بلکہ خود بھٹو صاحب کو سمجھنا چاہیئے۔

پی این اے سے اپنے مذاکرات میں آخر وقت تک تاخیر والتوار کے ہتھکنڈے سے بھی بھٹو صاحب کی غلطی تھی ــــ ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حفیظ پیرزادہ اپنی مرضی سے جو چاہتے تھے سو کرتے تھے۔ اس میں کچھ "جرم آفتاب" بھی ہے۔ اور پھر جب پی این اے سے سمجھوتے کا مسودہ تیار ہو گیا تھا تو اس مرحلہ پر بھٹو صاحب کو غیر ملکی دوروں کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟

بھٹو صاحب جیسے ذہین و فطین انسان کو اپنی آستین کے سانپوں سے تو باخبر ہونا چاہیئے تھا۔ ان کی اپنی پارٹی میں ایسے لوگ موجود تھے جو انہیں غلط سلط مشورے دیتے تھے اور جنہوں نے پی این اے سے سمجھوتہ کو اپنی انا کے منافی گردان لیا تھا ــــ بھٹو صاحب تو اسلامی سربراہی کانفرنس کے فوراً بعد اسمبلیاں توڑ کر انتخابات کرانے کے خواہاں تھے تاکہ بلوچستان کے مسئلہ سیاسی سطح پر نپٹا جائے لیکن خود ان کی پارٹی کے لیڈروں نے اس کی مخالفت کی اور پھر یہی وہ لوگ بھی تھے جو پی این اے سے سمجھوتہ میں آخر وقت تک روڑے اٹکاتے رہے ــــ

بھٹو صاحب کی ایک اور غلطی اور ناانصافی یہ بھی تھی کہ انہوں نے سینیئر جرنیلوں کی ایک پوری قطار کو نظر انداز کر کے سب سے جونیئر ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف کے عہدہ پر فائز کیا ــــ پھر یہی ضیاء الحق بلکہ یہی "ناانصافی" انہیں پھانسی کے پھندے تک لے گئی۔ اس ضمن میں بھٹو صاحب یہ "عذر" گھڑتے ہیں کہ آئی ایس آئی کے اُس وقت کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی نے انہیں ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف بنانے کیلئے قائل کیا لیکن سوال یہ ہے کہ وہ قائل کیوں ہوئے؟ انہوں نے دوسروں کا حق مار کر "تیسرے" کے حوالے کیوں کیا؟ جس "انصاف پسندی" کے وہ علمبردار تھے وہ "انصاف پسندی" اس تقرر میں دفن کیوں کی گئی؟ بہرحال بھٹو

صاحب نے اپنی اس غلطی کا خمیازہ اپنی زندگی دے کر بھگتا۔

بلاشبہ جمہوریت ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں عوام کو ووٹ دینے کا حق ضرور ہے لیکن ووٹ دینے کے بعد، بے چارے عوام کا "حق" ختم ہو جاتا ہے اور اقتدار بالآخر معدودے چند افراد کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے۔ پارلیمنٹ کے چند سو افراد پھر کابینہ کے چند افراد اور پھر کابینہ کا ایک عدد سربراہ ــــ یوں جمہوری عمل میں بھی اقتدار بالآخر ایک فرد یا چند افراد کی تحویل میں چلا جاتا ہے اور وہ کوئی بھی گل کھلا سکتے ہیں، بھٹو صاحب سے جو المیہ پیش آیا وہ اسی عمل و حالت کی شہادت ہے اور انتباہ کہ سیاست میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔

بھٹو صاحب نے حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ بھی شائع نہیں کی۔ یہ رپورٹ اگر یکطرفہ تھی تو اسے دو طرفہ، سہ طرفہ یا چہار طرفہ بنانے میں کیا امر مانع تھا؟ لیکن بھٹو صاحب کے اپنے الفاظ میں یہ رپورٹ اس لئے شائع نہ کی گئی کہ یہ "مسلح افواج کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب" تھی ــــ اور یہ بھی کہ یہ رپورٹ "مسلح افواج اور اس کے کارپردازوں کے خلاف ایک سنگین فردِ جرم ہے۔

اور اب یہ رپورٹ قصۂ پارینہ بھی ہے اور غائب غلّہ بھی ہو چکی ہے۔ کیا فائدہ ہوا حمود الرحمٰن کمشن کے تقرر اور تحقیقات کا ــــ؟

یہاں یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کی قومی اسمبلی میں اپنی دو ٹوک اکثریت لے آئے تھے تو انہیں اس اکثریت سے مستفید ہونے کی اجازت کیوں نہ دی گئی؟ اور اسمبلی اجلاس میں شرکت سے انکار کر کے کیا بھٹو صاحب نے خود بھی پاکستان ٹوٹنے کے عمل میں حصّہ نہیں لیا تھا ــــ؟

بھٹو صاحب کا دعویٰ ہے کہ وفاقی وزیر پیداوار مسٹر رفیع پیرزادہ نے انہیں "ایک بڑے خطرہ" سے آگاہ کر دیا تھا جو ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ ہندو، عیسائی، یہودی اور کمیونسٹ بم کے مقابلہ میں "مسلم بم" بنانے پر اس حد تک مُصر تھے کہ

"اگر ضرورت پڑی تو ہم گھاس کھا کر بھی ایٹم بم بنائیں گے ــــ"!

اب ہم گھاس تو واقعی کھا رہے ہیں لیکن ایٹم بم پھر بھی غائب ہے تو کیا بھٹو صاحب ان نازک لمحات میں کوئی "ڈپلومیسی" اختیار نہیں کر سکتے تھے؟ اگر بعد میں یہی "ڈپلومیسی" آنا تھی تو ابتدا ہی میں اسے اپنانے میں کیا حرج تھا؟

اور پھر یہ حقیقت ہے، اگرچہ بہت ہی کم لوگ اس حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں یہ کہ ایٹمی ٹیکنالوجی،

سائنسدانوں کی، ملک و قوم کی ترقی کی ضرورت تو بے شک ہے مگر یہ سپاہی کی ضرورت نہیں اور یہ کہ ایٹمی ٹیکنالوجی کے آنے سے معاشرہ پر اور اقتدار پر سائنسدانوں کی گرفت تو ضرور مضبوط ہوتی ہے، فوج کی نہیں۔ کوئی سپاہی ایٹم بم پر انحصار یا اعتماد نہیں کر سکتا کیونکہ ایٹم بم بغیر کسی لڑائی کے (لڑائی سپاہی کا پیشہ ہے) قصہ ختم کر دیتا ہے۔ جبکہ سپاہی کی طاقت روایتی ہتھیاروں میں مضمر ہوتی ہے جو اسے لڑنے کا موقع دیتے ہیں اس لیے سپاہی روایتی ہتھیار ہی پسند کرتا ہے کہ ان سے اس کی اپنی صلاحیت اور طاقت آشکار ہوتی ہے اور اسی سے اسے معاشرہ و اقتدار پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ ان حالات میں اور ان حقائق کے پیشِ نظر بھٹو صاحب نے خطرہ کے نازک مرحلہ میں 'ڈپلومیسی' کیوں اختیار نہ کی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیرو بننے کے جنون میں غیر ضروری نمائش و اداکاری کا شکار ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایٹم بم تو آج تک ہمارے ہاتھ نہیں لگا البتہ ہم بھٹو صاحب سے ہاتھ دھو بیٹھے۔۔۔!

بھٹو صاحب کے زوال کے سلسلہ میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اپریل سے جون تک ملک میں جس پیمانہ پر ہنگامہ آرائی ہوئی اس نے چیف آف آرمی سٹاف کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ ملک کو بچانے کے لئے فوج کو آگے بڑھنا چاہیئے ۔۔۔ یہ طرزِ فکر اس وجہ سے زیادہ راسخ ہوا کہ بعض سیاست دان خود جرنیلوں کو اکساتے رہے تھے کہ فوج آگے بڑھے۔ اصغر خان کے ایک خط سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو ولی خان اور نسیم ولی خان کے رویے دیکھ لیجئے۔ نسیم ولی خان تو مفتی محمود سے یہاں تک کہہ گزریں کہ:

"مارشل لا کو آنے دیجئے"

مفتی محمود نے حیرت سے ان سے پوچھا:

"کیا یہ ولی خان کی رائے بھی ہے؟"

نسیم ولی خان نے بے دھڑک کہا:

"جی ہاں یہ ان کی رائے ہے۔"

تو جمہوریت کے چیمپئن حضرات جہاں مارشل لا کی راہ دیکھ رہے ہوں وہاں مارشل لا آخر کب تک رکتا؟ ان حالات میں بھٹو کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مجھے جب انتخابات میں شکست نہ دی جا سکی تو فوج کے ذریعہ میرا تختہ اُلٹ دیا گیا۔

زندگی کے قریب قریب تمام شعبوں میں بھٹو کا اپنا ایک منفرد سٹائل تھا۔ سیاسی، انتظامی اور انتخابی امور میں بھی بھٹو کا مخصوص سٹائل ہمیشہ جھلکتا رہا۔ چنانچہ اس سٹائل کے تحت بھٹو نے "عام انتخابات کو" حزبِ مخالف" کے خلاف "جنگ" کا نام دیا۔ ویسے انتخابات بہرحال ایک قسم کی "جنگ" ہی

ہوتے ہیں کہ ان میں فتح حاصل کرنے والا بالآخر ایوانِ اقتدار پر قابض ہوتا ہے۔

۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو بھٹو نے قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں جانتا ہوں کہ سیاست دان انتخابات سے اسی طرح گریز کرتے ہیں جیسا کہ جرنیل جنگوں سے لیکن سیاسی لڑائیاں لڑنا ہی پڑتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انتخابات کی "سیاسی جنگ" ایک مقررہ وقت پر پروگرام کے مطابق ہوتی ہے جبکہ دشمن سے جنگ کے لیے کوئی مقررہ وقت نہیں ہوتا۔"

بھٹو کی تقریر کے ان الفاظ کو یہ معانی پہنائے گئے کہ وہ حزب مخالف کے خلاف واقعی جنگ لڑ رہے تھے اور اس کے لیے انہوں نے دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے ہتھکنڈے اختیار کیے، حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ دنیا بھر میں سیاسی راہنما "جنگ" "فتح" اور "شکست" وغیرہ کی جنگی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد کوئی حقیقی جنگ نہیں بلکہ سیاسی عمل کو متحرک اور سرگرم کرنا ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو سیاست بذاتِ خود ایک آرٹ ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اعلیٰ تخلیقی عمل بھی۔ کہ اس کے نتیجہ میں کسی ملک کی حکومت تشکیل پاتی ہے۔

سیاستدان اگر جرنیلوں کی جنگ و جدل کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے تو محض ان الفاظ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ جرنیل تو یہ طرزِ عمل اختیار کر سکتے ہیں کہ سول حکومت کے دوران جمہوریت کے قصیدے پڑھیں اور آئین سے وفاداری کا حلف بھی اٹھائیں خواہ ان کا در پردہ مقصد اس سول حکومت جمہوریت اور آئین کا تختہ الٹنا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن سیاستدان بہرحال اس "قابل" نہیں ہوتے کہ جنگی اصطلاحات کے استعمال کے بعد وہ سچ مچ "اصل جنگ" لڑنا شروع کر دیں۔ ان کے پاس تو ایسی جنگ کے وسائل ہی نہیں ہوتے اس لئے ان کے الفاظ سے خوف زدہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ان کا مقصد صرف "سیاسی جنگ" ہوتا ہے۔ بھٹو نے الیکشن "جنگی حکمت عملی" سے لڑا، اس کے لیے چارٹ، منصوبے اور سکیمیں تیار ہوئیں رابطوں کے جال پھیلائے گئے اور "کنٹرول روم" بنائے گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بھٹو الیکشن کی جنگ لڑ رہا تھا۔ دھاندلی مقصود نہیں تھی کیونکہ دھاندلی کے لئے تو صرف سرکاری سطح پر احکامات جاری کرنے کی ضرورت تھی۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم بھٹو نے اپنی اسی ذہنی افتادِ طبع کے مطابق لڑی تھی۔ لاڑکانہ میں بھٹو کی کوٹھی "المرتضیٰ" کا مہمان خانہ اس انتخابی مہم کا کنٹرول روم تھا۔ منصوبے، چارٹ اور تخمینے تیار کیے گئے تھے۔ رفیع رضاؤں، پیرزادوں اور کھروں کو اسی طرح ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں جیسا کہ ۱۹۷۷ء میں سونپی گئیں۔ بھٹو نے اس امر کی بھی تیاری کر لی تھی کہ یحییٰ خان کوئی دھاندلی

کرنا بھی چاہے تو اس کا پنجہ مروڑ دیا جائے گویا انتخابی جنگ "پوری منصوبہ بندی سے لڑی گئی اور اس "جنگ" میں "لڑو یا مرجاؤ" کا جذبہ پیدا کیا گیا۔ اس منصوبہ بندی سے بھٹو کو اپنے حریفوں کے مقابلہ میں بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔ ان دنوں بھٹو ملک کے گوشہ گوشہ میں گیا حتیٰ کہ خاکروبوں کی جھگیوں اور کچی آبادیوں کے جھونپڑوں میں بھی پہنچا۔ اس نے ہر جگہ اپنے نقش قدم چھوڑے، ہر گھر تک اپنی آواز پہنچائی۔ بعض اوقات بھٹو کو ایک ہی گاؤں میں تین تین بار جانا پڑا۔ وہ چوتھی بار جب اس گاؤں میں پہنچا کیونکہ شبہ تھا کہ ایک پیر صاحب کی مخالفت کے باعث ووٹ بھٹو کو نہیں ملیں گے تو گاؤں کے لوگوں نے بھٹو سے کہا

"سائیں۔ آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں ہمارے ووٹوں کا مستحق دوسرا فرد ہے کون۔؟"

اس طرح گاؤں کے لوگوں نے اس "گنہگار سیاستدان" کے لیے اپنے پیر صاحب کو بھی ٹھکرا دیا جس سے بھٹو بے حد متاثر ہوا۔

اس "عوامی طلسم" کے ساتھ بھٹو کا اپنا ایک منفرد سٹائل ایسا تھا جو دوسروں کو گھائل کر کے رکھ دیتا تھا۔ پی این اے کی نو جماعتوں کے اتحاد پر تبصرہ کرتے ہوئے بھٹو نے اسے "عجیب و غریب عناصر کا انوکھا ملغوبہ" "سیاسی خانہ بدوشوں کا مصنوعی اتحاد" ہی نہیں کہا بلکہ انہیں "وحشی بلیوں" سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا:

"ان نو وحشی بلیوں کی دمیں باندھ کر انہیں ایک کرنے کے لیے بیرونی خلا سے کوئی جادوگر نہیں آئے گا۔"

ذہانت و فطانت اور بالغ نظری کے لحاظ سے جنوبی ایشیا کے کسی بھی ملک کے رہنما کے مقابلہ میں بھٹو سب سے تابناں و درخشاں ستارہ تھا لیکن حیرت ہے کہ بھٹو صاحب کی عقل پہ پردے کیوں پڑ گئے؟ ایک مرحلہ پہ مارشل لاء حکام اس تجویز پر بھی سنجیدگی سے غور کرتے رہے کہ بھٹو صاحب سے کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے لیکن بوجوہ اس پر عمل کی نوبت نہ آسکی۔ جنرل ضیاء نے بھٹو کو جلاوطن کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لیا حالانکہ ایک موقع پر وہ اس کے لیے رضامند ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ بھٹو کی رہائی کے خواہاں دوسرے راہنمانِ مملکت یہ ضمانت دے دیں کہ بھٹو آئندہ دس سال سیاست میں حصہ نہیں لے گا تو وہ انہیں ملک بدر کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ لیکن ایران میں خمینی کی واپسی نے ضیاء الحق کو چوکنا کر دیا اور انہوں نے بھٹو کی جلاوطنی کی تجویز مسترد کر دی۔ اُن دنوں ایک طرف بھٹو کی سحر طراز شخصیت تھی اور دوسری طرف جنرل ضیاء الحق جو کسی بھی کشش یا مقبولیت سے یکسر محروم تھے اور شاید اس ملک کے سب سے غیر مقبول صدر تھے۔ ان میں کسی دل کشی کا اتنا ہی فقدان تھا، جتنا بھٹو

میں اس کی کثرت تھی۔ ان حالات میں بھٹو اگر جیل سے باہر آتا تو خمینی سے دس گنا زیادہ طاقت کے ساتھ آتا۔

شاہِ ایران کے پاس تو پھر بھی اپنی کارکردگی کا کچھ بُرا بھلا ریکارڈ تھا مگر جنرل ضیاؔ تو اس سے بھی محروم تھے لیکن جنرل ضیاؔ کی خوش قسمتی تھی کہ ایک طرف ایران سے امریکہ کا بوریہ بستر گول ہوا اور دوسری طرف افغانستان میں روسی فوج آ گئی، یوں انہیں بیٹھے بٹھائے، بلا کسی تردّد کے، غیر مشروط امریکی حمایت اس لیے حاصل ہو گئی کہ اب اس خطہ میں پاکستان ہی امریکہ کا آخری حصار بن گیا تھا۔ اِن حالات میں بعض عرب ممالک نے بھٹو کو اپنی جیلوں میں، غیر معین عرصہ تک، قید رکھنے کی تجویز پیش کی تاکہ بھٹو کی جان بھی بچ جائے اور ضیاء الحق کو گزند بھی نہ پہنچے تو جنرل ضیاءؔ نے ان پیش کشوں کو بھی بلا تامل مسترد کر دیا انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ بھٹو جس ملک میں بھی قید ہو گا اس ملک کی بندوق ہمیشہ ان کے سر پر تنی رہے گی اور بھٹو کو چھوڑ کر وہ ملک کسی وقت بھی اس بندوق سے فائر کرنے کے قابل ہو گا۔ پھر یہ خدشہ بھی تھا کہ جن ملکوں میں اب تاج و تخت بھی محفوظ نہیں ان میں قیدی بھٹو کو کب تک بند رکھا جا سکے گا؟

یوں غیر ملکی حالات و عوامل نے مل جل کر بھٹو کے خلاف راہ ہموار کر دی، ضیاء الحق کے لیے امریکی مہربانیوں کی شکل میں آسانیاں ہی آسانیاں ہو گئیں اور بھٹو کے دن گنے گئے۔!

اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان میں جنرل صاحب کو ایسے "سیاستدان" بھی مل گئے جو مارشل لا کا استقبال کرنے کو تیار اور اس سے تعاون کے لیے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

اصغر خان نے تو خود فوجی جرنیلوں کو بغاوت کرنے کی دعوت دی تھی جبکہ جمہوریت کے نام نہاد چیمپئن ولی خان بھی "انتخاب سے پہلے احتساب" پر اُتر آئے تھے۔ ولی خان کی اس آمریت پسندی کی وجہ کیا تھی؟ اٹلی کے ریڈ بریگیڈ چھاپہ ماروں کا نظریہ ہے کہ اٹلی کے موجودہ ریاستی ڈھانچہ کو ختم کر کے غیر طبقاتی سماج قائم کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ فوج اقتدار سنبھال لے۔ اس کے بعد چھاپہ ماروں کا کام آسان ہو جاتا ہے اور وہ اندر ہی اندر پکنے والے لاوے کو دہکتے الاؤ کی شکل دے سکتے ہیں۔ ریڈ بریگیڈ (انہیں اٹلی کے "سرخپوش" کہہ لیجئے) کی یہی پالیسی ولی خان نے پاکستان میں اختیار کی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ

"پاکستان اگر تباہ ہوتا ہے تو ہم تباہ نہیں ہوتے ہم تو سرحدی زنجیر کو طورخم سے لا کر مرگلا میں اور چمن سے اُٹھا کر حبیب آباد میں لا رکھیں گے"!

اِس طرزِ سیاست کو مارشل لا میں فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہے چنانچہ ولی خان یا نسیم ولی خان کی طرف سے مارشل لا کی حمایت کوئی ایسی انوکھی یا غیر فطری بات نہیں۔

اس کے عین برعکس محب الوطن حلقے سیاست میں فوج کی آمد کو نقصان دہ سمجھتے ہیں کیونکہ سیاست میں

آگر فوج اپنی پیشہ ورانہ اہلیت وصلاحیت کو بھی مجروح کرتی ہے اور ساتھ ہی ملکی سیاسی نظام کو بھی تباہ کردیتی ہے (جیسا کہ خود ضیاالحق نے کہا) فوج کو سیاست کا نہ تو کوئی تجربہ ہوتا ہے اور نہ فوج کا مزاج سیاست سے مطابقت رکھتا ہے (سیاسی تربیت صرف کمیونسٹ افواج کو حاصل ہوتی ہے۔ آپ نے کمیونسٹ معاشرہ لانا ہو تو بے شک فوج کی سیاسی تربیت کرلیجئے)

بھٹو، ضیاالحق کو بار بار انتباہ کرتے رہے کہ وہ مارشل لا کے ذریعہ جناحؒ کے خواب (پاکستان) کو پارہ پارہ نہ کریں اور نہ ہی ولی خان کے خواب کو عملی تعبیر بخشیں لیکن ضیاالحق نے اپنی زندگی میں اس پہ کوئی توجہ نہ دی" تو کیا ولی خان اسی لیے ضیاالحق کی تائید کرتے رہے کہ اس سے ان کا خواب مکمل ہوتا ہے؟

فوجی انقلابات کے خلاف بھٹو نے انتباہ کیا کہ

۱۔ "فوجی انقلابات، قومی اتحاد کے بدترین دشمن ہیں۔

۲۔ سول حکومتوں کے تختے اُلٹنے کا سلسلہ کسی ملک کے سیاسی ڈھانچہ کا مستقل حصہ بن جائے تو اس کا مطلب ہے کہ پھول کی آخری پتی بھی گر گئی۔ اس کا مطلب ہے خاتمہ ــــــ

۳۔ تیسری دنیا کے ممالک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ اور خطرہ فوجی آمریتیں ہیں۔

۴۔ فوجی آمریت ہی وہ پل ہے جس پہ چل کر غیر ملکی آمریت ملک میں آجاتی ہے"

بالکل وہی حالات، آج بھی نظر آرہے ہیں، ولی خان اپنی تمام تر ترقی پسندی اور تمام تر جمہوریت پسندی کے باوجود انتہا درجہ کے رجعت پسندوں اور مارشل لا کی باقیات سے سمجھوتے کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ آگ اور پانی کا ملاپ ہے۔

ـــہ یہ ڈرامہ دکھلائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

پاران ایم ایچ پنھور انسٹیٹیوٹ آف سندھ اسٹڈیز، جامشورو۔

بھٹو
ایوانِ اقتدار سے تختۂ دار تک

سنسنی خیز انکشافات
پر مشتمل
ایک معرکۃ الآرا کتاب

ادیب جاودانی کے قلم سے

●

نواب محمد احمد خاں کے قتل کی ایف آئی آر پولیس کے سرد خانے سے نکل کر پاکستان کے سابق وزیر اعظم کے لئے موت کا بلیک وارنٹ کس طرح بنی؟ ● مسعود محمود وعدہ معاف گواہ کیا کہتے ہیں؟ ● میاں محمد عباس، غلام مصطفےٰ، رانا افتخار اور ارشد اقبال نے اقبالی بیان کیوں دیئے؟ ● بھٹو نے کوٹ لکھپت جیل لاہور اور ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں اپنی نظر بندی کے لمحات کس طرح گذارے، جیل میں بھٹو سے کون کون ملتا رہا؟ —
● جیل میں بھٹو سے پاکستانی فوجی حکمرانوں نے کیا سودے بازی کرنے کی کوشش کی؟
● زندگی کے آخری ایام میں بھٹو کو کیا حالات پیش آئے؟ ● بیگم نصرت بھٹو اور مس بینظیر بھٹو نے آخری ملاقات میں بھٹو سے کیا باتیں کیں ● بھٹو کی آخری گفتگو کا ٹیپ کس کے پاس موجود ہے؟ ● کال کوٹھڑی میں پھانسی کی رات بھٹو پر کیا گذری —؟
● بھٹو پھانسی گھاٹ تک کس طرح پہنچا؟ ● تختہ دار پر لٹکنے سے پہلے بھٹو کی ذہنی اور جسمانی حالت کیا تھی؟

کوٹ لکھپت جیل کے افسران، جیل کے قیدیوں، بھٹو کے مشقتیوں، قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ، بھٹو کے عزیز و اقارب اور سیاستدانوں کے تجزیئے اور تبصرے، ان کہے حقائق

— بھٹو کی متعدد نادر اور نایاب تصاویر —

سرورق پر بھٹو کی چہار رنگی تصاویر ● طباعت فوٹو آفسٹ ● قیمت سو روپے ۱۰۰/-

تین صد صفحات پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز — طباعت کے آخری مراحل میں

ملنے کا پتہ: **مون پبلیکیشنز** ۶۳۔سی شاہراہ قائد اعظم لاہور۔ فون ۲۲۴۱۶۹، ۲۱۲۵۶۰

پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو کی

آخری رات

یہ وہ کتاب ہے جسے جنرل ضیاء الحق کے دور میں اشاعت و طباعت کی اجازت نہ مل سکی

اور جب

اس تصنیف کو اپنے ذرائع سے کسی نہ کسی طور شائع کر کے مارکیٹ میں لایا گیا تو اس کی تمام جلدیں بازار سے غائب کر دی گئیں

یہ نوبت کیوں آئی؟

اس سوال کا جواب آپ کو اس کتاب کے متن سے مل جائے گا جس کی سطر سطر ایک انکشاف ہے اور ورق ورق ایک داستان ہے!

یہ کتاب اب پوری سج دھج کے ساتھ منظرِ عام پر لائی گئی ہے !

سطر سطر انکشاف

ورق ورق داستان

Digitized by M. H. Panhwar Institute
of Sindh Studies, Jamshoro.